تدریب المعلمین

دینی مدارس کے اساتذہ کے لیے رہنما کتاب

سیّد ندیم فرحت

سیّد متقین الرحمان

PRESS

تدریب المعلمین

دینی مدارس کے اساتذہ کے لیے رہنما کتاب

سیّد ندیم فرحت

سیّد متقین الرحمٰن

PRESS

جملہ حقوق محفوظ

غیر قانونی طور پر چھپوانا اور فروخت کرنا ہر لحاظ سے جرم ہے۔

کتاب: تدریب المعلمین

تدوین و ترتیب: سیّد ندیم فرحت
سیّد متقین الرحمٰن

اشاعت اوّل: 2016ء

اشاعت دوم: 2025ء (نظر ثانی اور اضافہ شدہ ایڈیشن)

زیر اہتمام: آئی پی ایس پریس

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، نصر چیمبرز، پلاٹ-1، ایم پی سی ایچ ایس،
کمرشل سینٹر، ای الیون تھری - اسلام آباد

فون: 051-8438391-3، 051-8438388

ای میل: publications@ips.net.pk

ویب سائٹ: www.ips.org.pk، www.ipsurdu.com

فیس بک: fb/InstituteOfPolicyStudiesPakistan

آئی ایس بی این: 978-969-448-848-6

صفحہ سازی: عابد حسین

فہرست

تعارف		۵

حصہ اوّل: عمومی رہنمائی

قرآن کا اندازِ تدریس	ڈاکٹر محمد سلیم	۱۱
تصورِ علم و تعلیم	پروفیسر خورشید احمد	۶۷
عملِ تدریس اور ابلاغ	مولانا ڈاکٹر معین الدین ہاشمی	۸۵
مثالی تعلیمی ادارہ	مولانا حسین احمد	۱۰۷

حصہ دوم: مخصوص رہنمائی بلحاظ مضامین

تدریس حدیث	مولانا محمد رفیق شنواری	۱۲۵
تدریس فقہ	مولانا محمد رفیق شنواری	۱۶۳
تدریس اصولِ فقہ	مولانا محمد رفیق شنواری	۱۹۱
عربی زبان کی تدریس	مولانا ڈاکٹر محمد کاشف شیخ	۲۱۹
تدریس علم کلام	مولانا محمد رفیق شنواری	۲۳۹

حصہ سوم: مدرسہ کا ماحول

تصوف، تزکیہ وارشاد	مولانا محمد رفیق شنواری	۲۵۹
عمومی توسیعی محاضرات	سید ندیم فرحت	۲۷۵
ہم نصابی سرگرمیاں	مولانا عبدالقدوس محمدی	۲۸۳
دینی مدارس کے لیے تدریب المعلمین اور تخصصاتِ دینیہ کا نظام	اربابِ مدارس کی خصوصی نشست	۲۹۳

مصنفین اور مرتبین

ڈاکٹر محمد سلیم	ماہرِ تعلیم، سابق ڈپٹی سیکرٹری وزارتِ تعلیم، حکومتِ پاکستان
پروفیسر خورشید احمد	چیئر مین انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد
مولانا ڈاکٹر معین الدین ہاشمی	شعبہ حدیث وسیرت، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد
مولانا حسین احمد	نائب مہتمم جامعہ عثمانیہ، پشاور
مولانا محمد رفیق شنواری	متخصص فی الحدیث، جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن، کراچی
سیّد ندیم فرحت	ریسرچ کوآرڈی نیٹر، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد
مولانا عبدالقدوس محمدی	خطیب جامع مسجد محمدی، شہزاد ٹاؤن، اسلام آباد
سیّد متقین الرحمٰن	سینئر ایڈیٹر، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد

تعارف

مدارس میں اساتذہ کی تربیت کے لیے سوچ بچار اور عملی کوششیں کوئی نیا عمل نہیں ہے۔ دینی مدارس کے اساتذہ میں یہ خیال اور کوششیں ماضی میں بھی رہی ہیں اور کسی نہ کسی انداز میں اب بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ تاہم ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کام کو محدود سطح سے اٹھا کر زیادہ وسیع اور اداراتی سطح پر رُو بہ عمل لایا جائے۔

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز نے اپنے قیام (مئی ۱۹۷۹ء) کے آغاز ہی سے تعلیم، قومی تعلیمی پالیسی اور تعلیمی نظام کی اسلامائزیشن کو اپنے علمی اور تحقیقی منصوبوں میں شامل کیا ہوا ہے۔ اس کام کے تسلسل میں ۱۹۸۶ء سے دینی مدارس پر تحقیق اور ادارے کی سطح پر ان کی نشوونما کے لیے مختلف سرگرمیوں کا انعقاد ہوتا رہا ہے۔ اس موضوع پر ''دینی مدارس کا نظام تعلیم'' انسٹی ٹیوٹ کی پہلی کتاب ہے جو نومبر ۱۹۸۶ء کو منعقد ہونے والے سیمینار کی کارروائی پر مشتمل تھی۔ تحقیق کے ساتھ ساتھ دینی مدارس کے حوالے سے انسٹی ٹیوٹ کے زیرِ اہتمام تربیتِ اساتذہ کے ضمن میں ورکشاپس کا انعقاد بھی ہوتا رہا ہے۔

تربیتِ اساتذہ کی ورکشاپس کے ایسے پروگرامات جو انسٹی ٹیوٹ اور دینی مدارس کے باہمی تعاون سے ہوئے، زیادہ تر مختلف دینی مدارس ہی میں منعقد ہوئے۔ ایسے درجنوں پروگراموں میں ایک ہزار سے زائد افراد شریک ہو چکے ہیں۔ یہ پروگرامات کم از کم ایک روز اور زیادہ سے زیادہ پندرہ روز پر مشتمل تھے اور بالعموم ان میں تمام وفاق/تنظیم کے مدارس کی بیک وقت شرکت کا اہتمام کیا گیا۔

چند سال قبل انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد کے زیرِ اہتمام ایک اہم پیش رفت تنظیم/وفاق ہائے مدارس کے ذمہ داران کے ساتھ ایک خصوصی نشست کا اہتمام تھا، جس میں دو موضوعات پر گفتگو ہوئی: ''تدریب المعلمین'' اور ''تخصصاتِ دینیہ''۔ تبادلۂ خیال کی یہ نشست اس

لحاظ سے بہت مفید اور مؤثر رہی کہ اس میں تمام وفاق/تنظیم کے ذمہ داران شریک ہوئے۔ یعنی مولانا محمد حنیف جالندھری (وفاق المدارس العربیہ)، مولانا یاسین ظفر (وفاق المدارس السلفیہ)، علامہ نیاز حسین نقوی (وفاق المدارس الشیعہ) اور شہید مولانا ڈاکٹر محمد سرفراز نعیمی (تنظیم المدارس اہلِ سنت) اور دیگر اہلِ علم جمع ہوئے۔ اس نشست کی روداد ماہنامہ ''الشریعہ'' گوجرانوالہ کے شمارہ مئی و جون ۲۰۰۹ء میں شائع ہوئی اور اب آئی پی ایس کی ویب سائٹ کے علاوہ الشریعہ کی ویب سائٹ پر بھی دستیاب ہے۔ ''تدریب المعلمین'' کی ضرورت وافادیت کے لحاظ سے مختلف وفاق/تنظیم کے شرکاء کے خیالات میں یکسانیت پائی گئی۔ اس کام کو منظّم انداز میں کرنے کے لیے قیمتی تجاویز بھی سامنے آئیں اور اس عزم کا اظہار بھی ہوا کہ اس پہلو سے تمام وفاق اپنے اپنے طور پر توجہ دیں گے اور قابلِ عمل شکلیں اختیار کریں گے۔ ان تجاویز میں اساتذہ کی تربیت کے حوالے سے ایک کتاب کی تیاری کی تجویز بھی سامنے آئی تھی۔

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز میں اس کے بعد بھی مختلف مشاورتی اور تربیتی نشستیں ہوتی رہی ہیں اور کتاب بلکہ کتابوں کی تیاری کا خیال مزید پختہ شکل اختیار کرتا گیا۔

اس سلسلہ کی زیرِ نظر کتاب ایک ابتدائی کوشش ہے اور ہمہ جہت ہونے کے باوجود اساتذہ کی تربیت کے کچھ ہی پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ علماء و ماہرین سے مشاورت کی روشنی میں ان شاء اللہ اس موضوع پر مزید کتابیں تیار کرنے اور اساتذہ کی تربیت کے لیے عملی ورک شاپس کے پروگرام ترتیب دینے کے لیے ہماری کوششیں آئندہ بھی جاری رہیں گی۔

※※※

اس کتاب کے پہلے حصے بعنوان ''عمومی رہنمائی'' میں چار مضامین شامل ہیں۔ پہلے مضمون میں ڈاکٹر محمد سلیم نے ''قرآن کے اندازِ تدریس'' کی جانب متوجہ کیا ہے اور دکھایا ہے کہ آج کے تعلیمی ماہرین عملِ تدریس کو مؤثر بنانے کے لیے جو اصول اور طریقے بتاتے ہیں، قرآن میں ان کی جانب پہلے ہی جامع تر اشارے موجود ہیں چنانچہ تدریس کے ان طریقوں کو اپنے ماحول کے مطابق اپنانا

مدارس کے تعلیمی عمل کو اور بھی مؤثر بنا سکتا ہے۔ دوسرے مضمون میں پروفیسر خورشید احمد نے اسلام کے تصورِ علم و تدریس پر نہایت عالمانہ انداز میں گفتگو کی ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ایک استاد کے ذہن میں تعلیم کا تصور اور اس کا مقصد جتنا واضح اور صاف ہوگا، تعلیم کا عمل اتنا ہی پُر تاثیر ہوگا۔ تیسرے مضمون میں ڈاکٹر معین الدین ہاشمی نے ابلاغ کے تصورات پر بات کی ہے اور قرآن میں اس حوالے سے موجود مثالوں کو نمایاں کیا ہے۔ بعد ازاں مولانا محمد حسین نے مثالی ادارے کے عناصرِ ترکیبی اور مثالی استاد کے کردار پر بات کی ہے۔

دوسرے حصے میں ''مخصوص رہنمائی بلحاظ مضامین'' کے تحت حدیث، فقہ، اصول فقہ اور علم کلام کی تدریس کے حوالے سے اساتذۂ کرام کے سامنے تفصیلی اشارات پیش کیے گئے ہیں اور ان سے یہ توقع باندھی گئی ہے کہ وہ اپنے طالب علموں کی ذہنی تربیت اس نہج پر کریں کہ وہ وسیع النظر اور معاشرے کی جدید ضروریات سے آگاہ عالمِ دین بن سکیں۔

تیسرے حصے کا عنوان ''مدرسے کا ماحول'' ہے۔ جس میں مولانا عبدالقدوس محمدی، مولانا رفیق شنواری اور سید ندیم فرحت نے اس پہلو سے گفتگو کی ہے کہ تعلیم کے اصل کام کے ساتھ ساتھ مدرسہ میں معاونِ تعلیمی سرگرمیاں کیا کچھ ہو سکتی ہیں، جس سے طالب علموں کی ذہنی، جسمانی، روحانی، تحریری اور تقریری صلاحیتوں کو جِلا ملے۔

اس موقع پر کتاب کے مرتبین، مصنفین اور اس کی تیاری میں شریک تمام افراد بالخصوص ڈاکٹر حبیب الرحمان عاصم (کلیہ عربی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی) اور ہمارے سابق رفیقِ کار اکرام الحق کا شکریہ بھی لازم ہے۔ دعا ہے کہ یہ کام ہم میں سے ہر ایک کے لیے دنیاوی واخروی فلاح کا باعث ہو۔ آمین

٢٠ مارچ ٢٠١٦ء

خالد رحمٰن
ڈائریکٹر جنرل
انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز۔ اسلام آباد

حصہ اوّل

عمومی رہنمائی

قرآن کا اندازِ تدریس

ڈاکٹر محمد سلیم

پس منظر

تعلیم وتعلم کا سلسلہ تخلیق انسانی کے ساتھ شروع ہوا اور خالقِ کائنات نے اس کو اتنی اہمیت دی کہ انسان کو علم ہی کے ذریعے اپنی دوسری مخلوقات پر فوقیت دی اور علم ہی کو شرفِ انسانیت کا معیار قرار دیا۔ تعلیم وتعلم کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو معلم قرار دیا۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّهَا

اور اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے۔(البقرۃ:۳۱)

اسی طرح

اَلرَّحۡمٰنُo عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَo خَلَقَ الۡاِنۡسَانَo عَلَّمَهُ الۡبَيَانَo

نہایت مہربان خدا نے اس قرآن کی تعلیم دی ہے۔اسی نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا۔
(الرحمٰن:۱-۴)

اور اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کا بنیادی وظیفہ بیان فرماتے ہوئے بھی آپؐ کو معلم کتاب وحکمت قرار دیا۔

اس کے باوجود یہ ایک المیہ ہے کہ ہم نے تعلیم کے میدان میں قومی سطح پر بہت سے طریقہ ہائے تدریس، مثلاً: کنڈرگارٹن، مانٹیسوری، فروبل، کھیل کھیل میں تعلیم، بلاواسطہ طریق، بالواسطہ طریق وغیرہ وغیرہ تو سیکھے سکھائے مگر بالعموم غور نہیں کیا کہ قرآن کا اندازِ تدریس وتعلیم کیا ہے؟ اور یہ کہ استادِ کامل

محمد ﷺ کا طریقہ تدریس کیا تھا؟ دین کا صحیح فہم رکھنے والی شخصیات کے استثنیٰ کے ساتھ ہمارے اساتذہ اور ٹیچرز ٹریننگ اداروں کے منتظمین نے بھی شاید ہی کبھی اس بارے میں سوچا ہو۔

ہمارے پیشِ نظر اس تحریر کے مخاطبین میں وہ تمام ماہرینِ تعلیم ہیں جو خواہ سرکاری سطح پر تعلیمی پالیسی کے عمل میں شریک ہوں یا پرائیویٹ سطح پر کسی تعلیمی ادارے یا مدرسے کے پرنسپل یا صدر مدرس، منتظم یا مہتمم ہوں یا کسی اور حیثیت سے تعلیمی عمل میں حصہ لے رہے ہوں۔ تاہم ہمارے مخاطبینِ اول وہ اساتذۂ کرام ہیں جو ایک طالبِ علم کی نشو ونما میں براہِ راست حصہ لیتے ہیں۔

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ قرآن کا موضوع انسان ہے جسے یہ سیدھی راہ پر زندگی گزارنا سکھاتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے قرآن درس وتدریس کے سنہری اصول، منفرد اور مثالی طریقہ ہائے تدریس اور مؤثر مہارتوں سے کام لیتا ہے۔ یہ طریقہ ہائے تدریس اور مہارتیں بچوں کی تدریس اور بالغوں کی تدریس کے لیے راہنما اصول فراہم کرتی ہیں جن کے استعمال سے اساتذہ اپنے درس اور تدریس کے عمل کو مؤثر اور مثالی بنا سکتے ہیں۔

قرآن کا اندازِ تدریس منفرد اور مثالی ہے اور کیوں نہ ہو کہ یہ خالقِ کائنات کا انداز ہے۔ یہ طریقہ تدریس فطرت اور انسانی نفسیات کے عین مطابق ہے۔ ذرا غور کیجیے کہ جس نے انسان کو تخلیق کیا، اس سے بڑھ کر انسانی نفسیات کا نباض کون ہوسکتا ہے؟ یہ مقدّس کتاب فخرِ انسانیت اور استادِ کامل ﷺ کو پوری انسانیت کی تعلیم وتدریس کے لیے عطا ہوئی۔ اور فطری طور پر اس کتابِ ہدایت اور اُستادِ مکرم نے تعلیم وتدریس کے میدان میں وہ انقلاب برپا کیا کہ عرب کے ناخواندہ لوگ دیکھتے ہی دیکھتے علم و تہذیب کے علمبردار بن گئے۔ اہل یورپ اور دیگر اقوام نے اُن سے علم وشعور اور تہذیب سیکھی۔

قرآن کی تعلیمات اور رسول اللہ ﷺ کی سیرت دنیا کے دیگر معاملات کی طرح تعلیم کے معاملے میں بھی ہماری رہنمائی کے لیے موجود ہیں۔ تعلیم وتدریس کے میدان میں یہ رہنمائی دینی اداروں تک محدود نہیں بلکہ ہر طالبِ ہدایت فرد، گروہ، قوم، معاشرے اور ریاست کے لیے یکساں طور پر دستیاب ہے۔ ضرورت تو طالبِ ہدایت بننے اور غور وخوض کرنے کی ہے۔

اس مقصد کے لیے سوچ میں اس بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے کہ ہمارے اساتذہ اور تعلیم، تدریس اور تربیت سے وابستہ افراد خالقِ کائنات کے طریقہ ہائے تدریس کا شعور اور فہم حاصل کریں، نبی کریم ﷺ کے اسلوبِ تعلیم و تدریس اور اندازِ تربیت و تزکیہ کا علم حاصل کریں اور ان کی روشنی میں اپنی تعلیم و تدریس کو مؤثر کریں۔ تاہم اس سے بھی پہلے اساتذہ کو اپنا ہدف یہ قرار دینا ہوگا کہ وہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں طلبہ کی خاطر خواہ تربیت اور کردار سازی کریں گے تاکہ خود اساتذہ کرام اور طلبہ کا قرآن اور سنت نبویؐ سے تعلق مضبوط ہو۔

اسی بنیادی ہدف اور مطلوبہ سوچ کو اجاگر کرنے کے لیے ذیل میں قرآن مقدّس کی مختلف آیات کے حوالے سے ایک اجمالی خاکہ پیش کیا جاتا ہے:

تعلیم کا مطمحِ نظر

قرآنی تعلیم انسان کو اس کے حقیقی مقام اور منصب سے آگاہ کرتی ہے اور اسے بتاتی ہے کہ انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے اور اس شعور کے ساتھ اسے وہ بصیرت عطا کرتی ہے جس سے انسان مقصدِ زندگی کا تعین کرتا ہے۔ پھر اس مقصدِ زندگی کے حصول کے لیے انسان کو مسلسل کوشش، تگ و دو اور جدوجہد کی ترغیب اور لگن بھی خود قرآن ہی دیتا ہے۔ مثلاً، قرآن جنت کے حصول کے لیے نہ صرف بھرپور محنت کی ترغیب دیتا ہے بلکہ اس میں صحت مندانہ مسابقت کا جذبہ بھی ابھارتا ہے۔

> وَ سَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَo
>
> اور اپنے رب کی بخشش کی طرف اور اس جنت کی طرف دوڑو جس کا عرض آسمان اور زمین کے برابر ہے، جو پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ (آل عمران:۱۳۳)

> سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِo
>
> (آؤ) دوڑو اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان و زمین کی وسعت کے برابر ہے۔ یہ ان کے لیے بنائی گئی ہے جو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ اللہ

کا فضل ہے جسے چاہے دے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔(الحدید:۲۱)

درج بالا آیات ہمیں یہ اشارہ دیتی ہیں کہ تعلیم و تدریس کا مقصد قرآن کی تعلیمی بصیرت سے ماخوذ ہونا چاہیے۔ہم بچوں کو کیا بنانا چاہتے ہیں، ہماری منزل کون سی ہے اور یہ کہ بحیثیت فرد اور قوم ہمارا مطمحِ نظر کیا ہونا چاہیے؟ ہمیں کیسی بصیرت چاہیے؟ ہمیں خود بھی غور کرنا چاہیے اور بچوں کو بھی دعوتِ فکر دینی چاہیے کہ ہم کہاں سے آئے ہیں؟ ہم نے کہاں جانا ہے؟ اس دنیا میں بطور خلیفہ ہمارا منصب اور وظیفہ کیا ہے؟ اور یہ کہ ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے؟ خدشہ ہے کہ اس نور کو اپنی زندگی کا رہنما بنائے بغیر اور اس بصیرت سے عدم آگہی کے نتیجے میں ہم زندگی بھر اندھیروں میں بھٹکتے رہیں گے۔ ہمیں بچوں کو یہ باور کرانا ہوگا کہ حُبِ دنیا، حُبِ مال اور حُبِ جاہ قطعاً زندگی کا مقصد نہیں۔ یہ لات، منات اور عزّیٰ کی طرح کے جدید دور کے بُت ہیں۔ یہ وہ خواہشاتِ نفس ہیں جن کی پرستش میں ہم سب لگے ہوئے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ ایک شرک ہے اور شرک جیسا بدترین گناہ کبھی معاف نہیں ہوگا۔اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ ہم قرآن وسنت کی روشنی میں اپنی تعلیمی بصیرت اور مشن کی تشکیل کریں۔اس کی وضاحت کریں اور اس کے حصول کے لیے ہر ممکن کوشش کریں۔ ہمارا ایک بڑا المیہ تو یہ ہے کہ ہماری تعلیم کے مقاصد نہ تو معین اور واضح ہیں اور نہ ہی صحیح ہیں۔

مقاصد کا تعین

ہر کام کے لیے بالعموم اور تعلیم و تدریس کے لیے بالخصوص مقاصد کا تعین نہایت ضروری ہے۔ استاد کو چاہیے کہ اپنے درس و تدریس کے عمل کو مفید اور مؤثر بنانے کے لیے سب سے پہلے مقاصد کا تعین کرے۔ عمومی اور خصوصی ہر دو طرح کے مقاصد کا تعین ضروری ہے بلکہ دوران تدریس جائزہ بھی لیتے رہنا چاہیے کہ کس حد تک مذکورہ مقاصد حاصل ہو رہے ہیں۔قرآن پاک کی درجِ ذیل آیات ہمیں مقاصد کے تعین کا سبق دیتی ہیں۔اجتماعی و انفرادی دائروں میں جہاں خلافت کی ذمہ داری کا احساس انسان کی زندگی اور اس کے ہر عمل کے مقاصد طے کرتا ہے وہیں تخلیق کے اس بنیادی مقصد کو ہمیشہ مدّنظر رکھنا چاہیے جو خالق نے یوں بیان فرمایا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ o
میں نے جنات اور انسانوں کو محض اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ صرف میری عبادت کریں۔
(الذاریات:۵٦)

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْر
جس نے موت اور حیات کو اس لیے پیدا کیا کہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے اچھے کام کون کرتا ہے۔اور وہ غالب (اور) بخشنے والا ہے۔(الملک:۲)

قرآن میں جہاں زندگی کے مقصد کا تعین ہے وہاں تعلیم و تدریس کے مقاصد کا بھی واضح تعین کیا گیا ہے۔ایک جلیل القدر نبی حضرت ابراہیم علیہ السلام مکہ میں کھڑے ہو کر رب کائنات سے جہاں اہلِ مکہ کے لیے رزق (پھل) اور امن کے دعائیں کرتے ہیں وہاں وہ ایک عظیم معلم انسانیت، انسان کامل، جلیل القدر نبی کی بعثت کے لیے بھی دعا کرتے ہیں۔حضرت ابراہیمؑ کی اس دعا میں بڑے جامع اور واضح انداز میں ایک معلم کے بنیادی کردار، تعلیم و تدریس کے بنیادی مقاصد اور مسلمان ملک کی تعلیمی پالیسی کے بنیادی خدوخال بیان کر دیے گئے ہیں۔ان چیزوں کی اہمیت اور ضرورت کا اندازہ اس سے بھی بخوبی ہو جاتا ہے کہ اس مفہوم کی آیات قرآن میں چار مختلف جگہوں پر آئی ہیں۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِکَ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَ یُزَکِّیْهِمْ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ o
اے ہمارے رب! ان میں انھیں میں سے رسول بھیج جو ان کے پاس تیری آیتیں پڑھے، انھیں کتاب وحکمت سکھائے اور انھیں پاک کرے۔یقیناً تو غلبہ والا اور حکمت والا ہے۔(البقرۃ:۱۲۹)

کَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْکُمْ رَسُوْلًا مِّنْکُمْ یَتْلُوْا عَلَیْکُمْ اٰیٰتِنَا وَ یُزَکِّیْکُمْ وَ یُعَلِّمُکُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَةَ وَ یُعَلِّمُکُمْ مَّا لَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ o
جس طرح ہم نے تم میں تمھیں میں سے رسول بھیجا جو ہماری آیتیں تمھارے سامنے تلاوت کرتا ہے اور تمھیں پاک کرتا ہے اور تمھیں کتاب وحکمت اور وہ چیزیں سکھاتا ہے جن سے تم بے علم تھے۔
(البقرۃ:۱۵۱)

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ o

بے شک مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ اس نے ان ہی میں سے ایک رسول ان میں بھیجا، جو انھیں اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انھیں پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔ یقیناً یہ سب اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔ (ال عمران:۱۶۴)

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ o

وہی ہے جس نے امیوں (ناخواندہ لوگوں) میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو انھیں اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب وحکمت سکھاتا ہے۔ یقیناً یہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔ (الجمعۃ:۲)

درج بالا آیات میں نصابی اجزا اور معلم کا کردار درج ذیل انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

الف: آیات کی تلاوت کرنا

یعنی قرآن کی آیات اور کائنات میں اللہ کی آیات اور نشانیوں کو خود سمجھنا اور دوسروں کو سمجھانا۔

ب: الکتاب کا علم دینا

قرآن بے شمار علوم کا سرچشمہ ہے۔ یہ ان علوم کے بنیادی اصول سکھاتا ہے اور ان کے حصول کے لیے ترغیب دیتا ہے۔

ج: الحکمہ کا علم دینا

پورا قرآن اور نبی ﷺ کی تعلیمات اور احادیث حکمت اور دانائی پر مبنی ہیں۔

د: تزکیۂ نفس کرنا

نیکی کی طرف بلانا اور برائی سے منع کرنا۔ دوسرے لفظوں میں جس طرح حضرت محمد ﷺ نے عملی نمونہ بن کر لوگوں کا تزکیہ نفس کیا اور کردار سازی کی، اسی طرز پر طلبہ کی کردار سازی کی کوشش کرنا۔

قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَکّٰهَا o وَقَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰهَاo

یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبا دیا۔(الشمس :۹-۱۰)

بحثیت استاد ہمیں دورانِ درس وتدریس درج بالا مقاصد اور ذمہ داریوں کو مدِّ نظر رکھنا چاہیے اور وقتاً فوقتاً اپنا جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ ہم کس حد تک ان مقاصد پر پورے اُترتے ہیں۔معلم انسانیت کی بعثت اور تعلیم وتدریس کی نعمت پر اللہ تعالیٰ اپنا بہت بڑا احسان یاد دلاتے ہیں۔یہ قابلِ رشک اعزاز اساتذہ کو ہی حاصل ہوسکتا ہے بشرطیکہ وہ نبی ﷺ کی اتباع کرتے ہوئے احسن طریقے سے اپنے فرائض سرانجام دیں۔

درس وتدریس کا عمل اسی صورت میں مؤثر اور مفید ہوسکتا ہے جبکہ استاد خود کو عملی نمونہ کے طور پر پیش کرے۔اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو ہم سب کے لیے قیامت تک کے لیے مثالی کردار کے طور پر پیش کیا۔

لَقَدۡ کَانَ لَکُمۡ فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰهِ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ o

درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسولؐ میں ایک بہترین نمونہ تھا۔(الاحزاب:۲۱)

مذکورہ بالا مقاصد کی روشنی میں حضور ﷺ کے طریقہ ہائے تدریس نہایت احسن اور مؤثر ہوتے تھے۔اساتذہ کو چاہیے کہ حضور ﷺ کی تدریسی مہارتیں اور تدریسی طریقے جاننے کی کوشش کریں اور ان کے ذریعے سے اپنی تعلیم وتدریس کو مؤثر بنائیں۔اس ضمن میں درج ذیل نکات پیشِ نظر رہنے چاہییں۔

ا۔ عقلی دلائل

قرآن انسان کو ہدایت کی راہ دکھانے کے لیے مختلف طریقہ ہائے تدریس سے کام لیتا ہے۔ان میں سے ایک عقلی دلائل دینا ہے۔علم کے حصول اور فروغ کے لیے انسانی عقل کا کردار بہت اہم ہے۔قرآن عقلی دلائل کے ذریعے سے انسان کو قائل کر کے ہدایت کی راہ کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔اس سلسلہ کی چند نمایاں مثالیں حسبِ ذیل ہیں:

اَوَلَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ O

کیا انسان دیکھتا نہیں ہے کہ ہم نے اسے نطفے سے پیدا کیا، اور پھر وہ صریح جھگڑالو بن بیٹھا؟ (یٰسٓ:۷۷)

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلاً وَّنَسِیَ خَلْقَهٗ قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِیْمٌ O

اوراس نے ہمارے لیے مثال بیان کی اور اپنی (اصل) پیدائش کو بھول گیا، کہنے لگا ان گلی سڑی ہڈیوں کو کون زندہ کرسکتا ہے؟ (یٰس:۷۸)

دلیل: ۱

قُلْ یُحْیِیْهَا الَّذِیْ اَنْشَاَهَا اَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِکُلِّ خَلْقٍ عَلِیْمٌ o

آپ جواب دیجیے! کہ انھیں وہ زندہ کرے گا جس نے انھیں اوّل مرتبہ پیدا کیا ہے۔ جو سب طرح کی پیدائش کا بخوبی جاننے والا ہے۔(یٰسٓ:۷۹)

الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَا اَنْتُمْ مِنْهُ تُوْقِدُوْنَ o

وہی جس نے تمھارے لیے سبز درخت سے آگ پیدا کردی جس سے تم یکا یک آگ سلگاتے ہو۔ (یٰسٓ:۸۰)

دلیل:۲

اَوَلَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلٰی وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ O

کیا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس پر قادر نہیں ہے کہ وہ ان جیسوں کو پیدا کر سکے؟ کیوں نہیں، جب کہ وہ ماہر خلاق ہے۔ (یٰسٓ:۸۱)

دلیل:۳

وَاَسِرُّوْا قَوْلَکُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ اِنَّهٗ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ O

تم خواہ چپکے سے بات کرو یا اونچی آواز سے (اللہ کے لیے یکساں ہے)، وہ تو دلوں کا حال تک جانتا ہے۔ (الملک:۱۳)

اَلَا یَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِیۡفُ الۡخَبِیۡرُO

کیا وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا؟ حالانکہ وہ باریک بین اور باخبر ہے۔(الملک:۱۴)

دلیل:۴

هَلۡ اَتٰی عَلَی الۡاِنۡسَانِ حِیۡنٌ مِّنَ الدَّهۡرِ لَمۡ یَکُنۡ شَیۡئًا مَّذۡکُوۡرًاO اِنَّا خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ نُّطۡفَةٍ اَمۡشَاجٍ نَّبۡتَلِیۡهِ فَجَعَلۡنٰهُ سَمِیۡعًاۢ بَصِیۡرًاO

کیا انسان پر لامتناہی زمانے کا ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے جب وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔ بے شک ہم نے انسان کو ملے جلے نطفے سے امتحان کے لیے پیدا کیا اور اس کو سنتا دیکھتا بنایا۔(الدھر:۱،۲)

دلیل:۵

وَ اِنۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ رَیۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰی عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ وَادۡعُوۡا شُهَدَآءَکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَO

اور اگر تمہیں اس امر میں شک ہے کہ یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے، یہ ہماری ہے یا نہیں، تو اس کے مانند ایک ہی سورت بنا لاؤ، اپنے سارے ہم نواؤں کو بلا لو، ایک اللہ کو چھوڑ کر باقی جس جس کی چاہو، مدد لے لو، اگر تم سچے ہو۔ (البقرہ:۲۳)

دلیل:۶

لَهُ الۡخَلۡقُ وَالۡاَمۡرُ O

خبردار رہو! اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے۔ (الاعراف:۵۴)

ایک کامیاب استاد وہ ہے جو طلبہ کو دلائل کے ذریعے سے قائل کرے۔ طلبہ کو دلائل دینے کی دعوت دے اُن کی اس سلسلے میں حوصلہ افزائی کرے اور دلائل سنے۔ اس طرح بہت سے ایسے کام جن کے لیے طلبہ ذہنی طور پر تیار نہیں ہوتے استاد انہیں قائل کر کے یہ کام خوش اسلوبی سے کرنے کے لیے آمادہ کر سکتا ہے اور ترغیب دے سکتا ہے۔

۲۔ تاریخ سے سبق

قرآن انسان کو ہدایت کی راہ دکھانے کے لیے بہت سے تاریخی واقعات اور قصص الانبیا سے حوالے دیتا ہے۔ قرآن میں کئی اقوام کا ذکر ہے۔ مثلاً قوم عاد وثمود، قوم لوط، اصحاب مدین وغیرہ وغیرہ۔ ان حوالہ جات کا مقصد یہ بتانا ہے کہ کس طرح ان اقوام کی طرف انبیاء بھیجے گئے جنھوں نے بطریق احسن اللہ کا پیغام ان تک پہنچایا، ہدایت کا درس دیا، بار بار سمجھایا۔ نہ صرف زبانی تبلیغ کی بلکہ عملی نمونہ پیش کیا۔ غرض، درس وتدریس کے حوالے سے مختلف طریقے اپنائے، ہر ممکنہ کوشش کی مگر اکثریت نے بات نہ مانی بلکہ بغاوت کی تب اللہ نے ان پر عذاب نازل کیا اور ان کا نام ونشان تک مٹ گیا۔ ان واقعات کے حوالے سے اللہ تعالیٰ بالواسطہ یہ پیغام دیتے ہیں کہ جس کسی نے اللہ کی بات نہ مانی اور نافرمانی کی، تباہی و بربادی اس کا مقدر بن گئی۔ جو کوئی بھی مذکورہ اقوام کے نقشِ قدم پر چلے گا دنیا اور آخرت ہر دو جہان میں عذاب اور ناکامی سے دوچار ہوگا۔ قرآن سے راہنمائی لیتے ہوئے ایک استاد طلبہ کو ایک طرف اردگرد کے ماحول سے اور محنتی اور فرماں بردار بچوں اور دوسری طرف نافرمان، سست اور کاہل بچوں کی مثالیں دے کر باور کرواسکتا ہے کہ جس کسی نے بھی اَن تھک محنت اور کوشش کی وہ کامیاب ہوا اور جس نے غفلت اور نافرمانی کا مظاہرہ کیا وہ بُری طرح ناکام ہوا۔

۳۔ روزمرہ زندگی سے مثالیں

درس وتدریس سے وابستہ افراد مثالوں کی اہمیت، ضرورت اور افادیت سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں۔ مثالوں کے ذریعے سے مشکل اور مجرد (Abstract) تصورات ذہن نشین کروانا ایک نہایت اہم تدریسی مہارت سمجھی جاتی ہے۔ قرآن نے روزمرّہ زندگی سے لی گئی عام فہم اور نہایت موزوں اور مؤثر مثالوں کے ذریعے سے بہت ہی احسن انداز میں مشکل تصورات اور خیالات ذہن نشین کروائے ہیں۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِىْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ

جو لوگ اپنے مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالیں نکلیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں۔ اسی طرح اللہ جس کے عمل کو چاہتا ہے، افزونی عطا فرماتا ہے۔ وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی۔ (البقرۃ:۲۶۱)

كَالَّذِىْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَىْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ o وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَ تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ o

جس طرح وہ شخص جو اپنا مال محض لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا ہے، اور نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے، نہ آخرت پر اُس کے خرچ کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک چٹان تھی، جس پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی اس پر جب زور کا مینہ برسا، تو ساری مٹی بہہ گئی اور صاف چٹان کی چٹان رہ گئی ایسے لوگ اپنے نزدیک خیرات کر کے جو نیکی کماتے ہیں، اس سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہیں آتا، اور کافروں کو سیدھی راہ دکھانا اللہ کا دستور نہیں ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ اپنے مال محض اللہ کی رضا جوئی کے لیے دل کے پورے ثبات وقرار کے ساتھ خرچ کرتے ہیں، ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے، جیسے کسی سطح مرتفع پر ایک باغ ہو اگر زور کی بارش ہو جائے تو دوگنا پھل لائے، اور اگر زور کی بارش نہ بھی ہو تو ایک ہلکی پھوار ہی اس کے لیے کافی ہو جائے تم جو کچھ کرتے ہو، سب اللہ کی نظر میں ہے۔ (البقرۃ:۲۶۴-۲۶۵)

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَىْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا هَلْ يَسْتَوٗنَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَىْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰهُ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ هَلْ يَسْتَوِىْ هُوَ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

اللہ تعالیٰ ایک مثال دیتا ہے، ایک تو ہے غلام، جو دوسرے کا مملوک ہے اور خود کوئی اختیار نہیں رکھتا اور دوسرا شخص ایسا ہے جسے ہم نے اپنی طرف سے اچھا رزق عطا کیا ہے اور وہ اس میں سے کھلے اور چھپے خوب خرچ کرتا ہے۔ بتاؤ، کیا یہ دونوں برابر ہیں؟ الحمدللہ، مگر اکثر لوگ (اس سیدھی بات کو) نہیں جانتے۔ اللہ ایک اور مثال دیتا ہے۔ دو آدمی ہیں ایک گونگا بہرا ہے، کوئی کام نہیں کر سکتا، اپنے آقا پر بوجھ بنا ہوا ہے، جدھر بھی وہ اسے بھیجے کوئی بھلا کام اس سے بن نہ آئے۔ دوسرا شخص ایسا ہے کہ انصاف

کا حکم دیتا ہے اور خود راہِ راست پر قائم ہے۔ بتاؤ کیا یہ دونوں یکساں ہیں؟ (النحل:۷۵-۷۶)

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ وَ اِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَ الْمَطْلُوْبُ ○

لوگو، ایک مثال دی جاتی ہے، غور سے سنو۔ جن معبودوں کو تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو وہ سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے بلکہ اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ اسے چھڑا بھی نہیں سکتے۔ مدد چاہنے والے بھی کمزور اور جن سے مدد چاہی جاتی ہے وہ بھی کمزور۔ (الحج:۷۳)

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا وَ اِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ○

جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے سرپرست بنا لیے ہیں ان کی مثال مکڑی کی سی ہے کہ وہ بھی ایک گھر بنا لیتی ہے، حالانکہ تمام گھروں سے زیادہ کمزور گھر مکڑی کا گھر ہی ہے، کاش وہ جان لیتے۔ (العنکبوت:۴۱)

معلم کو چاہیے کہ قرآن کے اس اندازِ تدریس سے سبق حاصل کرتے ہوئے عام فہم اور روزمرہ زندگی سے لی گئی مثالوں کے ذریعے سے مشکل تصورات بچوں کو ذہن نشین کرائے۔ بچوں کو بات ذہن نشین نہ کروا سکنا اُستاد کی ناکامی اور نااہلی ہے۔ بچوں کی نہیں۔

۴۔ متعلّم کی ذہنی سطح کے مطابق تعلیم و تدریس

ایک قابل اور کامیاب استاد وہ ہے جسے اپنے طلبہ کے ذہنی معیار اور ذہنی سطح کا بخوبی علم ہو اور وہ اُن کی ذہنی سطح کے مطابق تعلیم دے۔ اگر دیے جانے والے تصورات بہت ہی آسان ہوں گے تو طلبہ دلچسپی لینا چھوڑ دیں گے اور اگر ان کی ذہنی سطح سے بہت بلند ہوں گے تو ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آسکے گا اور الٹا مایوسی کا شکار ہوں گے اور تعلیم سے ہر ممکنہ گریز کی کوشش کریں گے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کی۔ اُس سے بڑھ کر کون ہے جو انسان کی ذہنی سطح، ذہنی معیار اور انسانی نفسیات کا نباض ہو۔ قرآن میں اس امر کا بطریق احسن خیال رکھا گیا ہے کہ قرآنی تعلیمات

انسان کے ذہنی معیار کے مطابق ہوں۔قرآن کا دعویٰ ہے بلکہ چار مرتبہ اس بات پر زور دیا گیا ہے۔

وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍo

اور بے شک ہم نے قرآن کو سمجھنے کے لیے آسان کر دیا ہے۔پس کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟ (القمر:۱۷)

جو امور، تصورات اور خیالات انسان (متعلم) کی ذہنی سطح سے بلند اور نا قابل فہم ہیں ان سے قرآن میں اعراض برتا گیا ہے اور صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ اس کا علم نہیں دیا جا سکتا۔ چند مثالیں حسبِ ذیل ہیں:

وَ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا o

اور یہ لوگ آپ سے روح کی بابت سوال کرتے ہیں۔آپ جواب دے دیجیے کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے اور تمھیں بہت ہی کم علم دیا گیا ہے۔ (بنی اسرائیل:۸۵)

اسی طرح سورہ نجم میں حضور ﷺ کے واقعہ معراج کے ذکر میں سدرۃ المنتہیٰ کے مناظر کا ایک اجمالی ساخاکہ دیا گیا ہے۔چونکہ یہ مناظر انسانی ذہن (جو کہ بہت محدود ہے) کی پہنچ اور سمجھ سے بالاتر ہیں اس لیے کہہ دیا گیا ہے کہ:

اَفَتُمٰرُوْنَہٗ عَلٰی مَا یَرٰیo وَلَقَدْ رَاٰہُ نَزْلَۃً اُخْرٰیo عِنْدَ سِدْرَۃِ الْمُنْتَھٰیo عِنْدَھَا جَنَّۃُ الْمَاْوٰیo اِذْ یَغْشَی السِّدْرَۃَ مَا یَغْشٰیo مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰیo

کیا تم اس چیز پر اس سے جھگڑتے ہو جسے وہ آنکھوں سے دیکھتا ہے؟ اسے تو ایک مرتبہ اور بھی دیکھا تھا۔سدرۃ المنتہیٰ کے پاس۔اسی کے پاس جنت الماویٰ ہے۔اُس وقت سدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ کہ چھا رہا تھا۔نگاہ نہ چوندھیائی، نہ حد سے متجاوز ہوئی۔ (النجم:۱۲-۱۷)

قرآن کے مذکورہ اسلوب سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ معلم کو متعلم کی ذہنی سطح اور ذہنی معیار کا بخوبی علم ہونا چاہیے اور اس کی ذہنی سطح کے مطابق تعلیم و تربیت کرنی چاہیے۔ نیز یہ کہ طلبہ کی ذہنی سطح سے بالاتر معلومات، نظریات اور تصورات ان پر ٹھونسنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے ورنہ وہ تعلیم سے گریز کریں گے اور نفسیاتی اعتبار سے ایسا کرنے میں حق بجانب بھی ہوں گے۔

۵۔ طالب علم مرکز تدریس

بہترین طریقہ تدریس وہ ہے جس میں طالب علم کو مرکزی حیثیت دی جائے۔اس پہ انفرادی توجہ دی جائے۔اُسے سکھایا جائے اور اگر ضرورت پڑے تو ہر مرحلے پہ راہنمائی کی جائے اور نگہبانی اور نگرانی کی جائے۔

سورۃ الفاتحہ کے ابتدائی حصّے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو سکھایا ہے۔اور دوسرے حصّے میں گویا اُنگلی پکڑ کر اُسے چلایا ہے کہ اس طرح مجھ سے دُعا کر۔سورۃ الفاتحہ قرآن کا خلاصہ جبکہ آیت ''اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ o'' سورۃ فاتحہ کا خلاصہ ہے۔چنانچہ اس سورۃ سے متعلق مشہور حدیثِ قدسی کے مطابق حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے یہ الفاظ نقل فرمائے ہیں کہ جب بندہ مذکورہ آیت پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ ٹکڑا (آیت) میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے اور میں نے اپنے بندے کو وہ دیا جو اُس نے مانگا۔یہ آیت سکھانے والے (خالق کائنات) اور سیکھنے والے (انسان) کے درمیان ایک قریبی تعلق،توجہ اور اپنائیت کا ایک واضح ثبوت ہے۔جب حضور ﷺ کے پاس صحابہ کرام موجود ہوتے اور اگر سیکھنے کے حوالے سے کوئی آ کر سوال کرتا تو حضور ﷺ صحابہ کو موقع دیتے کہ وہ جواب دیں۔اگر صحابہ کرام صحیح جواب دے دیتے تو حضور ﷺ تصدیق کر دیتے۔بصورت دیگر تصحیح کر دیتے۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضور ﷺ بھی درس وتدریس کے حوالے سے طلبہ کو ہمیشہ سامنے رکھتے تھے۔سیکھنے والے کو مرکزی حیثیت دیتے تھے۔

اساتذہ کو چاہیے کہ ہر طالبِ علم کو انفرادی توجہ دیں۔سیکھنے والے کو مرکزی حیثیت دیں۔ہر متعلم کے ساتھ اپنائیت اور یگانگت کا اظہار کریں۔ہر ایک کی ضروریات،مسائل اور دلچسپیوں کے پیشِ نظر تعلیم وتربیت کا اہتمام کریں۔

۶۔ کہانی اور قصص کے ذریعے تدریس

تعلیم وتدریس میں کہانی اور قصے کی اہمیت اور افادیت سے کوئی بھی ذی شعور انکار نہیں کرسکتا۔

کہانی کے ذریعے سے تعلیم و تدریس نہ صرف دیرپا اور پائدار ہوتی ہے بلکہ دلچسپ اور دلکش بھی ہوتی ہے۔ بچے بالخصوص کہانیوں اور قصوں میں خصوصی دلچسپی لیتے ہیں اور کہانیوں کے ذریعے جو کچھ سکھایا جاتا ہے اُسے بہت دیر تک یاد بھی رکھتے ہیں۔ کہانیاں اور قصے نہ صرف تعلیم بلکہ تربیت اور تزکیہ نفس کے حوالے سے بھی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

قرآن مقدس انسان کی تعلیم و تربیت اور تزکیہ نفس کے لیے کئی جگہ سچی کہانیوں سے بھی کام لیتا ہے۔قرآن پاک میں بیان کی گئی سچی اور حقیقی داستانوں اور قصص میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ جسے قرآن نے ''احسن القصص'' بھی کہا ہے زیادہ مشہور ہے۔ یہ بہت جامع، عام فہم، دلچسپ اور حقیقی قصہ ہے جس کے ذریعے سے بہت اہم تعلیمات دی گئی ہیں۔ دیگر سچی کہانیوں میں اصحاب کہف کا قصہ، حضرت ذوالقرنین کا واقعہ، حضرت موسیٰ علیہ السلام، فرعون اور جادوگروں کا واقعہ، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر کا قصہ، باغ والوں کا قصہ وغیرہ وغیرہ بہت سارے قصّے اور حقیقی داستانیں شامل ہیں۔

قرآن میں مذکور یہ تاریخی واقعات محض داستان گوئی نہیں بلکہ ہر واقعہ میں یا تو انسان کے لیے اللہ کی کسی نشانی یا اس کی قدرت و طاقت اور علم کا اظہار ہے یا انسان کے لیے سبق حاصل کرنے اور عبرت پکڑنے کا موقع فراہم کیا گیا ہے۔ گویا ہر پہلو سے انسان ان قصص سے کچھ سیکھتا ہے۔

درسی کتب کے مصنفین کو چاہیے کہ آسان، عام فہم، دلچسپ، حکمت و دانائی اور اخلاقی درس دینے والی کہانیوں اور قصص کو درسی کتب میں شامل کریں اور اساتذہ کرام کہانیوں کے ذریعے سے تدریس کے اسلوب کو اپناتے ہوئے طلبہ کی تعلیم و تربیت اور تزکیہ کا اہتمام کریں۔

۷۔ آسان سے مشکل کی طرف

معلوم، آسان اور عام فہم چیزوں اور تصورات کے ذریعے سے نامعلوم، مشکل اور مجرد تصورات کا علم دینا تعلیم و تدریس کی مؤثر اور مفید مہارت تصور کی جاتی ہے۔قرآن میں اس سنہری تدریسی

اصول اور مہارت سے بخوبی کام لیا گیا ہے۔مثلاً جنت کی نعمتوں اور مناظر کا تعارف دنیا کی نعمتوں اور مناظر کے حوالے سے کروایا گیا ہے۔ جنت کے باغات، چشموں اور بالا خانوں کا تصور دنیاوی باغات اور چشموں وغیرہ کے حوالے سے واضح کیا گیا ہے۔

وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَ اُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا وَ لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ o

اور اے پیغمبرؐ، جو لوگ اس کتاب پر ایمان لے آئیں اور (اس کے مطابق) اپنے عمل درست کر لیں، انہیں خوش خبری دے دو کہ ان کے لیے ایسے باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ان باغوں کے پھل صورت میں دنیا کے پھلوں سے ملتے جلتے ہوں گے جب کوئی پھل انہیں کھانے کو دیا جائے گا، تو وہ کہیں گے کہ ایسے ہی پھل اس سے پہلے دنیا میں ہم کو دیے جاتے تھے ان کے لیے وہاں پاکیزہ بیویاں ہوں گی، اور وہ وہاں ہمیشہ رہیں گے۔ (البقرۃ:۲۵)

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ o فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ o ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ o فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ o فِيْهِمَا عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ o فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ o فِيْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ o فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ o مُتَّكِئِيْنَ عَلٰى فُرُشٍ بَطَآئِنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ وَّجَنَا الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ o فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ o فِيْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ o فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ o كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ o

اور ہر اُس شخص کے لیے جو اپنے رب کے حضور پیش ہونے کا خوف رکھتا ہو، دو باغ ہیں۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ ہری بھری ڈالیوں سے بھرپور۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ دونوں باغوں میں دو چشمے رواں۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ دونوں باغوں میں ہر پھل کی دو قسمیں۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ جنتی لوگ ایسے فرشوں پر تکیے لگا کے بیٹھیں گے جن کے استر دبیز ریشم کے ہوں گے، اور باغوں کی ڈالیاں پھلوں سے جھکی پڑ رہی ہوں گی۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ ان نعمتوں کے درمیان شرمیلی نگاہوں والیاں ہوں گی جنہیں ان جنتیوں سے پہلے کسی انسان یا جن نے چھوا نہ ہوگا۔ اپنے رب کی کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ ایسی خوبصورت جیسے ہیرے اور موتی۔ (الرحمٰن:۴۶-۵۸)

مَثَلُ الۡجَنَّةِ الَّتِیۡ وُعِدَ الۡمُتَّقُوۡنَ فِیۡهَاۤ اَنۡهٰرٌ مِّنۡ مَّآءٍ غَیۡرِ اٰسِنٍ وَّاَنۡهٰرٌ مِّنۡ لَّبَنٍ لَّمۡ یَتَغَیَّرۡ طَعۡمُهٗ وَاَنۡهٰرٌ مِّنۡ خَمۡرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِیۡنَ وَاَنۡهٰرٌ مِّنۡ عَسَلٍ مُّصَفًّی وَلَهُمۡ فِیۡهَا مِنۡ کُلِّ الثَّمَرٰتِ وَمَغۡفِرَةٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ کَمَنۡ هُوَ خَالِدٌ فِی النَّارِ وَسُقُوۡا مَآءً حَمِیۡمًا فَقَطَّعَ اَمۡعَآءَهُمۡ

پرہیزگاروں کے لیے جس جنت کا وعدہ کیا گیا ہے اس کی شان تو یہ ہے کہ اس میں نہریں بہہ رہی ہوں گی نتھرے ہوئے پانی کی، نہریں بہہ رہی ہوں گی ایسے دودھ کی جس کے مزے میں ذرا فرق نہ آیا ہو گا، نہریں بہہ رہی ہوں گی ایسی شراب کی جو پینے والوں کے لیے لذیذ ہوگی، نہریں بہہ رہی ہوں گی صاف شفاف شہد کی اُس میں اُن کے لیے ہر طرح کے پھل ہوں گے اور اُن کے رب کی طرف سے بخشش (کیا وہ شخص جس کے حصہ میں یہ جنت آنے والی ہے) اُن لوگوں کی طرح ہوسکتا ہے جو جہنم میں ہمیشہ رہیں گے اور جنہیں ایسا گرم پانی پلایا جائے گا جو ان کی آنتیں تک کاٹ دے گا؟

(سورہ محمد:۱۵)

اَللّٰهُ الَّذِیۡ یُرۡسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیۡرُ سَحَابًا فَیَبۡسُطُهٗ فِی السَّمَآءِ کَیۡفَ یَشَآءُ وَ یَجۡعَلُهٗ کِسَفًا فَتَرَی الۡوَدۡقَ یَخۡرُجُ مِنۡ خِلٰلِهٖ فَاِذَاۤ اَصَابَ بِهٖ مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖۤ اِذَا هُمۡ یَسۡتَبۡشِرُوۡنَ o وَ اِنۡ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یُّنَزَّلَ عَلَیۡهِمۡ مِّنۡ قَبۡلِهٖ لَمُبۡلِسِیۡنَ o فَانۡظُرۡ اِلٰۤی اٰثٰرِ رَحۡمَتِ اللّٰهِ کَیۡفَ یُحۡیِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا اِنَّ ذٰلِکَ لَمُحۡیِ الۡمَوۡتٰی وَ هُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ o

اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور وہ بادل اٹھاتی ہیں، پھر وہ ان بادلوں کو آسمان میں پھیلا دیتا ہے جس طرح چاہتا ہے اور انہیں ٹکڑیوں میں تقسیم کرتا ہے، پھر تُو دیکھتا ہے کہ بارش کے قطرے بادل سے ٹپکے چلے آتے ہیں یہ بارش جب وہ اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے برساتا ہے تو یکا یک وہ خوش وخرم ہو جاتے ہیں حالانکہ اس کے نزول سے پہلے وہ مایوس ہو رہے تھے، دیکھو اللہ کی رحمت کے اثرات کہ مُردہ پڑی ہوئی زمین کو وہ کس طرح جلا اٹھاتا ہے، یقیناً وہ مُردوں کو زندگی بخشنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (سورۃ الروم:۴۸-۵۰)

اساتذہ کرام اگر قرآن کے اس سنہری اصول تدریس اور طریقہ تدریس سے استفادہ کرتے ہوئے طلبہ کو آسان، عام فہم اور معلوم تصورات کے ذریعے سے نامعلوم، مشکل اور مابعدالطبیعیاتی اشیا اور تصورات کا علم دیں گے تو سمجھنے اور سمجھانے میں آسانی ہوگی اور تدریس مؤثر ہوگی۔

۸۔ سوالات کے ذریعے سے تعلیم

درس و تدریس میں سوالات کی ضرورت، اہمیت اور افادیت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔سوالات درس وتدریس کے عمل کا بہت ہی مفید اور مؤثر ذریعہ یا حکمت عملی سمجھے جاتے ہیں۔ عربی مقولہ ہے:

حُسۡنُ السُّوٴَالِ نِصۡفُ الۡعِلۡم o سوال کرنا نصف علم ہے۔

درج ذیل حوالوں سے سوالات مؤثر اور مفید تدریسی مہارت سمجھے جاتے ہیں۔

- سوالات نئی نئی معلومات کی فراہمی کا ذریعہ ہوتے ہیں۔
- سوالات طلبہ کی ذہنی حاضری اور توجہ برقرار رکھنے کا مؤثر ذریعہ ہوتے ہیں۔
- سوالات درس وتدریس کے عمل کو تعاملی یا دوطرفہ گفتگو کا ذریعہ بناتے ہیں۔
- سوالات کے ذریعے نسبتاً زیادہ اہم امور اور معلومات کی طرف توجہ مبذول کرانا آسان ہوتا ہے۔
- سوالات طلبہ کو تجسس، تفکر اور تدّبر کی دعوت دیتے ہیں۔اس سے ان کی ذہنی صلاحیتوں کو جلا ملتی ہے اور محض رَٹ لینے کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔

قرآن پاک میں متعدد مقامات پر سوالات کے ذریعے سے نہ صرف معلومات فراہم کی گئی ہیں بلکہ تدبر اور تفکر کی دعوت بھی دی گئی ہے اور اہم امور کی طرف توجہ مبذول کروائی گئی ہے۔

اَمَّنۡ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیۡلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا یَّحۡذَرُ الۡاٰخِرَةَ وَیَرۡجُوۡا رَحۡمَةَ رَبِّهٖ ط قُلۡ هَلۡ یَسۡتَوِی الَّذِیۡنَ یَعۡلَمُوۡنَ وَالَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ط اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ

(کیا اِس شخص کی روش بہتر ہے یا اُس شخص کی) جو مطیع فرمان ہے، رات کی گھڑیوں میں کھڑا رہتا اور سجدے کرتا ہے، آخرت سے ڈرتا اور اپنے رب کی رحمت سے امید لگاتا ہے؟ اِن سے پوچھو، کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں کبھی یکساں ہو سکتے ہیں؟ نصیحت تو عقل رکھنے والے ہی قبول کرتے ہیں۔ (سورۃ الزمر:۹)

يَسْـئَـلُوْنَکَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ط قُلْ مَـآ اَنْـفَـقْتُـمْ مِّـنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ط وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ

لوگ پوچھتے ہیں کہ ہم کیا خرچ کریں؟ جواب دو کہ جو مال بھی تم خرچ کرو اپنے والدین پر، رشتے داروں پر، یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کرو اور جو بھلائی بھی تم کرو گے، اللہ اس سے باخبر ہوگا۔ (سورۃ البقرۃ:۲۱۵)

اَلْقَارِعَةُ مَاالْقَارِعَةُ وَمَا اَدْرٰکَ مَاالْقَارِعَةُ

حادثہ! کیا ہے وہ عظیم حادثہ؟ تم کیا جانو کہ وہ عظیم حادثہ کیا ہے؟ (القارعۃ:۱-۳)

وَمَآ اَدْرٰکَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ

اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے؟ (القدر:۲)

اَلَمْ تَرَ کَيْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ

تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ (الفیل:۱)

يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِيْمِ

اے انسان، کس چیز نے تجھے اپنے رب کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال دیا؟ (الانفطار:۶)

وَمَآ اَدْرٰکَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ

اور تم کیا جانتے ہو کہ وہ جزا کا دن کیا ہے؟ (الانفطار:۱۷)

اساتذہ کو چاہیے کہ مذکورہ تدریسی تکنیک کی اہمیت اور افادیت کے پیشِ نظر سوالات کے ذریعے سے اپنے تدریسی عمل کو مفید اور مؤثر بنائیں۔ خود بھی طلبہ سے سوالات پوچھیں اور طلبہ کی بھی حوصلہ افزائی کریں کہ وہ زیادہ سے زیادہ سوالات پوچھیں۔

۹۔ مقابلہ اور موازنہ

مقابلے اور موازنے کے ذریعے مختلف نظریات، تصورات اور خیالات کو بطریق احسن سکھایا جا سکتا ہے۔ عربی مقولہ ہے کہ چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں۔ جب تک اندھیرے کا تصور نہیں دیں گے، روشنی کا صحیح تصور واضح نہیں ہو سکے گا۔ ہم بہت سی چیزوں کا علم مقابلے اور موازنے کے ذریعے

سے حاصل کرتے ہیں۔قرآن میں کئی ایک مقامات پر بڑی خوبصورتی سے مقابلے اور موازنے کے ذریعے سے کئی ایک تصورات کو بخوبی واضح کیا گیا ہے۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لاَ يَعْلَمُوْنَ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُوْلُوا الْاَلْبَابِ

اِن سے پوچھو، کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں کبھی یکساں ہو سکتے ہیں؟ نصیحت تو عقل رکھنے والے ہی قبول کرتے ہیں۔ (الزمر:۹)

وَ مَا يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُo وَ لَا الظُّلُمٰتُ وَ لَا النُّوْرُ o وَ لَا الظِّلُّ وَ لَا الْحَرُوْرُ o وَمَا يَسْتَوِى الْاَحْيَآءُ وَ لَا الْاَمْوَاتُ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ وَ مَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِى الْقُبُوْرِo اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ o

اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہے۔نہ تاریکیاں اور روشنی یکساں ہیں۔نہ ٹھنڈی چھاؤں اور دھوپ کی تپش ایک جیسی ہے۔اور نہ زندے اور مردے مساوی ہیں۔اللہ جسے چاہتا ہے سنواتا ہے، مگر (اے نبیؐ) تم ان لوگوں کو نہیں سنا سکتے جو قبروں میں مدفون ہیں۔تم تو بس ایک خبردار کرنے والے ہو۔ (فاطر:۱۹-۲۳)

لاَ يَسْتَوِىٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ

دوزخ میں جانے والے اور جنت میں جانے والے کبھی یکساں نہیں ہو سکتے جنت میں جانے والے ہی اصل میں کامیاب ہیں۔ (الحشر:۲۰)

مذکورہ بالا اندازِ تدریس ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ درس وتدریس سے وابستہ افراد چیزوں کے مقابلے اور موازنے کے ذریعے نظریات اور تصورات کی وضاحت کریں تو چیزوں کا مکمل اور صحیح تصور دے سکیں گے۔اس کے برعکس اگر یک طرفہ تصور دیں گے یعنی روشنی کے ساتھ اندھیرے کا تصور نہیں دیں گے تو تعلیم وتدریس کا حق ادا نہیں ہو سکے گا اور تصورات نامکمل اور ادھورے رہ جائیں گے۔

۱۰۔ منظر کشی اور تصویر نگاری

منظر کشی اور تصویر نگاری تدریس کے اہم اور مؤثر فنون میں سے ایک فن ہے اس کے ذریعے سے مجازی، مجرد اور بعید از قیاس خیالات اور تصورات کو بھی حقیقی، جاندار اور دلکش طور پر پیش کیا جاسکتا

ہے۔اس سے تصورات سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ چیزیں ذہن میں نقش ہو جایا کرتی ہیں، دلچسپی میں اضافہ ہوتا ہے اور بہت سے ابہام دور ہو جاتے ہیں۔قرآن میں کئی مقامات پر جنت اور اس کی نعمتوں کی اس قدر دلکش منظر کشی کی گئی ہے کہ قاری اگر ان مناظر کو پوری طرح احاطۂ خیال میں لانے کی استطاعت رکھتا ہو تو اسے ایک منفرد سرور اور دلکشی محسوس ہوگی اور وہ خود کو اس منظر کا ایک حصّہ سمجھے گا۔

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ o فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ o ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ o فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ o فِیْهِمَا عَیْنٰنِ تَجْرِیٰنِ o فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ o فِیْهِمَا مِنْ کُلِّ فَاکِهَةٍ زَوْجٰنِ o فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ o مُتَّکِئِیْنَ عَلٰی فُرُشٍۭ بَطَآئِنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ ط وَجَنَا الْجَنَّتَیْنِ دَانٍ o فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ o فِیْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ لا لَمْ یَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ o فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ o کَاَنَّهُنَّ الْیَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ o فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ o هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ o فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ o وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ o فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ o مُدْهَآمَّتٰنِ o فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ o فِیْهِمَا عَیْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ o فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ o فِیْهِمَا فَاکِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ o فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ o فِیْهِنَّ خَیْرٰتٌ حِسَانٌ o فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ o حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِی الْخِیَامِ o فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ o لَمْ یَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ o فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ o مُتَّکِئِیْنَ عَلٰی رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِیٍّ حِسَانٍ o فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ o تَبٰرَکَ اسْمُ رَبِّکَ ذِی الْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ o

اور ہراُس شخص کے لیے جو اپنے رب کے حضور پیش ہونے کا خوف رکھتا ہو، دو باغ ہیں۔اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ ہری بھری ڈالیوں سے بھرپور۔اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ دونوں باغوں میں دو چشمے رواں۔اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ دونوں باغوں میں ہر پھل کی دو قسمیں۔اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ جنتی لوگ ایسے فرشوں پر تکیے لگا کے بیٹھیں گے جن کے استر دبیز ریشم کے ہوں گے،اور باغوں کی ڈالیاں پھلوں سے جھکی پڑ رہی ہوں گی۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ ان نعمتوں کے درمیان شرمیلی نگاہوں والیاں ہوں گی جنہیں ان جنتیوں سے پہلے کسی انسان یا جن نے چھوا نہ ہوگا۔اپنے رب کی کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ ایسی خوبصورت جیسے ہیرے اور موتی۔اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ پھر اے جن وانس،اپنے رب کے کن کن اوصاف حمیدہ کا تم انکار کرو گے؟ اور اُن

دو باغوں کے علاوہ دو باغ اور ہوں گے۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کوتم جھٹلاؤ گے؟ گھنے سرسبز وشادات باغ۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کوتم جھٹلاؤ گے؟ دو باغوں میں دو چشمے فواروں کی طرح ابلتے ہوئے۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کوتم جھٹلاؤ گے؟ ان میں بکثرت پھل اور کھجوریں اور انار۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کوتم جھٹلاؤ گے؟ ان نعتوں کے درمیان خوب سیرت اور خوب صورت بیویاں۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کوتم جھٹلاؤ گے؟ خیموں میں ٹھہرائی ہوئی حوریں۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کوتم جھٹلاؤ گے؟ اِن جنتیوں سے پہلے کبھی انسان یا جن نے اُن کو نہ چھوا ہوگا۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کوتم جھٹلاؤ گے؟ وہ جنتی سبز قالینوں اور نفیس ونادر فرشوں پر تکیے لگا کے بیٹھیں گے۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کوتم جھٹلاؤ گے؟ بڑی برکت والا ہے تیرے رب جلیل وکریم کا نام۔
(الرحمٰن:۴۶-۷۸)

اسی طرح جہنم اور آگ کی اس قدر بھیانک منظرکشی کی گئی ہے کہ انسان پر خوف اور ہیبت سے لرزہ طاری ہوجاتا ہے۔

وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا وَّهِيَ تَفُوْرُ ۝ تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَا اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ۝
جن لوگوں نے اپنے رب سے کفر کیا اور ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔ جب وہ اس میں پھینکیں جائیں گے تو اس کے دھاڑنے کی ہولناک آوازیں سنیں گے اور وہ جوش کھا رہی ہوگی۔ (الملک:۶-۸)

قیامت کے مناظر کی تصویرکشی نہایت خوفناک اور دل دہلا دینے والی ہے۔

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۝ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۝ وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝ وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ۝
جب آسمان پھٹ جائے گا اور جب تارے بکھر جائیں گے اور جب سمندر پھاڑ دیے جائیں گے اور جب قبریں کھول دی جائیں گی۔ (الانفطار:۱-۴)

يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۝ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ۝

وہ دن جب لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح اور پہاڑ رنگ برنگ کے دھنکے ہوئے اون کی طرح ہوں گے۔ (القارعۃ:۴-۵)

۱۱۔ مختلف کرداروں کے ذریعے تعلیم وتربیت

شخصیات اور کرداروں کی مؤثر تعلیم وتربیت میں بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ان کے ذریعے انسانی زندگی کے بہت سے پہلوؤں کو اُجاگر کیا جاسکتا ہے۔اخلاقی تربیت کی جاسکتی ہے،کردار سازی کی جاسکتی ہے۔کچھ کردار سیکھنے والے کے ذہن پر دیرپا اثرات مرتب کردیتے ہیں اور رول ماڈل بن جاتے ہیں۔تعلیم وتدریس کے عمل میں بوریت،اُکتاہٹ اور عدم دلچسپی کے بجائے دلچسپی،تنوع اور ترغیب کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

قرآن پاک میں متعدد حقیقی شخصیات اور کرداروں کے ذریعے سے تعلیم وتدریس اور تربیت و تزکیہ کا کام لیا گیا ہے۔ان کرداروں میں ایک طرف انبیاء اور صالحین جیسے اعلیٰ وارفع کردار ہیں جبکہ دوسری طرف فرعون،قارون اور جالوت جیسے ظالم اور متکبر کردار بھی ہیں۔مومنین،محسنین،کافرین اور منافقین ہر طرح کے کرداروں کے ذریعے سے احسن طریقے سے تعلیم وتربیت کی گئی ہے۔قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں حقیقی کردار باری باری اُبھرتے ہیں۔تعلیم وتربیت میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں اور اوجھل ہوجاتے ہیں۔ساتھ ہی اُفق پہ دوسرے کردار نمودار ہوتے ہیں۔درسی کُتب کے مصنفین اور اساتذہ کرام کو چاہیے کہ قرآن کے اس اندازِ تدریس کو اپنائیں اور درس وتدریس کے عمل کو مختلف کرداروں کے ذریعے مؤثر اور دلچسپ بنائیں۔

۱۲۔ مترنّم اور دلکش انداز

انداز تدریس کا دلکش اور دلچسپ ہونا موثر تدریس کے لیے ضروری ہے۔استاد کی زبان اور لب ولہجہ میں جس قدر مٹھاس ہوگی۔طلبہ اتنا ہی تعلیم کی طرف راغب اور مائل ہوں گے بلکہ کھنچے چلے آئیں گے۔اسی طرح نفس مضمون میں جس قدر دلکشی ہوگی اتنا ہی طلبہ کی دلچسپی میں اضافہ ہوگا اور وہ نہ تو

بوریت محسوس کریں گے اور نہ ہی تعلیم سے فرار اور گریز کی کوشش کریں گے۔

قرآن کی زبان میں اس قدر دلکشی، ترنم اور مٹھاس ہے کہ نہ صرف یہ کہ چھ سات سال کی عمر کا بچہ اسے زبانی یاد کرلیتا ہے بلکہ بار بار دہرانے اور پڑھنے کے باوجود اس کی دلچسپی میں بجائے کمی کے اضافہ ہوتا جاتا ہے اور اکتاہٹ نہیں ہوتی۔ سورۃ رحمٰن اس کی زندہ مثال ہے۔ سورۃ الکوثر کی مثال سامنے رکھ لیں۔ اس میں اس قدر دلکشی اور ترنم ہے کہ اس کو پڑھ کر عرب کے شمس الشعراء لبیدؓ نے نہ صرف یہ کہ اسلام قبول کرلیا بلکہ اس کے سامنے اپنی شاعری کو ہیچ سمجھ کر شاعری چھوڑ دی۔

اِنَّآ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ o فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانۡحَرۡ o اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الۡاَبۡتَرُ o

(اے نبیؐ) ہم نے تمہیں کوثر عطا کر دیا۔ پس تم اپنے رب ہی کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو۔ تمہارا دشمن ہی جڑ کٹا ہے۔ (الکوثر: ۱-۳)

۱۳۔ مختصر، جامع، واضح اور بیّن انداز

قرآنِ پاک کا اندازِ تدریس نہایت جامع، مختصر اور موضوع کے عین مطابق ہے جس میں ابہام یا اختلاف کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ مثلاً میاں بیوی کے حقوق و فرائض اور باہمی قربت کو نہایت جامع، مختصر اور بین مثال کے ذریعے کچھ اس طرح وضاحت کی گئی۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمۡ وَ اَنۡتُمۡ لِبَاسٌ لَّهُنَّ o

وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے۔ (البقرۃ: ۱۸۷)

مِنۡهَا خَلَقۡنٰكُمۡ وَ فِيۡهَا نُعِيۡدُكُمۡ وَ مِنۡهَا نُخۡرِجُكُمۡ تَارَةً اُخۡرٰى o

اِسی زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا ہے، اِسی میں ہم تمہیں واپس لے جائیں گے اور اسی سے تم کو دوبارہ نکالیں گے۔ (طٰہٰ: ۵۵)

مؤثر تدریس کے لیے نہ صرف یہ کہ کتاب (نفسِ مضمون) بلکہ اُستاد کا اندازِ تدریس (ہردو) کا مختصر، جامع اور موضوع کے عین مطابق ہونا ضروری ہے۔ غیر متعلقہ، غیر واضح، بے جا تفصیلات اور ابہام والی کتاب یا اندازِ تدریس مؤثر تدریس کے اصولوں اور حکمت عملی کے بالکل برعکس ہے۔

۱۴۔ چیزوں کی درجہ بندی

یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ لمبے لمبے پیراگراف، تقاریر اور لیکچرز کا پوری طرح سے احاطہ کرنا اور یاد رکھنا مشکل کام ہے۔ اس کے برعکس اگر چیزوں، خیالات اور نظریات وغیرہ کی درجہ بندی اور تخصیص کر دی جائے تو یاد رکھنا نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔

قرآن متعدد مقامات پر چیزوں کی اس طرح درجہ بندی کر کے پیش کرتا ہے کہ سمجھنا اور یاد رکھنا بہت آسان ہو جاتا ہے، مثلاً: متقین، مؤمنین اور عباد الرحمٰن کی خصوصیات اس طرح بیان کرتا ہے کہ قاری ان خصوصیات کو انگلیوں پر گن سکتا ہے اور آسانی سے سمجھ سکتا ہے اور یاد کر سکتا ہے۔

درج ذیل آیات میں متقین کی پانچ خصوصیات بیان کی گئی ہیں جنھیں ہر کوئی آسانی سے سمجھ سکتا ہے اور یاد کر سکتا ہے۔

> **ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ o الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ o وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ o**
>
> یہ اللہ کی کتاب ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہدایت ہے اُن پرہیز گار لوگوں کے لیے، جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، جو رزق ہم نے اُن کو دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے (یعنی قرآن) اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں ان سب پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ (البقرۃ:۲-۴)

سورۃ المومنون کے شروع میں ہی مومنین کی درج ذیل سات صفات بیان کی گئی ہیں۔

> **قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ o الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ o وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ o وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ o وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ o وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ o وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَوٰتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ o**
>
> یقیناً فلاح پائی ہے ایمان لانے والوں نے جو: اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں، لغویات سے دور رہتے ہیں، زکوٰۃ کے طریقے پر عامل ہوتے ہیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، اپنی امانتوں

اور اپنے عہد و پیمان کا پاس رکھتے ہیں اور اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں۔
(المؤمنون:۱-۵، ۸، ۹)

عبادالرحمٰن کی درج ذیل خصوصیات بیان ہوئی ہیں جنہیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے اور یاد کیا جا سکتا ہے۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا o وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا o وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا o اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا o وَالَّذِیْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَكَانَ بَیْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا o وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا یَزْنُوْنَ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ یَلْقَ اَثَامًا o وَالَّذِیْنَ لَا یَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا o

رحمان کے (اصلی) بندے وہ ہیں جو زمین پر نرم چال چلتے ہیں اور جاہل ان کے منہ کو آئیں تو کہہ دیتے ہیں کہ تم کو سلام۔ جو اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں۔ جو دعائیں کرتے ہیں کہ ''اے ہمارے رب، جہنم کے عذاب سے ہم کو بچالے، اس کا عذاب تو جان کا لاگو ہے، وہ بڑا ہی برا مستقر اور مقام ہے''۔ جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل، بلکہ ان کا خرچ دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتا ہے۔ جو اللہ کے سوا کسی اور معبود کو نہیں پکارتے، اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو ناحق ہلاک نہیں کرتے، اور نہ زنا کرتے کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یہ کام جو کوئی کرے وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے گا۔ (اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں) جو جھوٹ کے گواہ نہیں بنتے اور کسی لغو چیز پر ان کا گزر ہو جائے تو شریف آدمیوں کی طرح گزر جاتے ہیں۔ (الفرقان:۶۳-۶۸، ۷۲)

قرآن پاک کے مذکورہ انداز سے سبق لیتے ہوئے درسی کتابوں کے مصنفین اور اساتذہ کو چاہیے کہ جہاں ممکن ہو طلبہ کو نکتہ وار اس طرح پیش کریں کہ وہ اُسے انگلیوں پر شمار کر سکیں جسے انگریزی کی اصطلاح میں (Bullet Point Counting) کہا جاتا ہے تاکہ وہ آسانی سے سمجھ بھی سکیں اور یاد بھی رکھ سکیں۔

۱۵۔ مکالماتی گفتگو کا انداز

کئی ایک مضامین بالخصوص لسانیات وغیرہ کی تدریس میں مکالماتی گفتگو کا انداز مؤثر تدریسی تکنیک سمجھی جاتی ہے۔قرآن انسان کو ہدایت کی راہ دکھانے اور صراطِ مستقیم کی تعلیمات کے لیے مکالماتی اور باہمی گفتگو کا انداز بھی اپناتا ہے۔قرآن میں مذکورہ طرز کے کئی مکالمے ہیں۔کہیں اللہ تعالیٰ اور موسیٰ علیہ السلام کے درمیان، کہیں موسیٰ علیہ السلام اور فرعون، کہیں اللہ تعالیٰ اور ابلیس، کہیں ابلیس اور حضرت آدم علیہ السلام، کہیں مومنین اور کفار کے درمیان، کہیں ملائکہ اور اہل جنت، کہیں ملائکہ اور اہل جہنم، کہیں گمراہ کرنے والوں اور گمراہ ہونے والوں کے درمیان، کہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اُن کی قوم کے درمیان، کہیں حضرت سلیمان علیہ السلام اور ملکہ سبا، کہیں حضرت یوسف علیہ السلام اور اُن کے بھائیوں اور باپ کے درمیان مکالمہ۔سورۃ اعراف میں تین گروہ یعنی اہل جنت، اہل دوزخ اور اعراف والے بیک وقت گفتگو کر رہے ہیں۔مذکورہ گفتگو کے ذریعے سے جو دراصل سہ فریقی گفتگو ہے، نہایت اہم پیغامات اور تعلیمات دی گئی ہیں۔چند نمایاں مثالیں حسبِ ذیل ہیں۔

اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کے درمیان مکالمہ

وَ اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِکُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ o وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَی الْمَلٰٓئِکَةِ فَقَالَ اَنْۢبِئُوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ o قَالُوْا سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ o قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّکُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا کُنْتُمْ تَکْتُمُوْنَ o

پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ ”میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں“ انہوں نے عرض کیا: ”کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں، جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خونریزیاں کرے گا۔آپ کی حمد وثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کے لیے تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں“۔فرمایا: ”میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے“۔اس کے بعد اللہ نے آدمؑ کو ساری

چیزوں کے نام سکھائے، پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا ''اگر تمہارا خیال صحیح ہے (کہ کسی خلیفہ کے تقرر سے انتظام بگڑ جائے گا) تو ذرا ان چیزوں کے نام بتاؤ''۔ انہوں نے عرض کیا: ''نقص سے پاک تو آپ ہی کی ذات ہے، ہم تو بس اتنا ہی علم رکھتے ہیں، جتنا آپ نے ہم کو دے دیا ہے۔ حقیقت میں سب کچھ جاننے اور سمجھنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں''۔ پھر اللہ نے آدمؑ سے کہا: ''تم انہیں ان چیزوں کے نام بتاؤ'' جب اس نے ان کو اُن سب کے نام بتا دیے تو اللہ نے فرمایا: ''میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی ساری حقیقتیں جانتا ہوں جو تم سے مخفی ہیں، جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو، وہ بھی مجھے معلوم ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو، اسے بھی میں جانتا ہوں''۔ (البقرۃ:۳۰-۳۳)

اللہ تعالیٰ اور موسیٰ علیہ السلام کے درمیان مکالمہ

وَاِذْ نَادٰی رَبُّکَ مُوْسٰٓی اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ o قَوْمَ فِرْعَوْنَ اَلَا یَتَّقُوْنَ o قَالَ رَبِّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّکَذِّبُوْنِ o وَیَضِیْقُ صَدْرِیْ وَلَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ فَاَرْسِلْ اِلٰی هٰرُوْنَ o وَلَهُمْ عَلَیَّ ذَنْبٌ فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ o قَالَ کَلَّا فَاذْهَبَا بِاٰیٰتِنَآ اِنَّا مَعَکُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ o

انہیں اس وقت کا قصہ سناؤ جب کہ تمہارے رب نے موسیٰ کو پکارا ''ظالم قوم کے پاس جا فرعون کی قوم کے پاس، کیا وہ ڈرتے نہیں؟'' اس نے عرض کیا ''اے میرے رب، مجھے خوف ہے کہ وہ مجھے جھٹلا دیں گے، میرا سینہ گھٹتا ہے اور میری زبان نہیں چلتی آپ ہارونؑ کی طرف رسالت بھیجیں اور مجھ پر اُن کے ہاں ایک جرم کا الزام بھی ہے، اس لیے ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے''۔ فرمایا ''ہرگز نہیں، تم دونوں جاؤ ہماری نشانیاں لے کر، ہم تمہارے ساتھ سب کچھ سنتے رہیں گے''۔ (الشعراء:۱۰-۱۵)

موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان مکالمہ

فَاْتِیَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ o اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ o قَالَ اَلَمْ نُرَبِّکَ فِیْنَا وَلِیْدًا وَّلَبِثْتَ فِیْنَا مِنْ عُمُرِکَ سِنِیْنَ o وَفَعَلْتَ فَعْلَتَکَ الَّتِیْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ o قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّیْنَ o فَفَرَرْتُ مِنْکُمْ لَمَّا خِفْتُکُمْ فَوَهَبَ لِیْ رَبِّیْ حُکْمًا وَّجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ o وَتِلْکَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَیَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ o قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ o قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا ط اِنْ کُنْتُمْ مُّوْقِنِیْنَ o قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ o قَالَ رَبُّکُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِکُمُ الْاَوَّلِیْنَ o قَالَ اِنَّ رَسُوْلَکُمُ الَّذِیْٓ اُرْسِلَ اِلَیْکُمْ لَمَجْنُوْنٌ o قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَیْنَهُمَا ط

اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ o قَالَ لَئِنِ اتَّخَذۡتَ اِلٰهًا غَيۡرِىۡ لَاَجۡعَلَنَّكَ مِنَ الۡمَسۡجُوۡنِيۡنَ o

فرعون کے پاس جاؤ اور اس سے کہو، کہ ہم کو رب العالمین نے اس لیے بھیجا ہے کہ تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے۔فرعون نے کہا ''کیا ہم نے تجھ کو اپنے ہاں بچہ سا نہیں پالا تھا؟ تو نے اپنی عمر کے کئی سال ہمارے ہاں گزارے اور اس کے بعد کر گیا جو کچھ کہ کر گیا، تو بڑا احسان فراموش آدمی ہے''۔موسیٰ نے جواب دیا ''اس وقت وہ کام میں نے نادانستگی میں کر دیا تھا پھر میں تمہارے خوف سے بھاگ گیا اس کے بعد میرے رب نے مجھ کو حکم عطا کیا اور مجھے رسولوں میں شامل کر لیا رہا تیرا احسان جو تو نے مجھ پر جتایا ہے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا لیا تھا''۔فرعون نے کہا ''یہ رب العالمین کیا ہوتا ہے؟'' موسیٰ نے جواب دیا ''آسمان اور زمین کا رب، اور اُن سب چیزوں کا رب جو آسمان اور زمین کے درمیان ہیں، اگر تم یقین لانے والے ہو''۔فرعون نے اپنے گردوپیش کے لوگوں سے کہا ''سنتے ہو؟''۔موسیٰ نے کہا ''تمہارا رب بھی اور تمہارے ان آباءواجداد کا رب بھی جو گزر چکے ہیں''۔فرعون نے حاضرین سے کہا ''تمہارے یہ رسول صاحب جو تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں، بالکل ہی پاگل معلوم ہوتے ہیں''۔موسیٰ نے کہا ''مشرق و مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب، اگر آپ لوگ کچھ عقل رکھتے ہیں''۔فرعون نے کہا ''اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو معبود بنایا تو تجھے میں ان لوگوں میں شامل کر دوں گا جو قید خانوں میں پڑے سڑ رہے ہیں''۔
(الشعراء:۱۶-۲۹)

فرعون اور جادوگروں کے درمیان مکالمہ

قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ o رَبِّ مُوۡسٰى وَهٰرُوۡنَ o قَالَ اٰمَنۡتُمۡ لَهٗ قَبۡلَ اَنۡ اٰذَنَ لَكُمۡ اِنَّهٗ لَـكَبِيۡرُكُمُ الَّذِىۡ عَلَّمَكُمُ السِّحۡرَ فَلَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ لَاُقَطِّعَنَّ اَيۡدِيَكُمۡ وَاَرۡجُلَكُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ o قَالُوۡا لَا ضَيۡرَ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا مُنۡقَلِبُوۡنَ o

اور بول اٹھے کہ ''مان گئے ہم رب العالمین کو موسیٰ اور ہارون کے رب کو''۔فرعون نے کہا ''تم موسیٰ کی بات مان گئے قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دیتا! ضرور یہ تمہارا بڑا ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے اچھا، ابھی تمہیں معلوم ہو جاتا ہے، میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں میں کٹواؤں گا اور تم سب کو سولی چڑھاؤں گا''۔انہوں نے جواب دیا ''کچھ پرواہ نہیں، ہم اپنے رب کے حضور پہنچ جائیں گے''۔ (الشعراء:۴۷-۵۰)

قرآن پاک کے مذکورہ باہمی گفتگو، مکالمہ، مناظرہ اور مجادلہ کے انداز سے سیکھتے ہوئے اور مذکورہ تکنیک اپناتے ہوئے اساتذہ بعض اسباق بڑے موثر انداز میں پیش کر سکتے ہیں۔

۱۶۔ مخاطبانہ اور تقریری اندازِ تدریس

قرآن میں کئی مقامات پر خطیبانہ اور تقریری اندازِ تدریس سے بھی کام لیا گیا ہے اور اہم پیغامات اور تعلیمات دی گئی ہیں۔ کبھی اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو کبھی انبیائے کرام، کبھی نبی اسرائیل کو اور کبھی انسانوں اور جنوں کو مخاطب کر کے اہم تعلیمات دیتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جو کچھ مال متاع ہم نے تم کو بخشا ہے، اس میں سے خرچ کرو، قبل اس کے کہ وہ دن آئے، جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی، نہ دستی کام آئے گی اور نہ سفارش چلے گی اور ظالم اصل میں وہی ہیں، جو کفر کی روش اختیار کرتے ہیں۔ (البقرۃ:۲۵۴)

يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ○

اے بنی اسرائیل! ذرا خیال کرو میری اس نعمت کا جو میں نے تم عطا کی تھی، میرے ساتھ تمہارا جو دہد تھا اسے تم پورا کرو، تو میرا جو عہد تمہارے ساتھ تھا اسے میں پورا کروں گا اور مجھ ہی سے تم ڈرو۔ (البقرۃ:۴۰)

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ○

اے گروہ جن و انس، گر تم زمین اور آسمانوں کی سرحدوں سے نکل کر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ دیکھو نہیں بھاگ سکتے اس کے لیے بڑا زور چاہیے۔ (سورۃ الرحمٰن:۳۳)

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاۗءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَاۗءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ○

لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آ گئی ہے یہ وہ چیز ہے جو دلوں کے امراض کی شفا ہے اور جو اسے قبول کر لیں ان کے لیے رہنمائی اور رحمت ہے۔ (سورۃ یونس: ۵۷)

اساتذہ بعض اسباق کی تدریس کے لیے قرآن کا مخاطبانہ اور تقریری انداز اپنا کر اپنی تدریس مؤثر اور مفید بنا سکتے ہیں۔

۱۷۔ ذاتی مشاہدات اور تجربات

ذاتی مشاہدات اور تجربات کے ذریعے سے حاصل کیا جانے والا علم زیادہ پختہ، یقینی اور مؤثر ہوتا ہے۔ ایسے علوم کے نقوش نسبتاً زیادہ گہرے اور دیرپا ہوتے ہیں۔ ذاتی مشاہدات پر مبنی درس و تدریس بھی زیادہ مؤثر اور مفید سمجھی جاتی ہے۔ آج کی دنیا میں خصوصاً عصری علوم میں ذاتی مشاہدات اور تجربات کے ذریعے سے تعلیم و تربیت کو بہت مفید اور مؤثر سمجھا جاتا ہے۔ لسانیات اور سائنس کے مضامین میں پریکٹیکل (یعنی عملی مشق) کا حصہ لازمی سمجھا جاتا ہے۔ قرآن نے انسان کی ہدایت کے لیے جو اندازِ تدریس اختیار کیا ہے اس میں ذاتی مشاہدہ اور تجربہ کو بہت اہمیت دی ہے۔ قرآن ایسے علوم کو عین الیقین کے زمرے میں شامل کرتا ہے۔ اساتذہ کو چاہیے کہ وہ اپنے طلبہ کو زیادہ سے زیادہ ذاتی مشاہدات اور تجربات کے مواقع فراہم کریں اور تعلیمی سیاحت کا اہتمام کریں۔

قرآنِ پاک کی درج ذیل آیات حصول علم کے لیے ذاتی مشاہدات اور تجربات پہ زور دیتی ہیں۔

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ وَلِلْکٰفِرِیْنَ اَمْثَالُهَا o

کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہ تھے کہ اُن لوگوں کا انجام دیکھتے جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں؟ اللہ نے اُن کا سب کچھ اُن پر الٹ دیا، اور ایسے نتائج اِن کافروں کے لیے مقدر ہیں۔ (سورۃ محمد: ۱۰)

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُزْجِیْ سَحَابًا ثُمَّ یُؤَلِّفُ بَیْنَهٗ ثُمَّ یَجْعَلُهٗ رُکَامًا فَتَرَی الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ وَیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِیْهَا مِنْۢ بَرَدٍ فَیُصِیْبُ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ وَیَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ یَّشَآءُ یَکَادُ سَنَا بَرْقِهٖ یَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ o

کیاتم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ بادل کو آہستہ آہستہ چلاتا ہے، پھر اس کے ٹکڑوں کو باہم جوڑتا ہے، پھر اسے سمیٹ کر ایک کثیف ابر بنا دیتا ہے، پھر تم دیکھتے ہو کہ اس کے خول میں سے بارش کے قطرے ٹپکتے چلے آتے ہیں اور وہ آسمان سے، اُن پہاڑوں کی بدولت جو اس میں بلند ہیں، اولے برساتا ہے، پھر جسے چاہتا ہے ان کا نقصان پہنچاتا ہے اور جسے چاہتا ہے ان سے بچا لیتا ہے اُس کی بجلی کی چمک نگاہوں کو خیرہ کیے دیتی ہے۔ (سورۃ النور:۴۳)

وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا وَ مِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِیَةٌ وَّ جَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ الزَّیْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّ غَیْرَ مُتَشَابِهٍ اُنْظُرُوْٓا اِلٰی ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَ یَنْعِهٖ اِنَّ فِیْ ذٰلِكُمْ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ o

اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعہ سے ہر قسم کی نباتات اگائی، پھر اس سے ہرے ہرے کھیت اور درخت پیدا کیے، پھر ان سے تہ بہ تہ چڑھے ہوئے دانے نکالے اور کھجور کے شگوفوں سے پھلوں کے گچھے کے گچھے پیدا کیے جو بوجھ کے مارے جھکے پڑتے ہیں، اور انگور، زیتون اور انار کے باغ لگائے جن کے پھل ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہیں اور پھر اُن کے پکنے کی کیفیت ذرا غور کی نظر سے دیکھو، اِن چیزوں میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔
(سورۃ الأنعام:۹۹)

وَ اَمْطَرْنَا عَلَیْهِمْ مَّطَرًا فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِیْنَ o

بچا کر نکال دیا اور اس قوم پر برسائی ایک بارش، پھر دیکھو کہ اُن مجرموں کا کیا انجام ہوا۔
(سورۃ الأعراف:۸۴)

الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِیْرٌ o

جس نے تہ بر تہ سات آسمان بنائے تم رحمان کی تخلیق میں کسی قسم کی بے ربطی نہ پاؤ گے پھر پلٹ کر دیکھو، کہیں تمہیں کوئی خلل نظر آتا ہے؟ بار بار نگاہ دوڑاؤ تمہاری نگاہ تھک کر نامراد پلٹ آئے گی۔
(سورۃ الملک:۳-۴)

۱۸۔ تعلیم وتدریس میں حواسِ خمسہ بالخصوص سماعت پہ زور

تعلیم وتدریس میں حواس خمسہ کے استعمال کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔انسان بہت سے علوم سن کر، دیکھ کر، چکھ کر، چُھو کر اور سونگھ کر حاصل کرتا ہے۔ بالخصوص سائنسی علوم کی تعلیم وتدریس میں حواس خمسہ کا استعمال سب سے زیادہ ہوتا ہے۔لسانیات کی تعلیم وتدریس میں سماعت کو اولین فوقیت حاصل ہے۔قرآن میں حقائق کا فہم وادراک حاصل کرنے کے لیے بالخصوص قوتِ سامعہ اور قوتِ باصرہ کو استعمال میں لانے کی بار بار دعوت دی گئی ہے۔جیسا کہ سورۃ الملک کی محولہ بالا آیات میں ہم ابھی دیکھ چکے ہیں۔

سورۃ قٓ میں ارشاد ہوا:

اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيْجٍ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ

اچھا، تو کیا انہوں نے کبھی اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا؟ کس طرح ہم نے اسے بنایا اور آراستہ کیا، اور اس میں کہیں کوئی رخنہ نہیں ہے۔اور زمین کو ہم نے بچھایا اور اس میں پہاڑ جمائے اور اس کے اندر ہر طرح کی خوش منظر نباتات اگا دیں۔ یہ ساری چیزیں آنکھیں کھولنے والی اور سبق دینے والی ہیں ہر اس بندے کے لیے جو (حق کی طرف) رجوع کرنے والا ہو۔اور آسمان سے ہم نے برکت والا پانی نازل کیا، پھر اس سے باغ اور فصل کے غلے اور بلند وبالا کھجور کے درخت پیدا کر دیے جن پر پھلوں کے خوشے تہہ بہ تہہ لگتے ہیں۔ یہ انتظام ہے بندوں کو رزق دینے کا۔اس پانی سے ہم ایک مردہ زمین کو زندگی بخش دیتے ہیں، (مرے ہوئے انسانوں کا زمین سے) نکلنا بھی اسی طرح ہوگا۔
(قٓ:۶-۱۱)

اسی طرح حقائق کے ادراک کے لیے قرآن نے قوتِ سماعت کے استعمال اور اس کی اہمیت پر کئی مقامات پر زور دیا ہے۔تاہم قرآن صرف سننے کو کافی نہیں سمجھتا بلکہ سننے کے ساتھ ساتھ غور وفکر اور

تدّبر و تعقل پہ بھی زور دیتا ہے تاکہ سننے والا ہدایت حاصل کر سکے اور حقائق کا ادراک کر سکے۔ سورۃ اعراف میں ارشاد ہوا:

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ

جب قرآن تمہارے سامنے پڑھا جائے تو اسے توجہ سے سنو اور خاموش رہو، شاید کہ تم پر بھی رحمت ہو جائے۔ (الاعراف:۲۰۴)

سورۃ حٰمٓ السجدہ میں ارشاد ہوا:

بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ

کہتے ہیں ''جس چیز کی طرف تو ہمیں بلا رہا ہے اس کے لیے ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں، ہمارے کان بہرے ہوگئے ہیں، اور ہمارے اور تیرے درمیان ایک حجاب حائل ہوگیا ہے۔ تو اپنا کام کر، ہم اپنا کام کیے جائیں گے۔ (حٰمٓ السجدہ:۴-۵)

اسی سورۃ کی آیت نمبر ۲۶ میں بتایا گیا کہ کس طرح کافر لوگوں کو قرآن کے سننے سے منع کرتے تھے۔ ''اور کافروں نے کہا اس قرآن کو سُنو ہی مت (اس کے پڑھے جانے کے وقت اور بیہودہ گوئی کرو۔ کیا عجب کہ تم غالب آ جاؤ''۔ یعنی کافروں کی حکمت عملی یہ تھی کہ قرآن کی درس و تدریس کے دوران شور کیا جائے، تالیاں اور سیٹیاں بجائی جائیں، چیخ چیخ کر باتیں کی جائیں تاکہ حاضرین کے کانوں میں قرآن کی آواز نہ جائے اور اُن کے دل قرآن کی بلاغت اور خوبیوں سے متاثر نہ ہوں۔

اس کے برعکس صحیح مسلم کی روایت کے مطابق مکّہ کے قریب نخلہ وادی میں جنّوں کی ایک ٹولی نے حضور ﷺ سے جب قرآن غور سے سُنا تو ایمان لائے اور جا کر اپنی قوم کو بھی بتلایا۔ سورۃ الاحقاف آیت نمبر ۲۹ میں ارشاد ہوا:

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ

(اور وہ واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے) جب ہم جنوں کے ایک گروہ کو تمہاری طرف لے آئے تھے تاکہ قرآن

سنیں جب وہ اس جگہ پہنچے (جہاں تم قرآن پڑھ رہے تھے) تو انہوں نے آپس میں کہا خاموش ہو جاؤ پھر جب وہ پڑھا جا چکا تو وہ خبردار کرنے والے بن کر اپنی قوم کی طرف پلٹے۔ (الاحقاف:۲۹)

علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین کے درجوں تک رسائی کے لیے نیز کائنات اور اللہ کی تخلیقات کا مشاہدہ، سماعت اور ان پر غور و فکر پہلا زینہ ہیں۔ جو لوگ نہ تو حق پہ غور و فکر کرتے ہیں اور نہ ہی حق دیکھتے اور سنتے ہیں۔ اُن کو قرآن میں چوپاؤں سے تشبیہ دی گئی ہے بلکہ اِن سے بھی زیادہ گمراہ۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ

اور یہ حقیقت ہے کہ بہت سے جن اور انسان ایسے ہیں جن کو ہم نے جہنم ہی کے لیے پیدا کیا ہے ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے زیادہ گئے گزرے، یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھو گئے ہیں۔ (الاعراف:۱۷۹)

قرآن کے اس طریقۂ تدریس سے یہ سبق ملتا ہے کہ علم کے حصول کے لیے حواس خمسہ کا بھرپور اور مناسب استعمال بہت حد تک مدد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ اساتذہ کو چاہیے کہ وہ اپنی ابلاغی مہارت کو پختہ اور مؤثر بنائیں۔ درس و تدریس کے ماحول کو سازگار بنائیں اور اپنی تقریر، لیکچر، درس اور باتوں کو اس قدر جامع، فصیح و بلیغ، دلچسپ اور مؤثر بنائیں کہ طلبہ پوری طرح متوجہ ہوں اور غور سے سُنیں۔ طلبہ میں غور سے دیکھنے اور چیزوں کا گہری نظر سے مشاہدہ کرنے کی عادت ڈالیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انھیں غور و فکر اور تدّبر و تفکر کی بھی دعوت دیں۔

۱۹۔ تدبر اور تفکر کی دعوت

غور و خوض، تدّبر و تفکر اور سمجھ بوجھ کے ساتھ حاصل کیا ہوا علم نسبتاً زیادہ مؤثر، مفید اور پائیدار سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس بغیر سمجھے، بغیر جانے اور محض رٹا لگا کر حاصل کیا ہوا علم غیر مفید، غیر مؤثر

اورنا پائیدار ہوتا ہے۔

قرآن رٹا لگانے کی حوصلہ شکنی کرتا ہے اور تدبّر، تفکر، غور وغوض اور سمجھ کر علم حاصل کرنے کی بار بار تلقین کرتا ہے اور زور دیتا ہے۔ قرآن مختلف آیات میں یتدّبرون، یتفکرون اور یتذکرون جیسے الفاظ کے ذریعے سے قاری کو سمجھنے، غور وخوض اور تدبر اور تفکر کی دعوت اور علمی تجسس پر زور دیتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَاتَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ نماز اس وقت پڑھنی چاہیے جب تم جانو کہ کیا کہہ رہے ہو۔ (النساء:۴۳)

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا

کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی۔ (النساء:۸۲)

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ

زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں اُن ہوش مند لوگوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں جو اُٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی ساخت میں غور وفکر کرتے ہیں (وہ بے اختیار بول اُٹھتے ہیں) ''پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا، تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے پس اے رب! ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔ (آل عمران:۱۹۰-۱۹۱)

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا يَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ

اور دیکھو، تمہارے رب نے شہد کی مکھی پر یہ بات وحی کر دی کہ پہاڑوں میں، اور درختوں میں، اور چھپروں میں جن پر لوگ بیلیں چڑھاتے ہیں، اپنے چھتے بنا اور ہر طرح کے پھلوں کا رس چوس اور اپنے

رب کی ہموار کی ہوئی راہوں پر چلتی رہ اِس مکھی کے اندر سے رنگ برنگ کا ایک شربت نکلتا ہے جس میں شفا ہے لوگوں کے لیے یقیناً اس میں ایک نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔
(النحل: ۶۸-۶۹)

اَفَلاَ یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا
کیا ان لوگوں نے قرآن پر غور نہیں کیا، یا دلوں پر اُن کے قفل چڑھے ہوئے ہیں؟ (محمد: ۲۴)

قرآن کا یہ اندازِ تدریس ہمیں سکھاتا ہے کہ تدبر، تفکر، سمجھ بوجھ اور غور و خوض پر زور دینا چاہیے اور رٹا لگوانے کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیے۔ آج ہمارے معیارِ تعلیم کی تیزی سے گراوٹ اور تنزّلی کی ایک بڑی وجہ سمجھ بوجھ کے بجائے امتحان پاس کرنے/کروانے کے لیے رٹا لگانا/لگوانا ہے، جسے کسی لحاظ سے بھی مؤثر تدریس نہیں سمجھا جا سکتا۔ واضح رہے کہ قرآن کو حفظ کرنا، اس کے متن کو اپنے ذہن میں محفوظ کرنے کے لیے بار بار پڑھنا اور رٹا لگانا ایک مستثنیٰ عمل ہے۔

۲۰۔ تجسس اور تحقیق پر مبنی تعلیم

حصول علم کے حوالے سے علمی تجسس اور تحقیق کی اہمیت، ضرورت اور افادیت سے کوئی بھی ذی عقل انکار نہیں کر سکتا۔ درس و تدریس میں ریسرچ اہم کردار ادا کرتی ہے۔ بالخصوص سائنسی علوم کی تعلیم و تدریس میں تحقیق کی بہت اہمیت اور افادیت ہے۔

قرآن مقدّس کئی مقامات پر انسان کو اللہ تعالیٰ کی تخلیقات کے بارے میں تحقیق اور ریسرچ کی دعوت و ترغیب دیتا ہے تاکہ انسان اِن ذاتی مشاہدات، تجربات اور تحقیقات کے ذریعے سے علم الیقین اور عین الیقین کے مراحل طے کرتے ہوئے حق الیقین کی منزل تک رسائی حاصل کر سکے۔ مثال کے طور پر قرآن کی درج ذیل آیات ملاحظہ کیجیے:

اَفَلاَ یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ

(یہ لوگ نہیں مانتے) تو کیا یہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے؟ آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے اٹھایا

گیا؟ پہاڑوں کونہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے گئے؟اور زمین کونہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی؟
(سورۃ الغاشیۃ: ۱۷-۲۰)

اساتذہ کرام کو چاہیے کہ وہ ریسرچ پر مبنی علم کو فروغ دیں۔ درس و تدریس کے عمل میں تحقیق سے مدد لیں۔ طلبہ کو تحقیق کی ترغیب اور دعوت دیں اور اس کے لیے ضروری سہولیات، معاونت اور راہنمائی فراہم کریں۔

۲۱۔ استقرائی اور استخراجی طریقہ تدریس

استخراجی طریقۂ تدریس میں اصول، فارمولا یا کلیہ پہلے دیا جاتا ہے اور پھر مثالوں اور سبقی مشقوں کے ذریعے سے اُس کی تشریح اور وضاحت کی جاتی ہے۔ جبکہ استقرائی طریقۂ تدریس میں پہلے مشقیں اور مثالیں دی جاتی ہیں اور آخر میں ان مشقوں اور مثالوں کی روشنی میں اصول، فارمولا یا کلیہ اخذ کیا جاتا ہے۔

قرآنِ مقدّس میں انسان کو ہدایت کی طرف راہنمائی اور تعلیم و تربیت اور تزکیہ کے لیے کچھ مقامات پر مذکورہ طریقہ ہائے تدریس سے بھی کام لیا گیا ہے۔ مثلاً: سورۃ العنکبوت میں اصول بیان کر دیا گیا ہے۔ جن لوگوں نے اللہ کی آیات سے کُفر کیا وہ اُس کی رحمت سے مایوس ہوں گے اور اُن کے لیے دردناک عذاب ہوگا اور یہ کہ تمھارے لیے اللہ کے علاوہ نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ ہی مددگار۔

وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ وَمَا لَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَلِقَآئِہٖٓ اُولٰٓئِکَ یَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِیْ وَاُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ

تم نہ زمین میں عاجز کرنے والے ہو نہ آسمان میں، اور اللہ سے بچانے والا کوئی سرپرست اور مددگار تمہارے لیے نہیں ہے۔ جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا اور اس سے ملاقات کا انکار کیا ہے وہ میری رحمت سے مایوس ہو چکے ہیں اور ان کے لیے دردناک سزا ہے۔ (سورۃ العنکبوت: ۲۲-۲۳)

مذکورہ بالا اصول کی تشریح اور وضاحت کے لیے اسی سورۃ کی آیات ۲۴ تا ۳۹ میں مختلف اقوامِ

عالم کے واقعات بیان کیے گئے جنھوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا اور نتیجتاً ان اقوام کو تباہ کر دیا گیا اور دردناک عذاب میں مبتلا کیا گیا۔ مثلاً اگلی آیات میں قوم ابراہیم، قوم لوط، قوم شعیب، عاد وثمود اور آل فرعون کا مختصر ذکر کر کے وضاحت کر دی گئی کہ اللہ کی آیات کا انکار کرنے کی پاداش میں کس طرح ان اقوام کو تباہ کر دیا گیا۔ آگے چل کر ان تمام اقوام کی تباہی کے واقعات کو نہایت خوبصورت انداز میں درج ذیل آیت میں نہایت اختصار کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ

آخرکار ہر ایک کو ہم نے اس کے گناہ میں پکڑا، پھر ان میں سے کسی پر ہم نے پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیجی، اور کسی کو ایک زبردست دھماکے نے آ لیا، اور کسی کو ہم نے زمین میں دھسا دیا، اور کسی کو غرق کر دیا اللہ اُن پر ظلم کرنے والا نہ تھا، مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے۔ (سورۃ العنکبوت:۴۰)

آیت نمبر ۴۰ میں مذکورہ بالا اقوامِ عالم کی مثالوں کی روشنی میں اگلی آیت میں ایک خوبصورت مثال کے ذریعے سے وہی اصول اخذ کیا گیا ہے کہ اللہ کے سوا تمھارا کوئی بھی حامی و مددگار نہیں۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ

جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دُوسرے سرپرست بنا لیے ہیں اُن کی مثال مکڑی جیسی ہے جو اپنا ایک گھر بناتی ہے اور سب گھروں سے زیادہ کمزور گھر مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے کاش یہ لوگ علم رکھتے۔
(سورۃ العنکبوت:۴۱)

اساتذہ کو چاہیے کہ استقرائی اور استخراجی طریقۂ تدریس کے ذریعے اپنی تدریس کو مؤثر بنائیں۔ بالخصوص ریاضی اور سائنس کی تدریس میں مذکورہ بالا طریقہ ہائے تدریس کافی مؤثر ثابت ہو سکتے ہیں۔

۲۲۔ استدراجی طریقہ تدریس

تعلیم و تربیت اور تزکیۂ نفس کے لیے استدراجی طریقہ زیادہ مؤثر اور مفید ثابت ہوا ہے۔ تعلیم و تربیت کے عمل میں طلبہ کی ذہنی آمادگی بہت ضروری ہوتی ہے۔ بعض اوقات ذہنی آمادگی کے کئی مراحل درپیش ہوتے ہیں۔ قرآن پاک کردار سازی اور تزکیۂ نفس کے لیے استدراجی طریقہ بھی اپناتا ہے۔ مثلاً شراب نوشی جیسی بُرائی کو ختم کرنے کے لیے انقلابی نہیں بلکہ استدراجی طریقہ اپنایا۔ شراب نوشی کی حُرمت کا حکم درج ذیل تین مختلف مراحل میں دیا گیا:

پہلا حکم

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ

پوچھتے ہیں: شراب اور جوئے کا کیا حکم ہے؟ کہو: ان دونوں چیزوں میں بڑی خرابی ہے اگرچہ ان میں لوگوں کے لیے کچھ منافع بھی ہیں، مگر ان کا گناہ اُن کے فائدے سے بہت زیادہ ہے پوچھتے ہیں: ہم راہ خدا میں کیا خرچ کریں؟ کہو: جو کچھ تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو اس طرح اللہ تمہارے لیے صاف صاف احکام بیان کرتا ہے، شاید کہ تم دنیا اور آخرت دونوں کی فکر کرو۔ (سورۃ البقرۃ:۲۱۹)

دوسرا حکم

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ نماز اُس وقت پڑھنی چاہیے، جب تم جانو کہ کیا کہہ رہے ہو۔ (النساء:۴۳)

تیسرا حکم (شراب کی مکمل حُرمت)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور پانسے، یہ سب گندے شیطانی کام ہیں،
ان سے پرہیز کرو، امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہوگی۔ (سورۃ المائدۃ:۹۰)

قرآن کے اندازِ تدریس سے یہ سبق ملتا ہے کہ تعلیم وتربیت اور تزکیہ نفس کے لیے ذہنی آمادگی بہت ضروری ہے۔ طلبہ کو بتدریج سیکھنے پر آمادہ کیا جائے اور ان کی نفسیات کے مطابق تعلیم وتربیت کی جائے۔

۲۳۔ اہم امور کا بار بار دہرانا، ذکر کرنا اور توجہ دلانا

مؤثر تدریس کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ جتنا کوئی معاملہ، مہارت، یا مسئلہ زیادہ اہم ہوتا ہے اتنا ہی اُسے زیادہ توجہ اور محنت سے سکھایا جاتا ہے، اس پر زیادہ زور دیا جاتا ہے، زیادہ توجہ مبذول کرائی جاتی ہے اور اُسے اُجاگر کیا جاتا ہے۔ تاکہ طلبہ اُس کی اہمیت، ضرورت اور افادیت کا شعور حاصل ہو سکے۔ قرآن میں جو باتیں، امور اور مسائل انسان کے لیے زیادہ اہم اور ضروری ہیں ان کو بار بار دہرایا گیا ہے۔ اُن کو مرکزی حیثیت دی گئی ہے تاکہ ان کو معمولی نہ سمجھا جائے، مثلاً: نماز کی اہمیت اور ضرورت کے پیش نظر اس کا حکم قرآن میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ، سچ بولنے، منافقت اور جھوٹ سے بچنے، دنیا کی محبت اور دولت کے بجائے فکر آخرت پر بار بار زور دیا گیا ہے۔ عقائد میں توحید کو سب سے زیادہ ترجیح دی گئی ہے۔ تکبر اور ظلم سے بچنے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا واقعہ کئی مقامات پر دہرایا گیا ہے۔ اسی طرح قوم لوط اور دیگر اقوام کے واقعات بھی قرآن پاک میں بار بار دہرائے گئے ہیں۔

قرآن کا درج بالا اندازِ تدریس اور اُسلوب ہمیں یہ درس دیتا ہے کہ تعلیم وتربیت کے حوالے سے اس بات کا خصوصی خیال رکھا جائے کہ جو امور مسائل اور مہارتیں وغیرہ جتنی اہم ہوں اُن پر اتنا ہی زیادہ زور دیا جائے اور توجہ بھی۔ ایسے امور کو اہمیت نہ دینا یا ان پر سطحی توجہ دینا مؤثر تدریس کے اصولوں کے خلاف ہوگا۔

۲۴۔ مشفقانہ اور مشاورتی انداز

اُستاد کا ناصحانہ، مشفقانہ اور مشاورتی انداز اور رویہ مؤثر تدریس میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔اس کے برعکس اُستاد کی بے جا سختی، تنقید اور غصہ طلبہ کے ذہنوں میں تعلیم سے گریز اور فرار کے رجحانات کو فروغ دیتا ہے۔اُستاد اور طالبِ علم میں باہمی محبت، شفقت اور کسی حد تک دوستی کا پہلو نمایاں ہونا چاہیے۔اسی طرح کئی ایک معاملات میں اگر استاد بچوں سے مشاورت کرے تو ان میں خود اعتمادی پیدا کی جا سکتی ہے بلکہ طلبہ اُس کام کو اپنا سمجھ کر زیادہ توجہ اور دل لگی سے کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔

قرآن میں کئی مقامات پر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے نہایت محبت اور اپنائیت کے انداز میں خطاب کرتے ہوئے بہت اہم پیغامات دیتے ہیں اور ہدایت کی تعلیم دیتے ہیں۔قرآن میں کئی آیات میں ''میرے بندوں سے کہہ دو'' جیسے محبت اور اپنائیت والے الفاظ سے مخاطب کیا گیا ہے۔

وَ اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ

اور اے نبیؐ، میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں، تو اُنہیں بتا دو کہ میں ان سے قریب ہی ہوں پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے، میں اُس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں لہٰذا انہیں چاہیے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں یہ بات تم اُنہیں سنا دو، شاید کہ وہ راہ راست پالیں۔ (سورۃ البقرۃ:۱۸۶)

قُلْ لِّعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَیُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْہِ وَلَا خِلٰلٌ

اے نبیؐ، میرے جو بندے ایمان لائے ہیں اُن سے کہہ دو کہ نماز قائم کریں اور جو کچھ ہم نے اُن کو دیا ہے، اُس میں سے کھلے اور چھپے (راہ خیر میں) خرچ کریں قبل اِس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہو گی اور نہ دوست نوازی ہو سکے گی۔ (سورۃ ابراھیم:۳۱)

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ

جَمِيۡعًا اِنَّهٗ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِيۡمُ

(اے نبیؐ) کہہ دو کہ اے میرے بندو، جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے، وہ تو غفور رحیم ہے۔ (سورۃ الزمر:۵۳)

اسی طرح اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ اُس کے بندے بھی اُس سے (اپنے رب) سے محبت کریں۔ سورۃ البقرۃ میں ارشادِ ربانی ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَنۡدَادًا يُّحِبُّوۡنَهُمۡ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ وَلَوۡ يَرَى الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡٓا اِذۡ يَرَوۡنَ الۡعَذَابَ اَنَّ الۡقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيۡعًا وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعَذَابِ

(مگر وحدتِ خداوندی پر دلالت کرنے والے اِن کھلے کھلے آثار کے ہوتے ہوئے بھی) کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر اور مدمقابل بناتے ہیں اور اُن کے ایسے گرویدہ ہیں جیسے اللہ کے ساتھ گرویدگی ہونی چاہیے حالانکہ ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں کاش، جو کچھ عذاب کو سامنے دیکھ کر انہیں سُوجھنے والا ہے وہ آج ہی اِن ظالموں کو سوجھ جائے کہ ساری طاقتیں اور سارے اختیارات اللہ ہی کے قبضے میں ہیں اور یہ کہ اللہ سزا دینے میں بھی بہت سخت ہے۔ (سورۃ البقرۃ:۱۶۵)

حضرت محمد ﷺ، جو آخری نبی ہونے کے ساتھ ساتھ معلم انسانیت بھی تھے، کا نرم دل اور رحم دل ہونا اللہ تعالیٰ کی خصوصی نعمت اور رحمت قرار دیا گیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنۡتَ لَهُمۡ وَلَوۡ كُنۡتَ فَظًّا غَلِيۡظَ الۡقَلۡبِ لَانۡفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِكَ فَاعۡفُ عَنۡهُمۡ وَاسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ وَشَاوِرۡهُمۡ فِى الۡاَمۡرِ فَاِذَا عَزَمۡتَ فَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُتَوَكِّلِيۡنَ

(اے پیغمبرؐ) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم اِن لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو ورنہ اگر کہیں تم تندخو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمہارے گردوپیش سے چھٹ جاتے اِن کے قصور معاف کر دو، اِن کے حق میں دعائے مغفرت کرو، اور دین کے کام میں ان کو بھی شریک مشورہ رکھو، پھر جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو، اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اُسی کے بھروسے پر کام

کرتے ہیں۔ (سورۃ آل عمران:۱۵۹)

غور کیجیے کہ جب فرعون جیسے ظالم، متکبر اور باغی کے پاس ہدایت کی تعلیم کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا گیا تو خصوصی ہدایات دی گئیں اور کہا گیا کہ فرعون سے نرمی (قَولاً لَّیِّناً) سے بات کرنا۔ سورۃ عبس میں نابینا صحابی حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ کے واقعے کے حوالے سے ہدایت دی گئی کہ جو کوئی بھی علم اور رشد و ہدایت کا طالب ہو اور سچی طلب کے ساتھ جاننا چاہتا ہو اسے ان اشرافیہ پر فوقیت اور ترجیح دی جائے جو دنیاوی حیثیت سے خواہ کتنے ہی بلند و بالا ہوں مگر طلب نہ رکھتے ہوں۔ غرض اُستاد کا رویہ بچوں کے ساتھ جس قدر مشفقانہ اور ہمدردانہ ہوگا درس و تدریس کا عمل اور نصیحت پذیری کی صورت اتنی ہی حوصلہ افزا ہوگی۔

۲۵۔ تعلیم و تربیت بذریعہ پند و نصائح

تعلیم و تدریس بالخصوص تربیت کے لیے پند و نصائح کی اہمیت اور افادیت سے کوئی بھی ذی شعور انکار نہیں کرسکتا۔ یعنی سادہ طریقے سے یہ بتایا جائے کہ کیا کام کرنے چاہییں اور کیا کام نہیں کرنے چاہییں (اوامر و نواہی)۔ کردار سازی اور اخلاقیات کی تعلیم و تربیت کے لیے مذکورہ طریقہ نہایت موزوں اور مناسب سمجھا جاتا ہے۔

قرآن پاک میں متعدد مقامات پر اوامر و نواہی اور پند و نصائح کے ذریعے سے انسان کو ہدایت کی طرف راہنمائی کی گئی ہے۔ سورۃ الانعام اور سورۃ بنی اسرائیل میں مختصر اور جامع انداز میں اخلاقی اور سماجی اقدار سکھائی گئی ہیں۔

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ذٰلِكُمْ

وَصّٰـىكُـمۡ بِـهٖ لَـعَلَّـكُمۡ تَذَكَّرُوۡنَ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِىۡ مُسۡتَقِيۡمًا فَاتَّبِعُوۡهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمۡ عَنۡ سَبِيۡلِهٖ ذٰلِكُمۡ وَصّٰىكُمۡ بِهٖ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ

اے محمدؐ! ان سے کہو کہ آ ؤ میں تمہیں سناؤں تمہارے رب نے تم پر کیا پابندیاں عائد کی ہیں: یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے اور بے شرمی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ یہ باتیں ہیں جن کی ہدایت اس نے تمہیں کی ہے، شاید کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو اور یہ کہ یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقہ سے جو بہترین ہو، یہاں تک کہ وہ اپنے سن رشد کو پہنچ جائے اور ناپ تول میں پورا انصاف کرو، ہم ہر شخص پر ذمہ داری کا اتنا ہی بار رکھتے ہیں جتنا اس کے امکان میں ہے، اور جب بات کہو انصاف کی کہو خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار ہی کا کیوں نہ ہو، اور اللہ کے عہد کو پورا کرو ان باتوں کی ہدایت اللہ نے تمہیں کی ہے شاید کہ تم نصیحت قبول کرو نیز اس کی ہدایت یہ ہے کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس کے راستے سے ہٹا کر تمہیں پراگندہ کر دیں گے یہ ہے وہ ہدایت جو تمہارے رب نے تمہیں کی ہے، شاید کہ تم کج روی سے بچو۔

(سورۃ الانعام: ۱۵۱-۱۵۳)

سورۃ لقمان میں حضرت لقمان اپنے بیٹے کی نصیحت کے ذریعے سے اخلاقی تربیت اور کردار سازی کرتے ہیں۔

وَاِذۡ قَالَ لُقۡمٰنُ لِابۡنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَىَّ لَا تُشۡرِكۡ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِيۡمٌ وَوَصَّيۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَيۡهِ حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ وَهۡنًا عَلٰى وَهۡنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِىۡ عَامَيۡنِ اَنِ اشۡكُرۡ لِىۡ وَلِوَالِدَيۡكَ اِلَىَّ الۡمَصِيۡرُ وَاِنۡ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنۡ تُشۡرِكَ بِىۡ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ فَلَا تُطِعۡهُمَا وَصَاحِبۡهُمَا فِى الدُّنۡيَا مَعۡرُوۡفًا وَّاتَّبِعۡ سَبِيۡلَ مَنۡ اَنَابَ اِلَىَّ ثُمَّ اِلَىَّ مَرۡجِعُكُمۡ فَاُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ يٰبُنَىَّ اِنَّهَآ اِنۡ تَكُ مِثۡقَالَ حَبَّةٍ مِّنۡ خَرۡدَلٍ فَتَكُنۡ فِىۡ صَخۡرَةٍ اَوۡ فِى السَّمٰوٰتِ اَوۡ فِى الۡاَرۡضِ يَاۡتِ بِهَا اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيۡفٌ خَبِيۡرٌ يٰبُنَىَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاۡمُرۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَانۡهَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَاصۡبِرۡ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ وَلَا تُصَعِّرۡ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمۡشِ فِى الۡاَرۡضِ مَرَحًا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخۡتَالٍ فَخُوۡرٍ وَاقۡصِدۡ فِىۡ مَشۡيِكَ وَاغۡضُضۡ مِنۡ صَوۡتِكَ اِنَّ اَنۡكَرَ الۡاَصۡوَاتِ لَصَوۡتُ الۡحَمِيۡرِ

یاد کرو جب لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا تو اس نے کہا ''بیٹا! خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، حق یہ ہے کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے'' اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی خود تاکید کی ہے اُس کی ماں نے ضعف پر ضعف اُٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اُس کا دودھ چھوٹنے میں لگے (اِسی لیے ہم نے اُس کو نصیحت کی کہ) میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجالا، میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے لیکن اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا تو ان کی بات ہرگز نہ مان دُنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ مگر پیروی اُس شخص کے راستے کی کر جس نے میری طرف رجوع کیا ہے پھر تم سب کو پلٹنا میری ہی طرف ہے، اُس وقت میں تمہیں بتا دوں گا کہ تم کیسے عمل کرتے رہے ہو (اور لقمان نے کہا تھا کہ) ''بیٹا، کوئی چیز رائی کے دانہ برابر بھی ہو اور کسی چٹان میں یا آسمانوں یا زمین میں کہیں چھپی ہوئی ہو، اللہ اُسے نکال لائے گا وہ باریک بیں اور باخبر ہے۔ بیٹا، نماز قائم کرنے کا حکم دے، بدی سے منع کر، اور جو مصیبت بھی پڑے اس پر صبر کر یہ وہ باتیں ہیں جن کی بڑی تاکید کی گئی ہے اور لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر، نہ زمین میں اکڑ کر چل، اللہ کسی خود پسند اور فخر جتانے والے شخص کو پسند نہیں کرتا اپنی چال میں اعتدال اختیار کر، اور اپنی آواز ذرا پست رکھ، سب آوازوں سے زیادہ بُری آواز گدھوں کی آواز ہوتی ہے۔

(سورۃ لقمان: ۱۳-۱۹)

تعلیم و تدریس کے حوالے سے سب سے بڑا مسئلہ اور چیلنج طلبہ کی تربیت اور کردار سازی ہے۔ طلبہ کی اخلاقی تربیت اور کردار سازی کا اہم فریضہ بطریقِ احسن پورا کیا جا سکتا ہے۔

۲۶۔ نگرانی کا نظام

مؤثر نگرانی مؤثر تعلیم و تدریس کے لیے بنیادی حیثیت کی حامل ہے۔ درس و تدریس کے ہر عمل میں نگرانی کے نظام کو مضبوط بنیادوں پر اُستوار کرنے کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ جو تعلیمی ادارے نگرانی کے نظام کو اہمیت نہیں دیتے، اُن کی کارکردگی اکثر و بیشتر مایوس کن ہوتی ہے۔ ایسے اداروں میں مؤثر تدریس ممکن نہیں ہو سکتی۔ اگر استاد اور طلبہ درس و تدریس کے حوالے سے غیر ذمّہ داری کا مظاہرہ کریں اور اُن کو پوچھنے والا کوئی نہ ہو تو مؤثر تدریس کا خواب پورا نہیں ہو سکتا۔ قرآن پاک میں انسان

کی ہدایت کے لیے جہاں تعلیم وتدریس کا ایک مکمل نظام دیا گیا ہے وہاں نگرانی کا بھی ایک مضبوط نظام تشکیل دیا گیا ہے۔ یہ نظام کم از کم درج ذیل چھ اقسام کی حکمت عملی پر مشتمل ہے۔

(الف) کراماً کاتبین کے ذریعے انسان کا ہر عمل لکھ لیا جاتا ہے۔

كِرَامًا كَاتِبِيْنَ o يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ o

ایسے معزز کاتب جو تمہارے ہر فعل کو جانتے ہیں۔ (الانفطار:۱۱-۱۲)

(ب) انسان کے اپنے ہاتھ پیر گواہی دیں گے۔

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ o

آج ہم اِن کے منہ بند کیے دیتے ہیں، اِن کے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے کہ یہ دنیا میں کیا کمائی کرتے رہے ہیں۔ (سورۃ یٰس:۶۵)

(ج) انسان کے کان، آنکھیں اور جلدیں (کھالیں) گواہی دیں گی۔

حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ

پھر جب سب وہاں پہنچ جائیں گے تو ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کے جسم کی کھالیں ان پر گواہی دیں گی کہ وہ دنیا میں کیا کچھ کرتے رہے ہیں وہ اپنے جسم کی کھالوں سے کہیں گے ’’تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟‘‘ وہ جواب دیں گی ’’ہمیں اُسی خدا نے گویائی دی ہے جس نے ہر چیز کو گویا کر دیا ہے اُسی نے تم کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اور اب اُسی کی طرف تم واپس لائے جا رہے ہو‘‘۔
(سورۃ حٰم السجدۃ:۲۰-۲۱)

(د) انسان کے ہر عمل کی ویڈیو بن رہی ہے جو اسے دکھائی جائے گی۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ

پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔ (سورۃ الزلزال۹۹:۷-۸)

(ہ) زمین پہ انسان جو عمل کرے گا زمین اس دن اس کے بارے میں بتائے گی۔

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا بِاَنَّ رَبَّکَ اَوْحٰی لَهَا

جب زمین اپنی پوری شدت کے ساتھ ہلا ڈالی جائے گی اور زمین اپنے اندر کے سارے بوجھ نکال کر باہر ڈال دے گی اور انسان کہے گا کہ یہ اِس کو کیا ہو رہا ہے؟ اُس روز وہ اپنے (اوپر گزرے ہوئے) حالات بیان کرے گی کیونکہ تیرے رب نے اُسے (ایسا کرنے کا) حکم دیا ہو گا۔

(سورۃ الزلزال:۱-۵)

(و) اللہ تعالیٰ خود السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ہے اُسے انسان کے ہر عمل، سوچ اور دلوں میں اُٹھنے والے وسوسوں تک کی خبر ہے۔

يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا اَحْصٰهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ

اُس دن (یہ ذلت کا عذاب ہونا ہے) جب اللہ ان سب کو پھر سے زندہ کر کے اٹھائے گا اور انہیں بتا دے گا کہ وہ کیا کچھ کر کے آئے ہیں وہ بھول گئے ہیں مگر اللہ نے ان سب کا کیا دھرا گن گن کر محفوظ کر رکھا ہے اور اللہ ایک ایک چیز پر شاہد ہے۔ (سورۃ المجادلہ:٦)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو، اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اُس نے کل کے لیے کیا سامان کیا ہے؟ اللہ سے ڈرتے رہو، اللہ یقیناً تمہارے اُن سب اعمال سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔

(سورۃ الحشر:۱۸)

وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ

تم خواہ چپکے سے بات کرو یا اونچی آواز سے (اللہ کے لیے یکساں ہے)، وہ تو دلوں کا حال تک جانتا ہے۔ کیا وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے؟ حالانکہ وہ باریک بیں اور باخبر ہے۔

(سورۃ الملک:۱۳-۱۴)

۲۷۔ اکتسابی جائزہ

کوئی بھی سرگرمی تحریک یا عمل ہو اُس کے مقاصد کا تعین کیا جاتا ہے اور آخر میں یہ جائزہ لیا جاتا ہے کہ وہ مقاصد جن کا شروع میں تعین کیا گیا تھا کس حد تک پورے ہوئے ہیں اور نہیں ہوئے تو کیا وجوہات تھیں اور اس جانچ اور جائزے کی روشنی میں آئندہ اصلاح کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔اس لحاظ سے اکتسابی جائزے کی اہمیت ،ضرورت اور افادیت سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا۔ مذکورہ جائزے کی روشنی میں نصاب، کتاب، طریقہ تدریس اور امتحانی نظام وغیرہ میں اصلاح کی جاسکتی ہے۔

قرآنی تعلیمات اس طرف واضح اشارہ کرتی ہیں کہ انسان کی زندگی کے جو مقاصد یعنی وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ اور الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً کے حوالے سے طے ہوئے ہیں اُن کے بارے میں مذکورہ بالا نظام کے ذریعے سے ہر گھڑی اعداد و شمار (ڈیٹا) اور معلومات (انفارمیشن) حاصل کی جارہی ہیں۔اکتسابی جائزہ لیا جارہا ہے اور میدان حشر میں انسان کو اُس کے اعمال پر مشتمل کتاب پیش کردی جائے گی۔

> وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا
>
> ہر انسان کا شگون ہم نے اُس کے اپنے گلے میں لٹکا رکھا ہے، اور قیامت کے روز ہم ایک نوشتہ اُس کے لیے نکالیں گے جسے وہ کھلی کتاب کی طرح پائے گا۔ پڑھ اپنا نامہ اعمال، آج اپنا حساب لگانے کے لیے تو خود ہی کافی ہے۔ (بنی اسرائیل:۱۳-۱۴)
>
> وَ وُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا
>
> اور نامہ اعمال سامنے رکھ دیا جائے گا اس وقت تم دیکھو گے کہ مجرم لوگ اپنی کتاب زندگی کے اندراجات سے ڈر رہے ہوں گے اور کہہ رہے ہوں گے کہ ہائے ہماری کم بختی، یہ کیسی کتاب ہے کہ ہماری کوئی

چھوٹی بڑی حرکت ایسی نہیں رہی جو اس میں درج نہ ہوگئی ہو جو کچھ انہوں نے کیا تھا وہ سب اپنے سامنے حاضر پائیں گے اور تیرا رب کسی پر ذرا ظلم نہ کرے گا۔ (سورۃ الکھف:۴۹)

مذکورہ بالا آیات یہ بتاتی ہیں کہ انسانی زندگی کے مقاصد کی روشنی میں اکتسابی جائزے کی بنیاد پر فیصلہ کر دیا جائے گا۔(یعنی نتیجے کا اعلان ہوگا) کہ کون کامیاب ہو گیا اور کون ناکام۔دنیا کے امتحان میں کون پاس ہو گیا اور کون فیل۔

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا وَّ یَنْقَلِبُ اِلٰٓی اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ فَسَوْفَ یَدْعُوْا ثُبُوْرًا وَّیَصْلٰی سَعِیْرًا

پھر جس کا نامۂ اعمال اُس کے سیدھے ہاتھ میں دیا گیا۔اس سے ہلکا حساب لیا جائے گا۔اور وہ اپنے لوگوں کی طرف خوش خوش پلٹے گا۔رہا وہ شخص جس کا نامۂ اعمال اس کی پیٹھ پیچھے دیا جائے گا تو وہ موت کو پکارے گا اور بھڑکتی ہوئی آگ میں جا پڑے گا۔ (سورۃ الانشقاق:۷-۱۲)

یَوْمَ یَجْمَعُکُمْ لِیَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِکَ یَوْمُ التَّغَابُنِ وَمَنْ یُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَیَعْمَلْ صَالِحًا یُّکَفِّرْ عَنْهُ سَیِّاٰتِهٖ وَیُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَکَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ

(اس کا پتا تمہیں اس روز چل جائے گا) جب اجتماع کے دن وہ تم سب کو اکٹھا کرے گا وہ دن ہوگا ایک دوسرے کے مقابلے میں لوگوں کی ہار جیت کا جو اللہ پر ایمان لایا ہے اور نیک عمل کرتا ہے، اللہ اس کے گناہ جھاڑ دے گا اور اسے ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی یہ لوگ ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے یہ بڑی کامیابی ہے اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے اور ہماری آیات کو جھٹلایا ہے وہ دوزخ کے باشندے ہوں گے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور وہ بدترین ٹھکانا ہے۔

(سورۃ التغابن:۹-۱۰)

کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَکُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ

آخر کار ہر شخص کو مرنا ہے اور تم سب اپنے اپنے پورے اجر قیامت کے روز پانے والے ہو کامیاب دراصل وہ ہے جو وہاں آتش دوزخ سے بچ جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے رہی یہ دنیا، تو یہ محض

ایک ظاہر فریب چیز ہے۔ (سورۃ آل عمران:۱۸۵)

گویا قرآن سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ جس طرح ہر انسان کا اکتسابی جائزہ لیا جا رہا ہے اور اس کی بنیاد پر کامیابی کا فیصلہ ہوگا۔ اسی طرح استاد کو چاہیے کہ ہر طالب علم کا مناسب وقفے پہ امتحان/ٹیسٹ لے اس کا پورا ریکارڈ رکھے اس کا کچا چٹھا (پروفائل) تیار کرے اور پھر اُس کے فیل یا پاس ہونے کا فیصلہ کرے۔ بغیر جانچ پرکھ اور جائزے کے ہر طالب علم کو کامیاب قرار دے دینا اور بغیر امتحان لیے اگلی جماعت میں ترقی دے دینے کی پالیسی مفید اور مناسب نہیں سمجھی جاتی۔

۲۸۔ ترغیب وترہیب

مؤثر تدریس میں جزا اور سزا، ترغیبات، ستائش اور محاسبہ وغیرہ کا بہت اہم رول ہوتا ہے۔ ماہرینِ تعلیم کے مطابق محبت، اُنسیت اور ترغیب وستائش نہ صرف طلبہ بلکہ ہر انسان کی بنیادی ضرورتوں میں سے ایک اہم ضرورت ہے۔ اس کے برعکس نافرمان اور غیر ذمہ دار طلبہ کے لیے سرزنش اور محاسبہ کا ہونا بھی اُن کی اپنی بہتری کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ محنتی اور ذمّہ دار اور نافرمان، غیر ذمّہ دار اور غفلت اور کاہلی کے شکار بچوں سے یکساں سلوک کرنا مؤثر تدریس کے اصولوں کی خلاف ورزی ہے۔ قرآن میں جزا اور سزا کی اہمیت اور ضرورت کے پیشِ نظر متعدد مقامات پر اس کا ذکر نمایاں ہے۔

لَا یَسْتَوِیٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ

دوزخ میں جانے والے اور جنت میں جانے والے کبھی یکساں نہیں ہو سکتے جنت میں جانے والے ہی اصل میں کامیاب ہیں۔ (سورۃ الحشر:۲۰)

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ یَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَیَقْبِضُوْنَ اَیْدِیَهُمْ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِیَهُمْ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِیْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا هِیَ حَسْبُهُمْ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ

منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک دوسرے کے ہم رنگ ہیں برائی کا حکم دیتے ہیں اور بھلائی سے منع کرتے ہیں اور اپنے ہاتھ خیر سے روکے رکھتے ہیں یہ اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے بھی انہیں بھلا دیا یقیناً

یہ منافق ہی فاسق ہیں ان منافق مردوں اور عورتوں اور کافروں کے لیے اللہ نے آتش دوزخ کا وعدہ کیا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، وہی ان کے لیے موزوں ہے ان پر اللہ کی پھٹکار ہے اور ان کے لیے قائم رہنے والا عذاب ہے۔ (سورۃ التوبۃ: ۶۷-۶۸)

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ

مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی رحمت نازل ہو کر رہے گی، یقیناً اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے ان مومن مردوں اور عورتوں سے اللہ کا وعدہ ہے کہ انہیں ایسے باغ دے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے ان سدا بہار باغوں میں ان کے لیے پاکیزہ قیام گاہیں ہوں گی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ کی خوشنودی انہیں حاصل ہوگی یہی بڑی کامیابی ہے۔ (سورۃ التوبۃ: ۷۱-۷۲)

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ فِيْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى وَلَهُمْ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ

پرہیزگاروں کے لیے جس جنت کا وعدہ کیا گیا ہے اس کی شان تو یہ ہے کہ اس میں نہریں بہہ رہی ہوں گی نتھرے ہوئے پانی کی، نہریں بہہ رہی ہوں گی ایسے دودھ کی جس کے مزے میں ذرا فرق نہ آیا ہو گا، نہریں بہہ رہی ہوں گی ایسی شراب کی جو پینے والوں کے لیے لذیذ ہوگی، نہریں بہہ رہی ہوں گی صاف شفاف شہد کی اُس میں اُن کے لیے ہر طرح کے پھل ہوں گے اور اُن کے رب کی طرف سے بخشش (کیا وہ شخص جس کے حصہ میں یہ جنت آنے والی ہے) اُن لوگوں کی طرح ہو سکتا ہے جو جہنم میں ہمیشہ رہیں گے اور جنہیں ایسا گرم پانی پلایا جائے گا جو ان کی آنتیں تک کاٹ دے گا؟

(سورۃ محمد: ۱۵)

ایک اہم بات یہ ہے کہ جسمانی سزا ہرگز نہ دی جائے، اور نہ ہی طلبہ کو برا بھلا کہا جائے بلکہ محبت سے، شوق دلانے اور ترغیب دینے سے ان کی اصلاح کی کوشش کی جائے۔ طلبہ کے لیے سزا سے زیادہ سزا کو خوف ہی کافی ہونا چاہیے۔

۲۹۔ تلخیص اور پیغامات

مؤثر تدریس کا یہ بھی تقاضا ہے کہ درس، لیکچر، مضمون یا سبق کے آخر میں بیان کردہ چیزوں کا خلاصہ بیان کیا جائے اور اہم چیزوں کی نشاندہی کر کے ضروری نکات کی صورت میں پیغامات دیے جائیں۔ اس سے ایک طرف تو طلبہ کو اہم چیزوں کی طرف متوجہ کیا جا سکتا ہے، دوسری طرف اہم پیغامات اور باتوں کی تلخیص کر کے پیش کرنے سے یاد کرنے اور یاد رکھنے میں آسانی پیدا کی جا سکتی ہے۔

قرآن کی ہر سورۃ اپنی جگہ ایک مکمل اکائی ہے جس کا بالعموم ایک ابتدائیہ، وسطانیہ اور اختتامیہ ہوتا ہے۔ سورۃ کے آخر میں اکثر و بیشتر سورۃ میں بیان کیے گئے مضامین کا خلاصہ پیش کر دیا گیا ہے اور اہم پیغامات دے دیے گئے ہیں تاکہ سمجھنے اور یاد رکھنے میں آسانی رہے۔

قرآن پاک میں تفصیل سے بیان کیے گئے مضامین اور پیغامات کا خلاصہ نہایت خوبصورت، مختصر اور حکیمانہ انداز میں سورہ فاتحہ کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ ابن قیم کے نزدیک سورۃ فاتحہ پورے قرآن کا خلاصہ ہے جبکہ آیت اِيَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاکَ نَسْتَعِيْنُ سورۃ فاتحہ کا خلاصہ ہے۔ اس حوالے سے پورے قرآن کا ایک آیت کے حوالے سے خلاصہ مذکورہ بالا آیت سمجھی جاتی ہے۔ قرآن میں دیے جانے والے چند اہم پیغامات:

> يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا وَاللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمہارے مال اور تمہاری اولادیں تم کو اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں جو لوگ ایسا کریں وہی خسارے میں رہنے والے ہیں جو رزق ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جائے اور اُس وقت وہ کہے کہ "اے میرے رب، کیوں نہ تو نے مجھے تھوڑی سی مہلت اور دے دی کہ میں صدقہ دیتا اور صالح لوگوں میں شامل ہو جاتا" حالانکہ جب کسی کی مہلت عمل پوری ہونے کا وقت آ جاتا ہے تو اللہ اُس کو ہرگز مزید مہلت نہیں دیتا، اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس سے باخبر ہے۔ (سورۃ المنافقون: ۹-۱۱)

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ

(اے نبیؐ) کہہ دو کہ اے میرے بندو، جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے، وہ تو غفور و رحیم ہے۔ (سورۃ الزمر: ۵۳)

قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ

اے نبیؐ، میرے جو بندے ایمان لائے ہیں اُن سے کہہ دو کہ نماز قائم کریں اور جو کچھ ہم نے اُن کو دیا ہے، اُس میں سے کھلے اور چھپے (راہ خیر میں) خرچ کریں قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوست نوازی ہو سکے گی۔ (سورۃ ابراھیم: ۳۱)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کا ساتھ دو۔ (سورۃ التوبۃ: ۱۱۹)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا

اے ایمان لانے والو، اللہ سے ڈرو اور ٹھیک بات کیا کرو۔ (سورۃ الأحزاب: ۷۰)

معلم/استاد کو چاہیے کہ درس، سبق یا لیکچر وغیرہ کے آخر میں خلاصہ پیش کرے اور اہم پیغامات کی نشاندہی کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ طلبہ سے چیزوں کو مختصر الفاظ میں لکھنے کی مشق کرائے اور اہم پیغامات، نتیجہ یا اخلاقی سبق وغیرہ طلبہ سے اخذ کروائے۔

۳۰۔ رویّوں میں مثبت تبدیلی

تعلیم و تدریس کا ایک بنیادی مقصد طلبہ کی شخصیات کی نشوونما، کردار سازی اور رویّوں میں مثبت تبدیلی لانا ہے۔ اگر یہ مقصد حاصل نہ ہو سکا تو درس و تدریس کی کاوشیں سعی لاحاصل ہیں۔ رویّوں میں مثبت تبدیلی لانے کے لیے تعلیم، تربیت اور تزکیہ ہر تینوں پہ توجہ دینا ضروری ہے۔ صرف معلومات دینے سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے جہاں اُستاد کو عملی نمونہ بننا ہوگا وہاں تربیت کا ایک مکمل نظام تشکیل دینا بھی ضروری ہے۔ انبیا کی بعثت اور اُن کی زندگیوں (اُسوہ حسنہ) کو بطور عملی نمونہ پیش کرنے، الہامی کتابوں کے نزول اور رشد و ہدایت اور تعلیم و تدریس کے لیے اختیار کیے گئے مختلف ذرائع اور وسائل کا ایک بنیادی مقصد انسان کے رویّوں اور اقدار میں مثبت تبدیلی لانا اور ہدایت کی طرف راہنمائی کرنا تھا۔ قرآن کی تعلیمات کے مطابق صرف یہ کہہ دینا کہ میں ایمان لایا کافی نہیں۔ اس کے لیے پوری زندگی کو نبی ﷺ کے اُسوہ حسنہ کے مطابق ڈھالنا ضروری ہوگا۔

خرد نے کہہ بھی دیا لاالہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

درج ذیل قرآنی آیات کچھ ایسا ہی پیغام دے رہی ہیں:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَالۡكِتٰبِ الَّذِىۡ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوۡلِهٖ وَالۡكِتٰبِ الَّذِىۡۤ اَنۡزَلَ مِنۡ قَبۡلُ ؕ وَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓـئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلاًۢ بَعِيۡدًا

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کی ہے اور ہر اُس کتاب پر جو اس سے پہلے وہ نازل کر چکا ہے جس نے اللہ اور اس کے ملائکہ اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور روز آخرت سے کفر کیا وہ گمراہی میں بھٹک کر بہت دور نکل گیا۔ (سورۃ النساء:۱۳۶)

قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا وَلٰـكِنۡ قُوۡلُوۡۤا اَسۡلَمۡنَا وَلَمَّا يَدۡخُلِ الۡاِيۡمَانُ فِىۡ

قُلُوۡبِکُمۡ وَاِنۡ تُطِیۡعُوا اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ لَا یَلِتۡکُمۡ مِّنۡ اَعۡمَالِکُمۡ شَیۡئًا اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ

یہ بدوی کہتے ہیں کہ ''ہم ایمان لائے'' اِن سے کہو، تم ایمان نہیں لائے، بلکہ یوں کہو کہ ''ہم مطیع ہو گئے'' ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے اگر تم اللہ اوراس کے رسول کی فرماں برداری اختیار کرلو تو وہ تمہارے اعمال کے اجر میں کوئی کمی نہ کرے گا، یقیناً اللہ بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔ (سورۃ الحجرات:۱۴)

تعلیمی اداروں اوراساتذہ کو چاہیے کہ وہ اس بات کو یقینی بنائیں کہ تعلیم وتدریس، تربیت اور تزکیہ کے ذریعے طلبہ وطالبات کے رویّوں اوراقدار میں مثبت تبدیلی لائی جائے۔ ہر طالبِ علم کی شخصیت کی اعلیٰ وارفع خطوط پر نشوونما کی جائے۔ ان کی مضبوط بنیادوں پر کردار سازی کی جائے۔

☆☆☆

تصورِ علم و تعلیم

پروفیسر خورشید احمد

معلم اور متعلم کا رشتہ محض کسی کتاب کی تدریس و تعلیم تک محدود سمجھنا درست نہ ہوگا۔ علم اور تعلیم کا ایک جامع اور واضح تصور اساتذہ کے ذہن میں موجود ہونا چاہیے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے تصورِ علم و تعلیم پر پروفیسر خورشید احمد صاحب نے انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد میں دینی مدارس کے ذمہ داران کی ایک تربیتی ورک شاپ میں خطاب کیا، جو دراصل اس کتاب کی تیاری کی اسکیم کا حصہ ہی تھا۔ اس علمی خطبے کی اہمیت کے پیش نظر اسے معمولی ادارت کے ساتھ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ (مرتب)

اس وقت جس موضوع پر کچھ گزارشات آپ کے سامنے پیش کرنا میرے پیشِ نظر ہے، ہوسکتا ہے کہ اُس میں آپ کے لیے کوئی نئی بات نہ ہو کیونکہ ماشاء اللہ آپ خود اصحابِ علم ہیں۔ تاہم میری کوشش یہ ہوگی ہم یہ جانیں کہ فی زمانہ علم اور تعلیم کے بارے میں ہمارا تصور کیا ہونا چاہیے؟ ہمیں اس سے کیا حاصل کرنا چاہیے اور اس فیض کو عام کرنے کے لیے کس چیز کی ضرورت ہے؟

علم کے کردار اور اہمیت کو سمجھنے کے لیے میری نگاہ میں ذہن میں تازہ کرنے کے لائق سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہمارا مقام اس دنیا میں کیا ہے؟ اس مقام کی نوعیت سے ہی ہمیں معلوم ہوگا کہ ہمیں کس قسم کی صلاحیت کی ضرورت ہے، کون سی استعداد ہمیں پیدا کرنی ہے اور کس طرح ہم اس مقصد کو حاصل اور اس کردار کو ادا کر سکتے ہیں؟

اللہ تعالیٰ نے جب تخلیقِ آدمؑ کا ارادہ فرمایا اور اپنے اس ارادے کا اظہار فرشتوں کے سامنے کیا تو جو کام، ذمہ داری، اور کردار آدمؑ اور اولادِ آدمؑ کو اللہ تعالیٰ نے سونپا وہ استخلاف ہے:

اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَۃً

میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔(البقرۃ:۳۰)

خلیفہ وہ ہوتا ہے جو اپنے آقا اور مالک کے دیے ہوئے مشن کو اس کی نیابت میں، اس کے دیے ہوئے اختیار اور امکان کے ذریعے پورا کرنے کی جدوجہد کرے، اور وہ اُسی کے سامنے جوابدہ ہو۔ غور فرمایئے کہ یہ فرمان سن کر فرشتوں نے فوراً اس خدشہ کا اظہار کیا تھا کہ جس مخلوق کو یہ مقام دیا جارہا ہے، وہ فساد کی جانب مائل ہوگا۔ اس خدشہ کی وجہ یہ تھی کہ استخلاف آزادی، عقل، اختیار، خیر اور شر میں تمیز کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اور جب کسی کو اختیار دیا جائے گا تو اس اختیار کے منفی استعمال کا امکان بہر حال موجود رہتا ہے جو فساد کا باعث بنتا ہے۔ لیکن اللہ حکیم وعلیم نے فرمایا کہ نہیں، یہ صرف ایک پہلو ہے، میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ یعنی میں جانتا ہوں کہ میرا مقصد کیا ہے، اسے کیا کام انجام دینا ہے اور کیا صلاحیتیں اور اختیارات میں اسے دینے والا ہوں۔ اس موقع پر دو چیزیں ایسی ہیں جو سب سے پہلے ہمارے مالک نے حضرت آدمؑ کو یعنی ہمیں دیں: پہلی علم الاشیاء اور دوسری ہدایت۔

علم الاشیاء کیا ہے؟ علم الاشیاء وہ علم، صلاحیت، عقل، شعور اور وجدان کی وہ استعداد جس کے ذریعے اشیاء کی حقیقت کو سمجھا جاسکے۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّهَا

اور اللہ نے آدمؑ کو ساری چیزوں کے نام سکھائے۔(البقرۃ:۳۱)

اسم صرف نام نہیں، اسم نمائندہ ہے کسی شئے کی حقیقت کا- اور یہی چیز علم ہے۔ علم کی جو بہترین تعریف علماء نے کی وہ یہ ہے کہ شئے کی حقیقت کو جاننا۔ یعنی علم الاشیاء عطا فرمانے کا مطلب دراصل اشیاء کی حقیقت کو جاننے کا شعور اور صلاحیت دینا ہے۔ اس سے مراد انسان میں وہ استعداد رکھ دینا ہے جس سے ہم اس حقیقت کا ادراک کرسکتے ہیں۔ اس استعداد کے ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ خیر اور شر، حق اور باطل، اچھائی اور برائی، مطلوب اور نامطلوب، محمود اور مذموم کی پہچان اور تمیز بھی عطا کی جائے۔ یہ معیار واضح طور پر ہمیں دیا گیا اور ابتدائے تخلیق کے ساتھ ہی یہ بتادیا گیا کہ:

فَاِمَّا یَاْ تِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی فَمَنْ تَبِعَ ھُدَایَ فَلاَ خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلاَھُمْ یَحْزَنُوْنَ

پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمھارے پاس پہنچے، تو جو لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے، ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا۔ (البقرۃ:۳۸)

تو گویا علم الاشیاء اور ہدایت یہ دو چیزیں ہیں جو اس زمین پر انسان کے سفر کے آغاز ہی میں اسے دی گئیں۔ اور یہی وہ دو چیزیں ہیں جو اُس کو اللہ کے نمائندے اور خلیفہ کے کردار کو ادا کرنے کے لائق بناتی ہیں۔

اب یہ دیکھیے کہ ہمیں جو علم درکار ہے اس کی طرف کتنے پیارے انداز میں اُن اولین آیات میں رہنمائی فرمائی گئی جن سے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آغاز ہوا:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ. خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ. اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ. الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ. عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ.

پڑھو (اے نبی) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔ جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا۔ انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔ (العلق:۱-۵)

اس میں پہلی حقیقت ہمیں یہ سمجھائی گئی کہ علم کا منبع اور مرکز (source) اللہ تعالیٰ ہے۔ اور اسی نے ہمیں وہ علم دیا ہے جس سے ہم آگاہ نہیں تھے۔ یہ اُس کی عنایت ہے، یہ اُس کی رحمت ہے اور یہ اُس کی حکمت ہے۔ اس لیے کہ استخلاف کی ذمہ داری اُس وقت تک ادا نہیں ہوسکتی جب تک انسان کو اس حوالے سے درکار علم نہ دیا جائے۔ لیکن ابتدا ہی میں اس بات کو واضح کر دیا گیا کہ یہ علم کس ہستی کی دَین ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ یہ علم محض ایک فرد تک محدود ذہنی کیفیت و معرفت کا نام نہیں ہے۔ لیکن فرمایا گیا کہ یہ علم صرف تمھارے لیے نہیں ہے بلکہ یہ پہنچانے کے لیے ہے: (اقرأ) صرف جاننا ہی نہیں بلکہ اِس جاننے کا اقرار اور اظہار کرنا بھی ہے۔ گویا علم کے لیے دو پہلو ہمارے سامنے آگئے ہیں: ایک حقیقت کو جاننا اور دوسرا جو جانا ہے اُس کو پہنچانا۔

یَآ یُّھَاالرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ
اے پیغمبر، جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دو۔
(المائدہ:٦٧)

یوں اِبلاغ بھی دراصل علم کا لازمی پہلو ہے۔

تو پہلی بات یہ معلوم ہوئی کہ علم کا منبع اللہ تعالیٰ ہے۔ دوسری یہ کہ وہ علم جو دیا گیا ہمیں اشیاء کو سمجھنے کی صلاحیت دیتا ہے۔ تیسری چیز یہ معلوم ہوئی کہ جو علم ہمیں دیا گیا ہے ہم اُس پر سانپ بن کر نہیں بیٹھیں گے بلکہ اسے آگے پھیلائیں گے۔

اس کے بعد سمجھنے کی بات یہ ہے کہ دنیاوی اعتبار سے تین میدان ایسے ہیں جن میں ہمیں کارفرما ہونا ہے۔ اور یہ تین میدان حقیقت میں علم کی تین اہم جہتیں ہیں۔ ایک جہت ہے یہ کائنات، اس کا قطعی وجود، اس کے وسائل، اس میں پوشیدہ دولت، وسائل، امکانات۔ فرمایا: اِقْـرَاْ بِـاسْـمِ رَبِّکَ الَّـذِیْ خَـلَقَ ۔ یہ عالمِ خلق، یہ پوری کائنات اور انسان سمیت جو کچھ اس کے اندر ہے۔ خلق کا لفظ اس پوری طبعی دنیا کا احاطہ کر لیتا ہے۔ یعنی عمل کا پہلا میدان جس میں ہمیں اپنے علم کو کام میں لانا ہے وہ یہ فزیکل ورلڈ ہے۔ دوسری جہت انسان ہے یعنی نفسِ انسانی۔ انفس اور آفاق باہم منسلک ہیں۔ اسی کا تذکرہ اس وحی میں یوں ہے: خَـلَـقَ الْاِنْـسَـانَ مِنْ عَلَقٍ ۔ یہاں علق کا ذکر اس لیے ہے کہ جسمانی اور مادی وجود یا فزیکل ورلڈ کے ساتھ ساتھ جو دوسری دنیا ہے، یعنی بیالوجیکل ورلڈ، یا حیاتیاتی دنیا، جس میں انسان اور تمام جاندار شامل ہیں، یہ بھی علم کی ایک جہت ہے۔ اور علم کی تیسری جہت اور عالم یہ ہے کہ انسان اپنی صلاحیتوں، استعداد اور عقل کو طبعی اور حیاتیاتی دنیا سے حاصل شدہ وسائل کے ساتھ ملا کر کچھ نئی چیز بناتا ہے۔ اس کے لیے آپ دیکھیے کہ فرمایا: عَـلَّـمَ بِالْقَلَمِ ۔ لفظ قلم کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تو تحریر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ جو قراءۃ اور ابلاغ کا ذریعہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ قلم مظہر ہے وسائل یعنی ٹیکنالوجی کا، انسان کی کوششوں کے حاصلات کا، کہ کس طرح وہ ایک خام چیز کو ترقی دے کر آگے بڑھنے کا ذریعہ بناتا ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس سے دنیا میں

ساری ترقیاں واقع ہوتی ہیں۔تہذیب وتمدن کے تمام مظاہر کا وجود اسی عمل سے ہے۔تو پھر جان لیجیے کہ یہی تین چیزیں یعنی ـــــــ طبعی دنیا، حیاتیاتی دنیا اور ٹیکنالوجی ـــــــ استخلاف کی ذمہ داری ادا کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ یہ تینوں علم کی مختلف جہتوں اور دائروں کی نشاندہی کرتی ہیں۔لیکن اسلام کی منفرد خصوصیت اور امتیاز یہ ہے کہ دیگر اقوام نے محدود نظری سے کام لیا ہے۔کسی نے طبعی دنیا پر انحصار کیا ہے، کسی نے حیاتیاتی دنیا پر کیا ہے اور کسی نے ٹیکنالوجی پر کیا ہے، کسی نے ان تینوں پر کیا ہے۔لیکن جو اصل منبع اور مرکز ومحور ہے اُسے وہ بھول گئے۔ وہ ہے اللہ کی ذات اور اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا علم، رہنمائی، ہدایت۔ اگر یہ تینوں جہاتِ علم اُس مرکزیت کے ساتھ ہوں تو یہ علم اور کے لیے اور اس کے تحت کی گئی ہر کوشش اسلام کے تصور کے مطابق ہوگی، اور اگر اُس مرکزیت سے ٹوٹ جائیں، علم پھر بھی رہتا ہے، اُس کے اثرات پھر بھی نکلیں گے، وسائل بھی ملیں گے لیکن وہ پھر اسلام کے تصور سے دور اور فائدے میں کم تر ہو جائے گا۔

آپ غور فرمائیں کہ یہ کیسا انقلابی، جامع اور روشن تصورِ علم ہے جو ہمیں دیا گیا ہے۔اور یہی وہ علم ہے جسے نور، رحمت اور حکمت کہا گیا ہے۔ یہ سارے پہلو اُسی علم کے اندر ہیں اور صرف اسلام ہی کا تصورِ علم ان تمام پہلوؤں کا جامع ہے۔

اب میں مختصراً اُن پہلوؤں کی طرف اشارہ کروں گا جو میری نگاہ میں اسلام کے تصورِ علم کے مختلف رُخوں کو واضح کرتے ہیں۔ اس ضمن میں پہلی نمایاں چیز یہ ہے کہ اسلام میں علم کی بنیاد حق اور یقین پر ہے۔مغربی دنیا اور خصوصیت سے قدیم یونان یا جدید یورپ کو دیکھیں تو آپ یہ پائیں گے کہ اُن کے ہاں علم کا آغاز شک سے ہوتا ہے۔ بلاشبہ سوال، استفہام، جستجو حصولِ علم کا ایک حصہ ہے۔لیکن یہ اسلام کا امتیاز ہے کہ اس نے مستحکم بنیاد کے ساتھ علم انسان کو دیا۔محض ٹامک ٹوئیاں مارنے کے لیے اور اندھیروں میں گھومنے پھرنے کے لیے نہیں۔ بلکہ یہاں علم کا آغاز روشنی سے، نور سے، ہدایت سے اور یقین سے ہوتا ہے۔اور اس یقین کے بعد پھر پورا میدان تجربے کا، دریافت کا، جستجو کا، ایجاد کا،

اختراع کا، نئی سوچ کا ہمیں دیا۔لیکن ان سب علمی کاوشوں کے لیے مضبوط بنیاد فراہم کردی۔تو دراصل حق ،صداقت ،اسلام کے تصورِ علم کی پہلی بنیاد ہے۔اسی طرف اقبال نے بھی اشارہ کیا ہے جہاں اُس نے کہا کہ ؎

سبق پھر پڑھ صداقت کا ،عدالت کا ،شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

تو پہلی چیز صداقت ہے، یعنی مبنی برحق ہونا۔اور یہی وجہ ہے کہ ایمان اور یقین ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔زبان سے اقرار اور دل سے اُس کی تصدیق۔تو ہم کسی شک کی بنیاد پر نہیں کھڑے ہیں بلکہ ہم تو بڑی مضبوط بنیاد پر ہیں۔اور یہی چیز اسلام کو منفرد کرتی ہے باقی تمام علوم سے، اور علوم کے باقی تمام پیراڈائم یا مثالیوں سے۔تو اس لیے پہلی چیز حقانیت ہے۔

حقانیت کے بعد میری نگاہ میں دوسری چیز کلیت ہے۔دنیا کی تاریخ کا مطالعہ کیجیے، تہذیبوں کو پڑھیے، مذاہب کو دیکھیے۔ انسانوں نے زندگی کو خانوں میں بانٹ دیا ہے اور پھر تخصص (specialization) کے نام پر ایک ہی خانے کو کل سمجھ کر ہر مسئلے کا حل اس میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور نتیجتاً ٹھوکریں کھائی ہیں۔اور ایسا اس لیے ہوا ہے کہ انسان، انسانی زندگی، تہذیب و تمدن اور اس کے سارے پہلو، یعنی روحانی اور مادی، انفرادی اور اجتماعی، خاندانی اور معاشرتی، سیاسی اور معاشی، ملکی اور بین الاقوامی وغیرہ، یہ تمام ایک ہی کُل کے مختلف پہلو ہیں۔ان کو خانوں میں بانٹ دینا اور ان میں سے کسی ایک کو لے کر کُل سمجھ لینا، یہ وجہ ہے بگاڑ کی اور خامی کی۔اس کے مقابلے میں یہ تصور کہ زندگی کے تمام پہلو ایک ہی روشنی، ایک ہی بنیاد رکھتے ہیں، سب کا خالق اللہ ہے، سب کو اُسی کی طرف جانا ہے، اور اسی بنیاد پر زندگی کو آپ خانوں میں بانٹ نہیں سکتے، اس جامع سوچ کو جنم دیتا ہے جو انسانی مسائل اور الجھنوں کے حل کے لیے درکار ہے۔اسی کلیت کا تقاضہ کرتے ہوئے اللہ نے فرمایا:

اُدۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ کَآفَّۃً وَّلَا تَتَّبِعُوۡا خُطُوٰتِ الشَّیۡطٰنِ

تم پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ (البقرۃ:۲۰۸)

گویا کلیت اور جامعیت اسلام کے تصورِعلم کا امتیاز ہے کہ اس نے ہر پہلو کو اس میں شامل کیا ہے۔لیکن جب ہم نے علم کو خانوں کے اندر بانٹ دیا، کچھ کو ہم لے کر بیٹھ گئے اور کچھ کو دوسروں کے لیے چھوڑ دیا، تو ہم پر بھی وہی کچھ گزری جو دوسری رو بہ زوال اقوام پر گزری تھی۔ ہمارے پاس علم کی ایک ہی کھلی شاہراہ ہے اور ایک ہی منبعِ نور سے زندگی کے سارے میدانوں کے لیے اس طرح روشنی حاصل کرنی ہے کہ ہر پہلو کے تقاضے پورے ہو جائیں اور علم وعمل کی کوئی بھی شاخ اصل سے نہ کٹے۔ یہ ہے علم کی کلیت اور جامعیت۔

اسلام کے تصورعلم میں تیسری اہم چیز نافعیت ہے، اور یہ وہ چیز ہے جس کی طلب ہمیں خود معلمِ کامل صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھائی:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَسۡئَلُکَ عِلۡماً نَّافِعاً

اے اللہ میں تجھ سے نفع دینے والے علم کا سوال کرتا ہوں۔(سنن ابن ماجہ)

علمِ غیر نافع سے پناہ مانگی گئی ہے۔گویا علم خیر بھی ہوسکتا ہے اور شر بھی۔علم کے ذریعے حاصل شدہ وسائل، سوچ، معلومات، مہارت اور ٹیکنالوجی کو اچھائی اور برائی دونوں کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے:

فَاَلۡھَمَھَا فُجُوۡرَھَا وَ تَقۡوٰھَا. قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَکّٰھَا. وَقَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰھَا.

پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کردی۔ یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہُوا وہ جس نے اس کو دبادیا۔(الشمس:۸-۱۰)

تو معلوم ہوا کہ یہ فرق ہمیں کرنا پڑے گا کہ کیا علم نافع ہے اور کیا علم غیر نافع ہے اور کس طرح علم غیر نافع سے اجتناب اور علم نافع کے ذریعے سے اپنی زندگی کی تعمیر کرنی ہے۔تو نافعیت میری نگاہ میں اسلام

کے تصورِ علم کا تیسرا بڑا اہم پہلو ہے۔

چوتھا پہلو اس کی حرکیت ہے۔ ایک طرف مضبوط بنیاد، یقین، ابدی ہدایت اور وہ اقدار ہمیں دے دی گئی ہیں، وہ ایمانیات اور وہ حقائق ہمیں بتا دیے گئے ہیں جو محکمات ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ زندگی میں تغیر آتا ہے، زمانہ بدلتا ہے۔ تاریخ کے جو قدم آگے بڑھتے ہیں، ٹیکنالوجی میں جو بھی فتوحات اور کامیابیاں حاصل ہوتی ہیں، تمدن میں جتنی بھی گہرائی اور وسعت پیدا ہوتی ہے، باریکی اور پیچیدگی آتی ہے، ان سب کے ساتھ وسائل و معاملات میں ترمیم بہت اہم ہے۔ اس ضمن میں ایک طرف اپنی بنیاد سے جُڑے رہنا، اصول اور اقدار کے معاملے میں یکسوئی اور یک رنگی ضروری ہے، لیکن دوسری طرف نئے حالات اور نئے مسائل کا ادراک بھی ضروری ہے۔ اسی طرح دنیا کی دوسری قوموں سے مسابقت بھی ایک مسلسل اور لازمی عمل ہے۔ اور اُس مسابقت میں بھی ہماری سوچ اور کوشش مثبت اور نفع رساں ہونی چاہیے: سَابِقُوْا فِی الْخَیْرَاتِ۔ حرکیت ہی وہ خوبی ہے جس کی طرف حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ والی مشہور حدیثِ مبارکہ (سنن الترمذی) میں رہنمائی دی گئی ہے کہ جو مسائل پیش آئیں، ان کا حل اولاً قرآن اور پھر سنتِ نبوی ﷺ میں تلاش کیا جائے۔ وہاں اگر حکم موجود ہے، تو بلاتردد اُس پر عمل کیا جائے۔ وہاں اگر بظاہر حکم موجود نہیں ہے تو شریعت کا منشا جاننے کی کوشش کی جائے اور اصولوں کو دیکھ کر فیصلہ کیا جائے۔ اسی رہنمائی کی روشنی میں ہمارے بزرگوں نے اصولِ استنباط مرتب کیے ہیں۔ یہی وہ اصول ہیں جن کی روشنی میں ماہرین اجتہاد کر سکتے ہیں۔ اجتہاد بگٹٹ آزادی کا نام نہیں۔ اجتہاد نام ہے دین کے عطا کردہ فریم ورک کے اندر آگے بڑھنے کا اور یہی وہ مشق ہے جو اسلام کو حرکیت عطا کرتی ہے۔ قرآنِ پاک میں کئی ایسے مظاہر کا تذکرہ ہے جنھیں اُس دور کے اہلِ علم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، اور آج چودہ سو سال کے بعد غیر مسلم سائنسدان بھی ایسے ہیں جو حالیہ تحقیق کی بنیاد پر قرآن کی صداقت کی گواہی دیتے ہیں۔

جو علم اللہ تعالیٰ نے دیا اُس میں جو کچھ ہے وہ مبنی بر حق ہے۔ تاہم متعدد ایسے امور ہیں جن کے حوالے سے انسان کا علم اس حد تک نہیں پہنچ سکا کہ ان کے حقیقی مفہوم سے آگاہ ہو سکے۔ لیکن وہ معلوم

کر سکتا ہے اور اسے معلوم کرنا چاہیے۔ اُس کے لیے جستجو اور کوشش کے لیے اُبھارا گیا ہے۔ تو علم کے اُفق کو برابر آگے بڑھانا اور اپنے مسائل اور اپنے حالات کی مناسبت سے اُس سے کام لینا علم کی حرکیت کی علامت ہے۔

انبیائے کرام علیہم السلام اور خصوصاً حضورِ اکرم ﷺ کا جو وظیفہ قرآن نے بیان کیا ہے اُس میں صرف تلاوتِ آیات ہی نہیں بلکہ تلاوتِ آیات کے ساتھ تزکیہ نفس بھی ہے، تاکہ انسان کی سوچ پختہ اور نگاہ عبرت انگیز ہو اور اس کا تدبر و تفکر راست ہو۔ پھر تعلیم الکتاب کی تلقین ہے۔ فکری طور پر تعلیم الکتاب تلاوتِ کتاب سے زیادہ اہم ہے۔ اسی کو تبیین کہا گیا ہے۔ یہی سنت کی شکل میں اور حضورؐ کی نصیحت کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ تعلیمِ حکمت بھی مطلوب ہے۔ اور تعلیمِ حکمت نام ہے تعلیم الکتاب سے اگلے قدم کا۔ یعنی کس طرح اُس تعلیم کو اپنے حالات کے اوپر منطبق کیا جائے۔ کلام اور تصور، خواہ اُس کا تعلق جسمانی اور مادی (physical) دنیا سے ہو یا انسانی اور حیاتیاتی دنیا سے ہو، یہ بے شمار علوم صرف اللہ کے حکم کو سمجھنے کا ذریعہ ہیں۔

پانچویں خصوصیت عملیت ہے۔ ایمان اور عملِ صالح ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ علم اور عمل میں ناقابلِ انقطاع رشتہ ہے۔ یہ رشتہ اگر ٹوٹ جائے تو علم ثمر آور نہیں رہتا۔ اور عمل اگر علم پر مبنی نہ ہو تو وہ گمراہی اور خسران کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس طرح عملیت علم ہی کا ایک حصہ ہے اور یہ خصوصیت بھی اسلام کی نگاہ میں لازمی ہے۔

میری نگاہ میں اسلام کے تصورِ علم کی تعبیر میں آخری چیز **مقصدیت** ہے۔ علم محض معلومات جمع کرنے کے لیے نہیں بلکہ معرفتِ الٰہی اور معرفتِ نفس کے لیے ہے۔ علم فلاح اور سعادت، خیر اور شر اور حسنات اور سیئات کو سمجھنے اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے ہے۔ گویا یہ دنیا اور آخرت دونوں کو محیط ہے۔ علم کا مقصد ہی دنیا اور آخرت کو ساتھ ساتھ رکھنا ہے۔ امام غزالی نے اپنی معرکۃ الآراء تصنیف ''احیاء العلوم'' میں سب سے پہلی بحث علم ہی کے بارے میں کی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے علم کی مقصدیت کو ایک جملے میں اس طرح واضح فرمایا ہے: ''اَصْلُ السَّعَادَةِ فِی الدُّنْیَا

وَالْآخِرَةِ هُوَ الْعِلْمُ'' (دنیا اور آخرت کی سعادت کی بنیاد یہی علم ہے)۔

اس ساری بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علم سے سفرِ حیات کا آغاز ہوا ہے۔ اور چونکہ علم منصبِ استخلاف کی ادائیگی کی بنیادی ضرورت ہے اس لیے علم کے لیے درکار استعداد بھی دی گئی ہے اور اس استعداد کے درست استعمال کے لیے رہنمائی بھی دی گئی ہے۔ یوں علم زندگی کو روشن کرنے اور تاریکی کو دور کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ اللہ کی دی ہوئی رہنمائی، جو اُس نے اپنے انبیائے کرام کے ذریعے سے دی ہے، یہ وہ بنیاد ہے جو ہمیں ایک نعمت کے طور پر حاصل ہے۔ اس نعمت کا ادراک، احسان مندی اور اس سے روشنی حاصل کر کے استخلاف کے مقصد اور مشن کو حاصل کرنا ہمارا مطمحِ نظر ہونا چاہیے، جس پر ہماری کامیابی یا ناکامی کا انحصار ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

جہاں تک میں نے مطالعہ کیا ہے، میں پورے عجز کے ساتھ آپ سے یہ بات کہتا ہوں کہ یہ انفرادیت اسلام ہی کو حاصل ہے کہ اُس نے ایک طرف تو علم کو حیاتِ انسانی کا آغاز اور منتہا قرار دیا ہے۔ اور دوسری جانب نبوت اور قیادت کے لیے علم اور جسم، یعنی مادی قوت اور علمی قوت ان دونوں کو ضروری قرار دیا۔ نیز اس تسلسل میں علم کو ہر انسان کے لیے فریضہ قرار دیا۔ بلاشبہ اتنا علم حاصل کرنا تو ہر فرد پر، مرد اور عورت ہر ایک پر، لازمی اور فرض ہے جس سے وہ اللہ کی مرضی سے واقف ہو جائے اور یہ جان لے کہ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے اور انسان کی کامیابی اور ناکامی کے دونوں راستوں کے نشانات کیا ہیں۔ یہ علم تو فرضِ عین ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ تمام علوم جو استخلاف کی ذمہ داریوں کو اجتماعی یا انفرادی طور پر ادا کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ ان کی حیثیت فرض کفایہ کی ہے۔ یعنی معاشرے میں جتنے افراد اس کے لیے ضروری ہیں، وہ یہ علم حاصل کریں۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو سب ذمہ دار ہیں، لیکن اگر یہ ضرورت کچھ افراد کے ذریعے پوری ہو جاتی ہے تو وہ سب کے لیے خیر و برکت کا باعث ہے اور کسی پر بھی اس کی جوابدہی نہیں رہتی۔ امام غزالی نے بھی اور شاہ ولی اللہ نے بھی بڑے اچھے انداز میں اس بات پر بحث کی ہے اور کہا ہے کہ مختلف صنعتیں، مختلف حرفتیں، مختلف کام، یہ سب فرض کفایہ کی حیثیت رکھتے ہیں، اور یہ سب مل کر مسلم معاشرے کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔ تو فرض کا تصور وسیع

اور لچکدار ہے۔اوروں نے علم کی اہمیت ضرور مانی ہے لیکن علم کو جو مقام اسلام نے دیا ہے اُس کی کوئی اور مثال نہیں ہے۔

غالبًا انسانی تاریخ میں یونان اور چین، دو تہذیبیں ایسی ہیں جنہوں نے علم کو بڑی اہمیت دی، لیکن میرے مطالعہ کے مطابق، ان دونوں ہی میں علم کا یہ تصور کہ معاشرے کے ہر فرد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس میں اپنا کردار ادا کرے، موجود نہیں ہے۔ بلکہ علم کسی مخصوص طبقہ میں یا ضرورت کی مناسبت سے مختلف گروہوں میں محصور رہا ہے۔لیکن اسلام نے علم کا حصول معاشرے کے ہر فرد کا فریضہ بنایا۔ یہ تو ہمارے وجود اور ترقی، استخلاف کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے، شہادتِ حق کا کردار ادا کرنے اور دنیا کی قیادت کرنے کے لیے ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم معاشرے میں تعلیم ہر فرد کا حق رہی ہے، اور یہاں معاشرہ اور ریاست دونوں اسے فراہم کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ یہ آج ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے معاشرے میں اب اہلِ علم اس انداز میں اہلِ فضل نہیں رہے جیسا کہ ہماری روایت رہی ہے۔ اسلامی تاریخ کے اولین ادوار میں آزادی، حصولِ علم، تحقیق اور جستجو، حرکیت اور یہ تمام چھے پہلو جن کا میں نے ذکر کیا، یہ سامنے تھے جن کی وجہ سے اسلام کو آمدِ بہار جیسا فروغ حاصل ہوا۔لیکن جیسے جیسے ہم علم کے میدان سے پیچھے ہٹے، ذہنی، معاشی، تہذیبی اعتبارات سے بھی پیچھے رہ گئے۔ اگر آج بھی آپ کو قیادت حاصل ہوسکتی ہے تو وہ علم کے ذریعے سے ہوسکتی ہے۔ بلاشبہ علمی قیادت کے ساتھ جسد یعنی مادی طاقت (physical power) بھی چاہیے، لیکن بنیاد یہی ہے۔

اب میں موضوع کے دوسرے پہلو کی طرف آتا ہوں۔تعلیم نام ہے دراصل اُس نظام کا جس کے ذریعے سے علم کو ان تمام وسعتوں کے ساتھ جس میں معلومات اور مہارت (skills) شامل ہیں ایک نسل دوسری نسل کو منتقل کرتی ہے۔ اور یہ بھی ایک انسانی اور روحانی ضرورت ہے۔ انسانی ضرورت کس طرح ہے؟ اگر عالمِ حیوانات پر نظر ڈالی جائے تو آپ یہ دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے حیوانوں کی

جبلت میں یہ بات رکھ دی کہ اُن کو اپنی بقا کے لیے جو علم اور مہارت چاہیے وہ اُن کو حاصل ہو گئی ہے۔ ایک مرغی کا چوزا انڈے سے جب نکلتا ہے تو پہلا کام یہ کرتا ہے کہ زمین پر چونچ مارتا ہے۔ اس لیے کہ رزق کے حصول کے لیے اُس کی جبلت نے اُس کی رہنمائی کر دی۔ لیکن انسان کے معاملے میں نومولود کو ماں کی گود کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ماں کے دودھ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، لیکن وہ اسے بھی خود نہیں حاصل کر سکتا۔ اسی طرح زندگی و بقا کے لیے جو بھی چیز اُسے مطلوب ہے وہ ماں کی گود، خاندان، معاشرہ، ریاست اور ماحول کی مدد سے اسے حاصل ہوتی ہے اور یہ معاشرے کی ذمہ داری ہے کہ اُسے اس لائق بنائے کہ وہ اپنا کردار ادا کر سکے۔ اور پھر یہ دیکھیے کہ وہ کس طرح اپنا کردار اور اپنی شخصیت حاصل کرتا ہے۔ ماں کی گود اور خاندان سے، مدرسے اور مسجد سے، معاشرے اور معیشت سے اور اردگرد موجود تقریباً ہر انسان کا اس کی شخصیت سازی میں کردار ہوتا ہے۔ یوں تعلیم نام ہے سیکھنے سکھانے کے اُس نظام کا جو گود سے گور تک یا بالفاظِ دیگر مہد سے لحد تک جاری رہتا ہے۔ اسی لیے اسلام میں تعلیم کا تصور کسی خاص وقت یا عمر کے ساتھ محدود نہیں ہے، بلکہ تعلیم کا آغاز شعور کی آنکھ کھولنے سے ہے اور اختتام آنکھ بند کرنے پر ہے۔ خواہ اُس علم کا تعلق گردوپیش سے ہو یا خود انسان کے ظاہر و باطن سے ہو۔ یاد رکھیں کہ یہ بے شمار علوم صرف اللہ کے حکم کو سمجھنے اور انسان سازی کرنے کے لیے ہیں۔

تعلیم کے لیے جہاں کسی ادارے یا انسٹی ٹیوشن کی ضرورت ہو، وہاں اس کا انتظام کرنا، تعلیم کے نظام کا حصہ ہے۔ اس انتظام کے ذریعے سے افراد کی صحیح وقت پر صحیح رہنمائی کی جاتی ہے۔ محض بقا (Survival) کے لیے نہیں بلکہ ترقی اور نئے تجربات کے لیے اور آگے بڑھنے کے لیے بھی یہ تمام پہلو تعلیم کے اس تصور میں شامل ہیں۔ تعلیم دراصل انسان کو انسان بنانا ہے۔ اسی لیے آپ دیکھیے کہ اسلامی تاریخ میں تزکیہ، تربیت، فضل، عمل اور حکمت کی بہت اہمیت رہی ہے۔ اور جہاں تک مجھے یاد ہے، علم اور اس کے متعلقات کا ذکر قرآنِ پاک میں سات سو سے زائد مقامات پر آیا ہے۔ اس طرح علم زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتا ہے۔ چنانچہ تعلیم کا ایک وہ نظام ضروری ہے جس میں ہر بچے کو، اور ہر نئی نسل کو اس لائق بنایا جائے کہ وہ آگے بڑھے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ تعلیم کا عمل آخری سانس تک

جاری رہنے کا عمل بھی موجود ہو۔ البتہ ہر مرحلے میں وہ انتظام درکار نہیں ہے، انتظام وہ ہونا چاہیے جس کی ضرورت آپ کو عمر کے اُس خاص مرحلے میں ہو۔

بنیادی بات یہ ہے کہ تعلیمی نظام کا مقصد طالب علم میں تین چیزیں پیدا کرنا ہے:

پہلی ہے معلومات، علوم کو منتقل کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے حیوانوں کو اُن کی ترقی کے لیے درکار چیزیں جبلت کے ذریعے دے دی ہیں۔ لیکن انسانی دنیا میں کچھ چیزیں جبلت کے ذریعے ملی ہیں، اور باقی چیزیں تعلیم وتربیت کے ذریعے ملتی ہیں اور پھر وہ انسانی شخصیت کا حصہ بنتی ہیں۔ یہ شخصیت سازی اور تزکیہ تعلیم کا کام ہے۔ ماضی میں جو کچھ بنی نوع انسان نے حاصل کیا ہے یا سیکھا ہے وہ اُسے ازخود اپنے تجربات سے سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ انگریزی میں ایک محاورہ ہے کہ re-inventing the wheel، یعنی پہیے کو دوبارہ ایجاد کرنا۔ یا اُردو میں کہتے ہیں 'تحصیلِ حاصل'۔ یعنی وہ چیز حاصل کرنا جو پہلے ہی حاصل ہے۔ یعنی پہیّہ تو ایجاد ہو چکا ہے، اور اس کے استعمالات میں بہت تنوع آ چکا ہے۔ یہ علم آج کے بچے تک پہنچ جائے تاکہ وہ اس علم کو مزید ترقی دے کر اور آگے بڑھائے معلومات یا علم پہنچانے کا مقصد یہی ہے کہ جو کچھ انسان نے آج تک حاصل کیا ہے اُسے آگے بڑھا کر نئی نسل میں منتقل کرنا ہے۔

معلومات کی فراہمی کے بعد دوسری چیز انسان میں مہارت، استعداد اور ایسی صلاحیت کو پروان چڑھانا ہے جس سے وہ خود آگے بڑھ سکے۔ تعلیم کا وہ نظام جو محض نقل پر مبنی ہو، جو عقل کے استعمال کا موقع نہ دیتا ہو، جو جستجو اور تجسس اور ادراک اور اختراع کے لیے آپ کو آمادہ نہ کرتا ہو، وہ ترقی کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ اس لیے مسئلہ صرف علم دینے کا نہیں ہے بلکہ استعداد بھی پیدا کرنا ہے۔ چینیوں کی بڑی پیاری مثل ہے کہ اگر تم ایک شخص کو ایک وقت کی خوراک دینا چاہتے ہو تو اُسے مچھلی کھانے کو دے دو، لیکن اگر تم چاہتے ہو کہ وہ زندگی بھر اپنی ضروریات پوری کرتا رہے، تو اُسے مچھلی پکڑنا سکھا دو۔

If you want to feed a person once, give him fish; but if you want to feed him forever, teach him fishing.

چنانچہ تعلیم کا دوسرا مقصد استعداد پیدا کرنا ہے۔اسی لیے جستجو اور اختراع اور ایجاد ضروری ہے۔ جمود اور تقلید ذہن پر زنگ کا کام کرتے ہیں۔ اگر رٹ کر اور محض یاد کر کے چیزوں کو آگے بڑھایا جاتا ہے تو اُس سے عقل کو جِلا حاصل نہیں ہوتی۔تو علم کے ساتھ ساتھ استعداد بھی تعلیم کے عمل کا حصہ ہے۔

تیسری چیز ہے کردار اور اخلاق۔علوم کی منتقلی اور استعداد سے کردار اور اخلاق تشکیل پاتے ہیں، تب اسلام کا تعلیمی نظام بنتا ہے، درحقیقت اسلام کے تعلیمی نظام میں ہر دور میں بیک وقت ان تینوں کا خیال رکھا گیا ہے۔انسان کو روزی بھی کمانی ہے، گھر بھی پالنا ہے، بال بچوں کی خدمت بھی کرنی ہے، ملکی ضروریات کو بھی پورا کرنا ہے۔ بلاشبہ یہ ساری صلاحیتیں، استعداد تعلیمی نظام کے ذریعے طلبہ میں پیدا ہونی چاہییں۔ یہ سب کس لیے ہوں، کن مقاصد کے لیے اور کن اقدار کی روشنی میں ہوں؟ یہ بھی تعلیمی عمل سے وابستہ اساتذہ اور مہتممین کو دیکھنا ہے۔اور ساتھ ساتھ ڈسپلن یعنی اپنی صلاحیتوں کو ٹھیک سے استعمال کرنا، خیر اور شر میں تمیز بھی ضروری ہیں۔

یہ تینوں چیزیں ایک ساتھ جب انسان میں پیدا ہوں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ اسلام کا مطلوبہ نظامِ تعلیم ہے۔

آج ہمارا المیہ یہ ہے کہ یہ سب چیزیں منتشر ہوگئی ہیں۔اسکولوں اور کالجوں میں دی جانے والی سیکولر تعلیم کا مقصد صرف استعداد پیدا کرنا اور روزگار کے لیے اہل بنا دینا رہ گیا ہے۔دینی تعلیم کے نظام میں صرف دینی تعلیم دی گئی ہے لیکن ساتھ ساتھ جس قسم کا کردار اُسے آج معاشرہ سازی اور تاریخ سازی میں ادا کرنا چاہیے، وہ استعداد بالعموم نہیں پیدا کی جارہی۔ جہاں کہیں اس کی کوئی فکر موجود ہے اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے، لیکن یہ جس انداز اور مقدار میں ہونی چاہیے وہ نہیں ہے۔ پاکستان میں تو ظلم یہ ہے کہ اب ایک نہیں متوازی طور پر تین تین نظام ہائے تعلیم یہاں کام کررہے ہیں: ایک سرکاری اور سیکولر نظام ہے جس کو دین سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہ صرف دنیا کے لیے ہے۔ پھر دینی تعلیم ہے جس میں دنیاوی پہلو کو بالعموم نظر انداز کیا گیا ہے۔الحمدللہ اب کچھ احساس اور اس کی بنیاد پر عمل شروع کیا

گیا ہے لیکن بہر حال وہ کم ہے۔ اور وہاں سے فارغ لوگ زندگی کے ہر شعبے میں کارکردگی اور قیادت کی ذمہ داری ادا نہیں کرسکتے۔ حالانکہ اصولاً ان کے اندر یہ استعداد ہونی چاہیے۔ اور تیسرا خالص غیر ملکی نظام ہے جو ہم پر او لیول اور اے لیول کی شکل میں ٹھونس دیا گیا ہے اور اب لاکھوں افراد ایسے سسٹم کے ذریعے تیار (produce) کیے جارہے ہیں جو نہ اپنی مادری زبان سے واقف ہیں، نہ اپنی قومی زبان سے واقف ہیں، نہ اپنی ثقافت، دین، اقدار و روایات سے۔ یہ بہت بڑا سانحہ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک ایسا یکساں نظامِ تعلیم ہو جو ان تینوں پہلوؤں کو اپنے اندر سمو سکے۔

یہاں میں آپ کو یاد دلاؤں کہ کس طرح ہر شعبۂ علم، ہر شعبۂ ایجاد و جستجو ہماری تاریخ میں خود قرآن وسنت کی بنیاد اور اس سے تعلق کے نتیجہ میں رونما ہوا۔ سب سے پہلی چیز یہ تھی کہ قرآن کو محفوظ کرنا، صرف حفظ نہیں بلکہ تحریر کی صورت میں بھی۔ تحریر کے بارے میں کئی پہلو سامنے آئے۔ ایک یہ کہ وہ چیز جس پر تحریر کیا جائے۔ جس کے لیے ہڈی کا بھی استعمال ہوا، چمڑا بھی استعمال ہوا اور پھر کاغذ بھی استعمال ہوا ہے، چنانچہ کاغذ کو بہتر سے بہتر بنایا گیا ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ جس سے لکھا جائے یعنی قلم اور روشنائی۔ روشنائی کے بارے میں سوچا گیا کہ اُس روشنائی کو ایسا بنایا جائے جو آسانی سے مٹ نہ پائے اور جو منور ہو۔ یعنی قرآن کی کتابت کے لیے جو روشنائی استعمال ہوتی تھی اس میں چاندی اور سونے کے ذرات کو اس لیے ڈالا گیا کہ یہ حرف ہمیشہ روشن رہیں۔ آپ غور کیجیے کہ قرآن کی حفاظت کی سوچ نے پتھر، تختی، ہڈی کو چھوڑ کر کاغذ کو ترقی دینے کی طرف لگایا۔ روشنائی کو بہتر سے بہتر بنانے کی سوچ نے کیمسٹری اور کیمکل سائنس کی طرف ہمیں متوجہ کیا۔ ہماری پوری تاریخ میں کیمسٹری علم کا ایک بڑا اہم میدان رہا ہے۔ پھر قرآن پڑھیں تو اس میں اللہ کی نشانیوں کی طرف متوجہ کیا گیا ہے (**تذکیر بآیات اللّٰہ**) اور اس میں اہم تاریخی واقعات کی طرف متوجہ کیا گیا ہے (**تذکیر بأیام اللّٰہ**)۔ ان تمام چیزوں نے مسلمانوں کو جغرافیے، تاریخ اور دیگر علوم کی طرف متوجہ کیا۔ پھر قوموں کے عروج و زوال کے اسباب اور اس کے اصول بھی قرآن نے بتائے۔

اسی طرح نماز کے اوقات کا تعین ایک عملی ضرورت ہے، جس نے علم الافلاک کی طرف متوجہ

کیا۔ نماز کے لیے قبلہ کی سمت کا تعین کرنا ایک اہم مسئلہ ہے کہ دنیا میں آپ جہاں بھی جائیں آپ کو ایک ہی قبلہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنی ہے۔ اس چیز نے بھی جغرافیہ کی طرف متوجہ کیا۔ اس طرح آپ دیکھیں گے کہ وہ تمام چیزیں جو دین کے بنیادی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے درکار تھیں، اُن پر غور وخوض کیا گیا اور اُن سے مختلف علوم کی شاخیں نکلیں۔ اسی تسلسل میں حدیث کے بارے میں غور کیجیے: علم روایت، علم الرجال، علم درایت، علم الاحکام، یہ سارے علوم کیسے پیدا ہو گئے۔ اسی طرح علم التفسیر، علم کلام اور تصوف بھی۔ تو خواہ اُس کا تعلق مادی دنیا سے ہو، یا انسانی دنیا سے ہو، بے شمار علوم صرف اللہ کے حکم کو سمجھنے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی تلاش اور جستجو کا نتیجہ ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی مرض ایسا نہیں ہے جس کی دوا نہ پیدا کی گئی ہو۔ یہ ایک اشارہ ہے علم طب کے لیے۔ چنانچہ اس کی روشنی میں اشیاء کے خواص کو جاننا اور پھر یہ جاننا کہ اُن خواص کا کیا تعلق ہے انسان کی بیماری سے، اور کس طرح پھر اُس کا علاج ہوسکتا ہے۔ اس طرح طب اور حیاتیات سے متعلق علوم میں ترقی ہوتی رہی ہے۔ یوں انفس اور آفاق، دونوں ہمارے میدان ہیں۔ اس میں ہمارا امتیاز یہ ہے کہ اس میں سے ہر ایک اللہ کے بندے کی حیثیت سے، اللہ کی دی ہوئی ہدایت کی روشنی میں اور اس احساس کے ساتھ کہ جو کچھ ہے امانت ہے، جس کی ہمیں جوابدہی کرنی ہے، تعلیم کے عمل کا حصہ بنتا ہے۔ حسنات دنیا، حسنات آخرت دونوں ہمارا مقصد ہیں، اور ان شاء اللہ فلاح اور سعادت ہماری منزل ہے۔

آج کی اس گفتگو میں میں نے یہ کوشش کی ہے کہ اسلام کے تصورِ علم اور تصورِ تعلیم کے چند نمایاں پہلو آپ کے سامنے رکھوں۔ وقت اجازت نہیں دیتا کہ اس کی روشنی میں مسلمانوں کی تاریخی روایت کا بھی جائزہ لے لیا جائے، البتہ میں آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ تعلیم کے سلسلے میں صرف تعلیم کی وسعت اور تعلیم کے ہر پہلو کو اسلام کے نظامِ تعلیم کا حصہ بنانا ہی نہیں بلکہ تعلیم اور تدریس کے طریقے بھی شامل ہیں۔ یہ سب بھی ہماری روایت کا حصہ ہیں اور اس میں بھی بیش بہا تجربات کیے گئے ہیں۔ بہت سی چیزیں جنہیں آج تدریس کے نئے طُرق کہا جاتا ہے، مسلمانوں کی تاریخ میں اُن پر عمل

ہوتا رہا ہے اور ان میں نئے نئے راستے تلاش کیے گئے ہیں۔

اِس وقت میرا مقصد دراصل یہ تھا کہ علم اور تعلیم دونوں کے بارے میں اسلام کا جو مزاج اور خصوصی contribution ہے اُس کی طرف آپ کی توجہ دلاؤں۔ مقصد تمام اہم چیزوں کا استحضار نہیں بلکہ صرف سوچ کا ایک انداز آپ کے سامنے رکھنا ہے، تاکہ اگر آپ محسوس کریں کہ سوچنے کا یہ طریقہ ہمارے لیے فکر اور عمل کے نئے راستے کھولتا ہے تو پھر اس کی روشنی میں جستجو کریں اور محض دوسروں کے شکار پر قناعت نہ کریں بلکہ خود آگے بڑھ کر ان کی روشنی میں اپنا راستہ بنائیں اور نئے چراغ جلائیں۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین!

عملِ تدریس اور ابلاغ

ڈاکٹر معین الدین ہاشمی

ابلاغ: لفظی معنی ومفاہیم

دینی مدارس میں چونکہ قرآن، حدیث، فقہ اور اصولِ فقہ کی تدریس کا تناسب زیادہ ہوتا ہے، اس لیے وہ مہارتیں جو عملی میدان میں بطور فن استعمال ہوسکتی ہیں اُن کی طرف توجہ کم ہو پاتی ہے۔ ابلاغ اور اس کی مہارتیں بھی ایسا ہی ایک عنوان ہے۔ کسی بھی پیغام کو مؤثر انداز میں دوسروں تک پہنچانے کے فن نے اب ایک باقاعدہ سائنس کی شکل اختیار کرلی ہے، جس پر دنیا کی بہت سی یونیورسٹیوں اور خود پاکستان میں بھی ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگری دی جاتی ہے۔ اس کے مختلف شعبوں اور دیگر متعلقہ موضوعات پر بلا مبالغہ سیکڑوں نہیں ہزاروں کتابیں اور مقالات چھپ چکے ہیں۔

ابلاغ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ کوئی بھی جاندار ابلاغ کے بغیر گزر بسر نہیں کرسکتا چاہے وہ چرند، پرند، درند یا کوئی بھی ذی روح چیز ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تمام جانداروں کو ابلاغ کی ایک طاقت دی ہے، اور وہ اپنی اپنی ضروریات کے مطابق ابلاغ کے بل بوتے پر زندگی گزارتے ہیں۔ قرآنِ مجید میں سورۃ النمل میں بطورِ خاص چیونٹی کے ابلاغ کا ذکر ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

حَتّٰىٓ اِذَآ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ

ایک مرتبہ وہ ان کے ساتھ کوچ کر رہا تھا، یہاں تک کہ جب یہ سب چیونٹیوں کی وادی میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا، اے چیونٹیو! اپنے بلوں میں گھس جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کے لشکر تمہیں کچل ڈالیں اور انہیں خبر بھی نہ ہو۔ (النمل:۱۸)

ابن آدم کو اللہ تعالیٰ نے ایک پرندے کے ذریعے ابلاغ دیا۔ جب اُس نے ایک کوّے کو بھیجا اور انسان کو اُس کے ذریعے مردہ کو دفن کرنے کا ابلاغ ہوا:

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَاباً يَّبحَثُ فِيْ الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَ ةَ اَخِيْهِ.

پھر اللہ نے ایک کوّا بھیجا جو زمین کھودنے لگا، تاکہ اسے بتائے کہ اپنے بھائی کی لاش کیسی چھپائے۔ (المائدہ:۳۱)

حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہُدہُد کے ذریعے ابلاغ (یعنی خط پہنچانے اور دور دراز ملک کی معلومات حاصل کرنے) کا کام لیا (النمل:۲۰ تا ۲۸)۔ قرآنِ مجید میں جنّات کے قرآن سننے اور آگے اپنی قوم میں اس کے ابلاغ کا تذکرہ بھی دو جگہ آیا ہے (الجن:۱ اور الاحقاف:۲۹)۔ غرض یہ کہ ابلاغ بہت اہم ہے اور بنی نوع انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو اشرفیت دی ہے اُس اشرفیت کا ایک اہم عنصر اور ایک اہم وجہ ابلاغِ حق ہے اور اس شرف کی انتہا نبوت ہے۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام کی قدر و منزلت میں ایک بنیادی عنصر اِسی چیز کو قرار دیا گیا ہے کہ یہ اللہ کی بات کا ابلاغ کرتے ہیں۔ قرآن میں مختلف مقامات پر اس سے متعلق ارشادات موجود ہیں۔ فرمایا:

اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ

تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں۔ (الاعراف:۶۲)

وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ.

رسول کی ذمہ داری اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ وہ صاف صاف حکم پہنچا دے۔ (النور:۵۴)

ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا جو شرف اور ان کی جو منزلت ہے اُس میں ایک اہم وجہ حق کا ابلاغ یعنی اللہ تعالیٰ کی بات کو اُس کے بندوں تک کما حقہٗ پہنچانا ہے۔

سیرت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابلاغ کے وہ تمام ذرائع استعمال کیے

جو اُس دور میں موجود تھے اور بہت کثرت سے اور بہت مؤثر طور پر ان کا استعمال کیا۔ ۱ مذکورہ چند حوالوں سے اس بات کا اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ عمل تدریس اور ابلاغ سے متعلق قرآن و حدیث میں وافر مقدار میں لوازمہ موجود ہے جس سے راہنمائی حاصل کی جانی چاہیے، تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ عصری تناظر میں مغرب میں اس فن اور اس کے مؤثر استعمال پر غیر معمولی توجہ دی گئی ہے، جسے اس لیے بھی سمجھنا ضروری ہے کہ مغرب کے ابلاغ کا ایک ہدف خود مسلمان بھی ہیں، چنانچہ اس میدان میں ان کے نظریات اور طرزِ عمل کو سمجھنے کی صورت میں اپنے دائروں میں ابلاغ کو مؤثر بنانے کے ساتھ دیگر اقوام اور گروہوں کے ساتھ ابلاغ زیادہ بہتر طور پر کیا جاسکتا ہے۔ ۲ ذیل میں انتہائی اختصار کے ساتھ ابلاغ سے متعلق چند اہم نظریات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ابلاغ کے نظریات

مقتدرانہ ابلاغ: اس نظریے کا بانی افلاطون کو کہا جاتا ہے۔ مقتدرانہ ابلاغ سے مراد یہ ہے کہ ابلاغ پر صرف اُن لوگوں کا حق ہے جو مقتدر ہیں یعنی جن کے پاس طاقت اور حکومت ہے۔ عوام اور رعایا اس کا حق نہیں رکھتے۔ مملکت عوام کو کیا حقوق دیتی ہے؟ یا مملکت کے کیا فرائض ہیں؟ یہ عوام کے سوچنے کا کام نہیں ہے۔ افلاطون سے منسوب اس نظریے کو بالعموم حکومتوں کی حمایت حاصل رہی۔ حکومتوں اور مقتدر شخصیات کے ساتھ ساتھ مختلف مذاہب کے رہنماؤں نے بھی اس نظریے کی حمایت کی۔ چنانچہ عیسائیوں یا یہودیوں کے مذہبی رہنماؤں نے اسے اپنے مطلب کی چیز سمجھا اور عوام کو حصولِ علم سے محروم رکھا تاکہ دین کی رہنمائی حاصل کرنے کے لیے عوام اُن کے پاس جانے پر مجبور ہوں اور انہیں یہ موقع حاصل ہو کہ وہ اللہ کے حکم کو عوام تک پہنچائیں۔ قرآنِ مجید میں بھی اس عمل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ.

کیوں ان کے علماء اور مشائخ انہیں گناہ پر زبان کھولنے اور حرام کھانے سے نہیں روکتے؟

(المائدہ:۶۳)

مذہبی رہنما جو ابلاغ کرتا تھا وہی آخری بات ہوتی تھی، اور وہی شریعت کا حکم ہوتا تھا، وہی ناسخ ہوتا تھا، اور منسوخ بھی اُسی کے پاس تھا، یعنی حق کا نسخ بھی اُسی کے پاس تھا، اس لیے کہ ابلاغ اُس کے قبضے میں تھا۔ غور کیا جائے تو آج بھی دنیا میں یہی صورتِ حال ہے کہ حقِ نسخ اُن اقوام کے قبضے میں ہے جن کے پاس ابلاغ کی غیر معمولی طاقت ہے وہ ایک دن اگر کوئی ایک بات کرتے ہیں تو پوری دنیا میں پھیل جاتی ہے۔ اور وہی بات جب غلط ثابت ہو جاتی ہے تو وہ بڑی آسانی سے اُس کی تردید بھی کر لیتے ہیں اور اُس تردید میں کئی جواز بھی پیش کر دیتے ہیں کہ جو کچھ پہلے کیا گیا تھا یا کہا گیا تھا وہ بھی درست تھا اور اب جو آپ کو بتایا جا رہا ہے یہ بھی درست ہے، اس لیے کہ سارا ابلاغ اُن کے تصرف میں ہے۔ یہ ابلاغ کا مقتدرانہ نظریہ ہے۔

آزادانہ نظریہ ابلاغ: مذکورہ بالا مقتدرانہ نظریہ ابلاغ کافی عرصے تک دنیا میں غالب اندازِ فکر رہا۔ دوسری طرف خاصے عرصے تک اس پر بحث بھی ہوتی رہی، پھر اس کا ردّ عمل ہوا۔ ردّ عمل کے طور پر اس نظریے کو فروغ ملا کہ عوام کو ابلاغ کا حق دیا جائے اور بے لاگ حق دیا جائے، اور یہ بھی کہ ہر چیز کا ابلاغ ہونا چاہیے۔ کیونکہ نیا نظریہ ردّ عمل کی پیداوار تھا اس لیے اس میں بھی ایک انتہا پسندانہ طرزِ فکر نمایاں تھا۔ یعنی یہ کہ سب کچھ آزاد کر دیا جائے۔ چنانچہ ہر چیز کا ابلاغ ہو سکتا ہے، ہر جگہ ہو سکتا ہے اور ہر ایک کر سکتا ہے۔ اِسی کو آزادی پسندانہ نظریہ ابلاغ بھی کہا گیا۔ اس نظریے کو آگے بڑھانے اور پھیلانے میں جان لاک (۱۶۳۲ء تا ۱۷۰۴ء) کے نام کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

اس نظریے کے معاشرے پر بعض بہت منفی اثرات ہوئے۔ مثلاً یہ کہ انسان کی نجی زندگی ختم ہو کر رہ گئی۔ ہر چیز کا ابلاغ، ہر وقت اور ہر شعبے میں ہو اور اس پر کوئی قید نہ ہو، تو پھر تو انسان کی ساری زندگی پبلک ہو جاتی ہے، جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ کسی بھی انسان کی پرائیویٹ زندگی اُس کی پبلک زندگی سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسلامی تناظر میں اس پر غور کریں تو ہمارے یہاں شریعت میں اگرچہ قانون کی بات کی گئی ہے لیکن اخلاق کی بات اس سے زیادہ زور دے کر کی گئی ہے۔ اس لیے کہ قانون کا اطلاق پبلک زندگی پر ہوگا۔ گھر میں اگر کوئی غلط کام سرزد بھی ہو جائے تو اُس پر قانون لاگو نہیں ہوگا۔ کیونکہ

قانون کو اس غلطی کا پتہ ہی نہیں ہے۔شریعت نے اس کے لیے اخلاقی تعلیمات رکھی ہیں۔کہ اخلاق ہی وہ قوت ہے جو ظاہر میں بھی اور گھر میں بھی، باہر بھی اور اندر بھی انسان کو اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ وہ غلط کام نہ کرے۔

اس تناظر میں آزادانہ نظریہ ابلاغ کے خلاف بھی ردّعمل ہوا، کئی نئے نظریات سامنے آئے، جن میں مثال کے طور پر سماجی نظریات کا نظریہ ابلاغ یا اسی طرح کمیونسٹ نظریہ ابلاغ شامل ہیں، تاہم ان سب کی تفصیلات اس وقت ہمارے موضوع سے متعلق نہیں۔اصل میں ابلاغ کے یہ نظریات مختلف ادوار میں مغربی معاشروں میں پروان چڑھے۔اور بالعموم ہر نیا نظریہ پہلے کے ردّعمل کے طور پر سامنے آیا۔چنانچہ مقتدرانہ نظریہ ابلاغ کے ردّعمل کے طور پر آزادی پسندانہ نظریہ ابلاغ سامنے آیا۔پھر جب اس کی بہت زیادہ خامیاں سامنے آئیں اور لوگوں کو مسائل کا سامنا کرنا پڑا کہ اُن کی نجی زندگی ختم ہوگئی، تو اس نظریے میں تبدیلی کی گئی اور کہا گیا کہ سماجی ذمہ داری بھی کوئی چیز ہے۔سماجی ذمہ داری میں یہ شامل ہے کہ مثال کے طور پر اگر گھر ہے تو اُس کی بہت ساری چیزیں ایسی ہیں جو ظاہر (اوپن) نہ کی جائیں، اور کچھ حدود و قیود کو قبول کیا جائے، کیونکہ دوسری صورت میں سماج کو اس سے نقصان ہوتا ہے۔اس طرح انسانی معاشرے کے تجربات سے نظریات میں اصلاح اور بہتری آتی ہے۔

اسلامی نظریہ ابلاغ اور اس کے بنیادی اُصول

جہاں تک ابلاغ سے متعلق اسلامی نظریات کا تعلق ہے اس ضمن میں اہم ترین اور بنیادی بات یہ ہے کہ ابلاغ سے متعلق اسلام کے نظریات کسی ردّعمل کا نتیجہ نہیں ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ابلاغ سے متعلق دیگر نظریات کی مثبت چیزوں کو اسلام رد نہیں کرتا۔اسلام کے نظریہ ابلاغ کے چند اہم اور بنیادی اصول، جو اسے دیگر نظریات سے ممتاز کرتے ہیں، درج ذیل ہیں۔

(ا) حق کا ابلاغ: اسلام میں ابلاغ کا پہلا اصول حق کا ابلاغ ہے۔یعنی اسلام حق کے ابلاغ پر زور دیتا ہے اور ''ناحق'' کے ابلاغ کی اجازت نہیں دیتا۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

يَآاَ يُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا للّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلاً سَدِيْدًا.

اے ایمان لانے والو، اللہ سے ڈرو اور ٹھیک بات کیا کرو۔(الاحزاب:۷۰)

یہ ابلاغِ حق کی بنیادی دلیل ہے، یعنی یہ بنیادی ستون ہے۔اس کے مقابلے میں جو دوسری چیز ہے وہ کتمانِ حق یعنی حق کو چھپانا ہے۔قرآنِ مجید نے مختلف مقامات پر کتمانِ حق سے سختی سے منع کیا ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ.

باطل کا رنگ چڑھا کر حق کو مشتبہ نہ بناؤ اور نہ جانتے بوجھتے حق کو چھپانے کی کوشش کرو۔(البقرۃ:۴۲)

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے کتمانِ حق کو منافقین کا شعار قرار دیا:

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ، يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ

منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک دوسرے کے ہم رنگ ہیں، برائی کا حکم دیتے ہیں اور بھلائی سے منع کرتے ہیں۔(التوبہ:۶۷)

ظاہر ہے کہ ایک چیز منکر ہے تو وہ حق کو چھپا رہی ہے، دوسرے لفظوں میں حق کو چھپانا اور برائی کا اظہار، کتمانِ حق ہے۔

اسی طرح اسلام کا تصورِ شہادت بھی دراصل ابلاغِ حق ہے۔درحقیقت اگر ابلاغ کی مختلف صورتوں کی درجہ بندی کی جائے تو سب سے اعلیٰ درجہ شہادت کا ہے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْعَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِالْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، انصاف کے علم بردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔(النساء:۱۳۵)

یعنی حق اور سچائی کا ابلاغ اتنا ضروری ہے کہ اگر تمہیں خود یا تمہارے والدین اور پورے خاندان کو بھی نقصان ہو تب بھی اس ابلاغ کو تم نہ چھوڑ سکتے ہو اور نہ چھپا سکتے ہو۔اس کے احترام کا یہ عالم ہے

کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی طرف منسوب کردیا اور اپنا حق قرار دے دیا۔ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَاَشۡهِدُوۡا ذَوَیۡ عَدۡلٍ مِّنۡكُمۡ وَاَقِيۡمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ.

اور دو ایسے آدمیوں کو گواہ بنالو جو تم میں سے صاحبِ عدل ہوں اور (اے گواہ بننے والو) گواہی ٹھیک ٹھیک اللہ کے لیے ادا کرو۔(الطلاق:۲)

چنانچہ حق کا ابلاغ اسلام کے تصوّرِ ابلاغ کی پہلی بنیاد ہے۔

(۲) تحقیق و جستجو: اسلام کے تصوّرِ ابلاغ کی دوسری بنیاد تحقیق اور جستجو ہے۔قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ جَآءَكُمۡ فَاسِقٌ ۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوۡۤا اَنۡ تُصِيۡبُوۡا قَوۡمًاۢ بِجَهَالَةٍ فَتُصۡبِحُوۡا عَلٰى مَا فَعَلۡتُمۡ نٰدِمِيۡنَ.

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کرلیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر اپنے کیے پر پشیمان ہو۔(الحجرات:۶)

تحقیق اور جستجو کے بغیر ابلاغ جائز نہیں ہے۔رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے کہ بغیر تحقیق کے بات آگے پہنچانا جائز نہیں۔ایک طرف دینی احکام کے مطابق ابلاغ کی اہمیت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمارہے ہیں:

فَلۡيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الۡغَآئِبَ

موجود لوگ اسے غیر موجود لوگوں تک پہنچائیں۔(بخاری)

جو سنے، آگے پہنچائے۔لیکن دوسری طرف یہ بھی فرمایا کہ:

كَفٰى بِالۡمَرۡءِ اِثۡمًا اَنۡ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ

کسی فرد کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ ہر سنی سنائی بات آگے بیان کردے۔(سنن ابی داود)

ہر سنی سنائی بات آگے بیان کردینے سے پورا معاشرہ بے ترتیبی اور انتشار کا شکار ہوجاتا ہے۔قرآنِ مجید میں واقعہ افک میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی نہایت مذمت فرمائی ہے جنہوں نے بغیر

تحقیق کے ام المومنین سیّدہ عائشہؓ پر الزام تراشی کی:

اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ

جبکہ تمہاری ایک زبان سے دوسری زبان اس جھوٹ کو لیتی جارہی تھی اور تم اپنے منہ سے وہ کچھ کہے جارہے تھے جس کے متعلق تمہیں کوئی علم نہ تھا۔(النور:۱۵)

(۳) برائی اور ابلاغ: اسلام نے بدی کے ابلاغ کو ناجائز قرار دیا اور اس کی سخت ممانعت کی، بدی کے وسیع تر مفہوم میں ایسی ہر چیز کی ممانعت کی گئی ہے جس سے معاشرے میں فساد اور انتشار پھیلتا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ

جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان والوں کے گروہ میں فحش پھیلے وہ دنیا اور آخرت میں دردناک سزا کے مستحق ہیں۔(النور:۱۹)

چنانچہ فحاشی کی اشاعت جائز نہیں ہے۔اسی طرح 'ناحق' کے ابلاغ کو شیطانی کردار کہا گیا ہے۔ قرآنِ مجید میں مختلف جگہوں پر شیطان کو اللہ تعالیٰ نے بطور ایک کردار کے بیان کیا ہے۔اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

مَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ

جو کوئی شیطان کی پیروی کرے گا تو وہ اسے فحش اور بدی ہی کا حکم دے گا۔(النور:۲۱)

نیز ابلاغِ ناحق کو نفاق کی علامت کہا گیا ہے:

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ۔ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ

منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک دوسرے کے ہم رنگ ہیں۔برائی کا حکم دیتے ہیں اور بھلائی سے منع کرتے ہیں۔(التوبہ:۶۷)

اس کے بالمقابل مؤمنین کے بارے میں فرمایا:

وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتُ بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِيَآءُ بَعۡضٍ ‌ۘ يَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ يَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ

مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں۔(التوبہ:۷۱)

اس آیت کی رو سے مؤمنین کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اچھی چیز کا ابلاغ کریں اور بری چیز کے ابلاغ سے خود رکیں اور دوسروں کو بھی روکیں۔

(۴) تکریمِ انسانیت: اسلام کے نظریہ ابلاغ کا ایک اور بنیادی وصف تکریمِ انسانیت ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَقَدۡ كَرَّمۡنَا بَنِىۡۤ اٰدَمَ

یہ تو ہماری عنایت ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی۔(الاسراء:۷۰)

تکریمِ انسانیت کی بنیاد پر ہی اسلام میں ستر پوشی کا حکم بھی دیا گیا ہے اور ایسے ربط کی ممانعت کی گئی ہے جس سے دوسروں کا استہزاء ہو یا ان کے جان و مال یا عزت کا نقصان ہو۔

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا يَسۡخَرۡ قَوۡمٌ مِّنۡ قَوۡمٍ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، کوئی قوم دوسری قوم کا مذاق نہ اڑائے۔(الحجرات:۱۱)

اللہ تعالیٰ نے اس حکم کو عام فرمایا۔ چنانچہ تکریمِ انسانیت کا یہ پہلو صرف مسلمانوں تک محدود نہیں، غیر مسلم بھی اس میں شامل ہیں۔کسی مسلمان کے لیے یہ روا نہیں ہے کہ وہ ایسا ابلاغ کرے جس سے غیر مسلم کی عبادت گاہ یا اُن کی کسی مقدس اور مذہبی ہستی کی توہین ہوتی ہو۔اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں ارشاد فرمایا:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدۡوًاۢ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ

اور یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں انہیں گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔(الانعام:۱۰۸)

اس کی مزید وضاحت رسول اللہ ﷺ کی سیرت سے بھی ہوتی ہے۔ غیر مسلموں کیساتھ ابلاغ کے ضمن میں اچھے رویہ کی تاکید کرتے ہوئے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ

اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقے سے۔ (العنکبوت: ۴۶)

ایسے ابلاغ میں تعاون کا حکم دیا گیا ہے جو درست اور جائز ہو۔ ارشاد ہے:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ

کہو، اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ (آل عمران: ۶۴)

اسلام نے غیر مسلموں کے ظاہری عہدے اور مراتب کا بھی خیال رکھا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسا ابلاغ کبھی بھی نہیں فرمایا جس سے غیر مسلموں کی کسی مقدس ہستی یا ان کے قائدین کی توہین ہوتی ہو۔ معاشرے میں اُن کا جو رتبہ تھا رسول اللہ ﷺ نے بھی اس کا خیال رکھا ہے۔ ایسا فرد جو ایک قوم کا رہنما ہے اس کو توہین آمیز انداز میں پکارنا مناسب نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب بادشاہوں کو خط لکھے تو اُن کا جو بھی مقام خود ان کے ہاں تھا، وہ آپؐ نے ان کے نام کے ساتھ لکھا۔ چنانچہ ہرقل اور دیگر سربراہان کے ناموں کے ساتھ ان کا معروف لقب ''عظیم'' وغیرہ تحریر فرمایا۔ مثلاً: مِنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ اِلٰى هِرَقْلَ عَظِيْمِ الرُّوْمِ۔ اسی طرح مِنْ مُحَمَّدٍ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَى نَجَاشِي عَظِيْمِ حَبَشَة، مِن مُحَمَّدِ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَى كِسرىٰ عَظِيمِ فَارَس۔ فرد کو کوئی مرتبہ مالکِ کائنات نے عطا فرمایا ہے تو اس کا اعتراف تو غیر مسلم کے لیے بھی کیا جا سکتا ہے۔ اسلام کے طرزِ تخاطب میں تکریمِ انسانیت ہے۔ مسلمان ہو یا غیر مسلم، اظہارِ خیال ایسا ہو کہ دوسرے کی ہتک اور تذلیل نہ ہو بلکہ اس کی عزت کا لحاظ رکھا جائے۔ غیر مسلموں کی محترم چیزوں کے احترام کا اظہار بھی ہونا چاہیے۔ آپ ﷺ نے نجران کے اہلِ کتاب کے لیے مکتوب میں لکھا کہ لَا يُغَيَّرَ اَسْقَفٌ مِّنْ اَسْقَفِيَّتِهٖ (کسی اسقف کو اس کی اسقفیت سے نہیں ہٹایا جائے گا۔ تاریخ المدینہ لابن شبہ النمیری)۔

ضمناً یہ عرض کر دوں کہ ہوسکتا ہے بعض ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہو کہ اسلام کیونکر غیر اللہ کی عبادت کو برداشت کرسکتا ہے؟ اس سلسلہ میں یہ واضح رہنا چاہیے کہ اسلام تبدیلیٔ مذہب کے لیے زور زبردستی سے سختی سے منع کرتا ہے، (لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ)۔ دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ مراسمِ عبودیت ادا کرنے کو اسلام نجی معاملہ سمجھتا ہے، اور نجی یا پرائیویٹ زندگی کا احترام بھی سکھاتا ہے۔ اسلام جہاں بھی جاتا ہے وہاں کسی کی نجی زندگی میں مداخلت نہیں کرتا۔ چنانچہ غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کو کبھی بھی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ مسلم اور غیر مسلم مِل جُل کر ایک ہی بستی میں رہ بَس سکتے ہیں، جیسا کہ مدینہ منورہ میں تھا کہ ایک ہی جگہ پر یہودی بھی رہتے تھے اور مسلمان بھی رہتے تھے۔ بلکہ بعض مواقع پر تو ایسا ہوتا تھا کہ ایک ہی گھر میں یہودی بھی تھا اور مسلمان بھی۔

(۵) **خیر خواہی و نصیحت:** اسلام کا نظریہ ابلاغ خیر خواہی اور نصیحت پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
>
> اس دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو، جسے انسانوں کی ہدایت واصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور بدی سے روکتے ہو۔ (آل عمران: ۱۱۰)

حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بچوں کو خیر خواہی پر مبنی نصیحت کی جس کو اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا اور قرآنِ مجید میں اُس کا تذکرہ فرمایا:

> يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ
>
> بیٹا، نماز قائم کر، نیکی کا حکم دے اور بدی سے منع کر۔ (لقمان: ۱۷)

یہ خیر خواہی ہی اسلام کے نظریہ ابلاغ کی بنیاد ہے۔ اسی طرح پیغمبر کے الفاظ کو اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں نقل فرمایا کہ:

> اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ
>
> تم کو اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں اور تمہارا ایسا خیر خواہ ہوں جس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ (الاعراف: ۶۸)

(٦) دلائل سے بھرپور ابلاغ: ابلاغ کا کوئی بھی طریقہ دلائل کے بغیر مناسب نہیں۔قرآن مجید کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دیگر ادیان کے پیروکاروں کے ساتھ (دلائل کی روشنی میں) مباحثہ و مناظرہ کیا گیا۔اسی طرح کے ایک موقع کے تناظر میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ

اسی طرح ہم اپنی آیات کو بار بار مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں اوراس لیے کرتے ہیں کہ یہ لوگ کہیں تم کسی سے پڑھ آئے ہو، اور جو لوگ علم رکھتے ہیں ان پر ہم حقیقت کو روشن کردیں۔

(الانعام:۱۰۵)

روایت میں آتا ہے کہ ایک صحابیؓ رسول اللہ ﷺ کے پاس دوسرے صحابیؓ کی شکایت لے کر آئے کہ وہ بہت طویل نماز پڑھاتے ہیں،اُس وقت آپ ﷺ نے جو نصیحت فرمائی اُس میں دلیل کے ساتھ طویل نماز پڑھانے کی ممانعت کی گئی ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا:

اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّكُمْ مُنَفِّرُوْنَ فَمَنْ صَلّٰى بِالنَّاسِ فَلْيُخَفِّفْ

اے لوگو! تم لوگوں کو نفرت دلانے لگے ہو،سن لو، جو شخص لوگوں کو نماز پڑھائے تو وہ ہلکی پڑھائے۔

(صحیح بخاری)

بظاہر پیغام تو اتنا کافی تھا، کہ آپ ﷺ صرف یہ فرمادیتے کہ نماز کو مختصر کرو، لمبی نماز نہ پڑھاؤ۔ لیکن آپ ﷺ نے اس ابلاغ کے ساتھ بھی دلیل پیش کی اور یہ فرمایا:

فَاِنَّ فِيْهِمُ الْمَرِيْضَ وَالضَّعِيْفَ وَذَا الْحَاجَةِ

اس لیے کہ ان میں مریض،ضعیف اورضرورت مند بھی ہوتے ہیں۔(صحیح بخاری)

ابلاغِ عمل کے عناصر ترکیبی

ابلاغِ عمل کے چار بنیادی عناصِر ہیں۔

(۱) **پیغام:** پیغام کو عربی میں ''رسالہ''،انگریزی میں message کہا جاتا ہے۔

(۲) **پیغام رساں:** اس کو عربی میں ''مرسل'' اور انگریزی میں sender کہتے ہیں۔

(۳) ذریعۂ ابلاغ: اس کو عربی میں ''وسیلہ'' اور انگریزی میں چینل (channel) کہا جاتا ہے۔

(۴) پیغام وصول کرنے والا: اس کو عربی میں ''مستمع'' اور انگریزی میں receiver کہا جاتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ایک پانچویں چیز کو بھی بہت اہمیت دی گئی ہے، یعنی یہ کہ پیغام کا مقصد کیا ہے۔قرآن میں ابلاغ کے ان تمام عناصر کا ذکر ہے۔مثلاً:

(۱) پیغام: پیغام کے تعارف سے متعلق اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ

یہ اللہ کی کتاب ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے، متقیوں کے لیے ہدایت ہے۔(البقرہ:۲)

اللہ تعالیٰ اس کا تعارف کروانا چاہتا ہے کہ یہ پیغام ہے، یہ message ہے۔

(۲) پیغام رساں: قرآن مجید کس کی طرف سے ہے؟ اس سے متعلق ارشاد فرمایا:

وَ اِنَّهٗ لَتَنْزِیْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

یہ رب العالمین کی نازل کردہ چیز ہے۔(الشعراء:۱۹۲)

(۳) ذریعۂ ابلاغ: پہنچانے کے ذریعہ کے متعلق ارشاد فرمایا:

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ

اسے لے کر امانت دار روح اُتری۔(الشعراء:۱۹۳)

نیز ارشاد فرمایا:

بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ

عربی مبین میں۔(الشعراء:۱۹۵)

اس کی بڑی اہمیت ہے۔کوئی سوچ سکتا ہے کیا پتہ راستے میں بات اِدھر اُدھر ہو گئی ہو۔اس لیے

اللہ ربّ العزت نے فرمایا: نَـزَلَ بِـهِ الرُّوْحِ الْاَمِيْن ،قاصدامانت دار ہےاورزبان عربی ہے جو فصیح ہے۔اور پھرکہیں فرمایا: ذِیْ قُوَّ ةٍ عِـنْـدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِيْنٍ ۔یعنی قوی بھی ہےاورامین بھی ہے، دونوں خصوصیتیں اس کے اندر ہونی چاہییں ۔ یہ ذریعہ کی اہمیت ہے۔اس پس منظر میں اسلامی اصول تحقیق میں دیگر اصولوں کے ساتھ ساتھ راوی کی بھی بڑی اہمیت ہے، جو حدیث پہنچانے کا ایک ذریعہ ہے۔راوی کی ثقاہت کے درجے کی بنیاد پر ایک حدیث ضعیف ہو جاتی ہے یا وہ صحیح قرار دے دی جاتی ہے۔

قرآنِ مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعے میں اللہ تعالیٰ نے ان کی بات کو بیان فرمایا کہ:

وَاَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَاَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا

اور میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ زبان آور ہے۔(القصص:۳۴)

چنانچہ وہ بڑا اچھا مبلغ ہے جس کی بات میں زیادہ ابلاغ اور زیادہ فصاحت ہے۔

ابلاغ کے ذرائع

ابلاغ کے چار اہم ذرائع ہیں: (۱) صوتی ذرائع ابلاغ ،جس کو انگریزی میں oral اور عربی میں ''شفہی'' بھی کہتے ہیں۔ (۲) مرئی یا بصری (visual) ذرائع؛ (۳) عملی ذرائع، یعنی practical؛ (۴) تحریری ذرائع۔ یہ ابلاغ کی بڑی بڑی اقسام ہیں۔قرآنِ مجید نے ان سارے ذرائع کو استعمال کرنے کے اشارات دیے ہیں۔ مثال کے طور پر صوتی ذرائع کے متعلق قرآن کی آیت ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی

وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا۔(النجم:۳)

جتنی آیات میں نطق کا ذکر ہے، وہ آپ جمع کریں تو پتہ چلے گا کہ صوتی ذرائع کے کیا کیا انداز ہو سکتے ہیں۔قرآن مجید کی بہت سی آیات سے بصری ذرائع ابلاغ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔مثلاً:

فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ
پھر پلٹ کر دیکھو، کہیں تمھیں کوئی خلل نظر آتا ہے؟ (الملک:۳)

جہاں تک عملی ذرائع کا تعلق ہے، اس پر قرآن نے بہت زور دیا ہے۔ کیونکہ ابلاغ کا یہ سب سے مضبوط ذریعہ ہے۔ اپنے عمل سے انسان جتنا مضبوط ابلاغ کرسکتا ہے اُتنا نہ زبان سے کرسکتا ہے نہ تحریر سے کرسکتا ہے۔ اسی لیے قرآن نے بار بار عمل کی بات کی:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰہِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ
اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو۔ اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں۔ (الصّف:۲-۳)

اور دیکھیں جنابِ رسول اللہ ﷺ نے خود اپنے عمل کو ہمارے لیے نمونہ بنایا۔ جتنے بھی طریقے آپ ﷺ نے ارشاد فرمائے اُس پر عمل کرکے دکھایا۔ مثال کے طور پر نماز کے متعلق فرمایا کہ صَلُّوْا کَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ (ایسے نماز پڑھو، جیسے مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو۔ بخاری)، یہ Practical کرکے بتایا۔ ہم میں سے زیادہ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے practical کے ذریعے نماز سیکھی ہے۔ دینِ اسلام کی عبادات اور دیگر احکام کا اکثر حصہ اُمّت نے practical (تعامل) کے ذریعہ سیکھا ہے۔ گویا دین کی حفاظت کا اصل ذریعہ تعاملِ اُمّت (practice) ہے۔ اس طریقہ ابلاغ کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کفار مکہ کو اپنے سچے اور دین کے حق ہونے کی جو دلیل دی وہ یہ تھی کہ تم میرا عمل دیکھ کر اندازہ لگالو کہ میں نے تمہارے اندر رہ کر زندگی گزاری ہے۔ قرآن مجید نے اس کو یوں بیان کیا ہے:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْکُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِہٖ
آخر اس سے پہلے میں ایک عمر تمہارے درمیان گزار چکا ہوں، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔ (یونس:۱۶)

یعنی یہ سب سے مضبوط ذریعہ ابلاغ ہے۔ اسی طرح تحریری ذرائع کی بھی اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں بہت زیادہ اہمیت بیان فرمائی ہے۔ مثلاً:

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ

ن، قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جسے لکھنے والے لکھ رہے ہیں۔ (القلم:۱)

اس کے علاوہ بھی بہت ساری آیات ہیں۔

ابلاغ کی اقسام

نوعیت کے اعتبار سے ابلاغ کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ بعض اوقات ابلاغ انتہائی محدود ہوتا ہے، جبکہ کئی مرتبہ اس میں بہت وسعت ہوتی ہے۔ مثلاً ابلاغ کی ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ انسان کا خود سے ابلاغ ہو۔ قرآن مجید میں اپنے آپ سے ابلاغ کی کئی مثالیں ہیں۔ مثلاً جب قابیل کو بھائی کی لاش چھپانے کا طریقہ نہ سوجھا تو اُس نے کوے کو دیکھا جو مردہ کوے کو قبر کھود کر دفن کر رہا تھا۔ اُس وقت وہ اپنے آپ سے بولا:

اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَأُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ

افسوس مجھ پر! میں اس کوّے جیسا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپانے کی تدبیر نکال لیتا۔
(المائدہ:۳۱)

حضرت مریمؑ نے اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہا:

يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا

(وہ کہنے لگی) کاش! میں اس سے پہلے ہی مر جاتی اور میرا نام ونشان نہ رہتا۔ (مریم:۲۳)

قیامت کے روز نافرمان لوگوں کی کھالیں اور دیگر اعضاء خود ان کے خلاف گواہی دیں گے تو انسان انہیں کہے گا کہ تم ہمارے ہی خلاف کیوں گواہی دے رہے ہو:

وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا

وہ (اپنے جسم کی کھالوں سے) کہیں گے تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟
(حم السجدہ:۲۱)

خود سے ابلاغ کی بہت سی مثالیں تصوّف کے میدان میں بھی ملتی ہیں، مثلاً مراقبہ یا غور وفکر۔

انفرادی ابلاغ

انفرادی سطح پر دو افراد کے درمیان یا چند افراد کے درمیان گفتگو کی صورت میں ابلاغ ہوتا ہے۔ پہلے یہ صرف اسی صورت میں ہوسکتا تھا جب لوگ جسمانی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ میں ہوں، لیکن اب ٹیکنالوجی کی ترقی نے فاصلوں کو عملاً غیر متعلق کر دیا ہے، چنانچہ آپ اپنے موبائل فون کے ذریعہ سے ہزاروں میل دور بیٹھے افراد سے کسی بھی وقت رابطہ کر لیتے ہیں۔ ٹیکنالوجی کے ذریعہ انسان اس ابلاغی عمل کو زیادہ سے زیادہ تیز رفتار اور مؤثر بنانے کی کوشش کر رہا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ آج تدریس کی دنیا میں ابلاغ کے لیے ٹیکنالوجی کا استعمال غیر معمولی طور پر بڑھ چکا ہے۔

کثیر گروہی ابلاغ

بہت سے افراد کے ساتھ خطاب یا ان کے ساتھ مکاتبت وغیرہ کثیر گروہی ابلاغ کہلائے گا۔ قرآن میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً قرآن میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ

اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔

(آل عمران:۶۴)

یہ کثیر گروہی ابلاغ ہے۔ اسی طرح کثیر گروہی ابلاغ کی ایک مثال قرآنِ مجید میں حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعے میں ہے، جب وہ قافلہ نکلتا ہے تو آواز لگا تا ہے:

ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ

پھر ایک پکارنے والے نے پکار کر کہا ''اے قافلے والو! تم لوگ چور ہو۔ (یوسف:۷۰)

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وہ حدیث بھی اس کی مثال ہے کہ جب لوگ جلدی جلدی اپنے پاؤں دھو رہے تھے، آپ ﷺ نے دیکھا کہ ایڑیاں خشک رہ گئی ہیں تو ارشاد فرمایا:

فَنَادٰى بِأَعْلٰى صَوْتِهٖ وَيْلٌ لِّلْاَعْقَابِ مِنَ النَّارِ

پھر بلند آواز سے پکارا خشک ایڑی والوں کے لیے آگ میں ایک گھاٹی ہے۔ (بخاری)

یعنی کثیر گروہی ابلاغ کا طریقہ بھی اس میں ہے۔ کمرۂ جماعت میں تدریس کا عمل کثیر گروہی ابلاغ کی ایک روزمرہ مثال ہے۔امام بخاریؒ نے اس روایت پر باب بھی قائم کیا ہے کہ جب تمہارے بہت سارے طالب علم ہوں اور وہ علم کی بات کررہے ہوں تو بلند آواز سے کرنا جائز ہے۔ بخاری نے کتاب العلم میں اس طرح کی مثالیں بیان فرمائی ہیں اوراس فن میں بہت سارے موضوعات قائم کیے ہیں۔ دورِ حاضر میں تدریس کے دوران ابلاغ کو مؤثر بنانے کے لیے بہت سے سمعی و بصری آلات دستیاب ہوگئے ہیں، جنہیں کلاس روم میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

تعلیمی ابلاغ

ابلاغ کے لیے بالعموم اور تعلیمی ابلاغ کے لیے بالخصوص انسانی نفسیات کا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہے۔سامعین وطلبہ کی نفسیات کا لحاظ رکھا جائے گا تو ابلاغ کارگر اور مؤثر ہوگا۔ بصورتِ دیگر ابلاغ کمزور ہوگا، بلکہ اُلٹا ردّعمل بھی ہوسکتا ہے۔قرآن وحدیث میں ابلاغ کے لیے تعلیمی نفسیات کا لحاظ رکھنے کے بہت سے نظائر ملتے ہیں، جن میں سے چند ایک حسبِ ذیل ہیں۔

آسانی کا خیال رکھنا: امام بخاریؒ نے سیدنا انس بن مالکؓ سے مروی روایت درج کی ہے: **یَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا** (آسانی پیدا کرو مشکل میں نہ ڈالو)، یہ حدیث اسی باب میں امام بخاریؒ نے بیان فرمائی ہے کہ دوسروں کی آسانی کا خیال رکھنا ہے۔اسی طرح ہر فرد کے جو شخصی اوصاف ہیں، یا جو شخصی خوبیاں یا خامیاں ہیں، یہ بھی انسان کی نفسیات کا حصہ ہیں۔اگر ان کا خیال رکھا جائے گا تو ابلاغ کامیاب ہوگا، پڑھائی کے دوران بھی یا گفتگو کے دوران بھی اگر ان چیزوں کا خیال نہیں رکھا جائے گا تو ابلاغ ناکام ہوجائے گا۔

موقع ومناسبت: صحیح بخاری میں ہی کتاب العلم میں اس کی کئی مثالیں ہیں کہ آپ ﷺ کے پاس ایک آدمی آتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کرتا ہے کہ **اَیُّ الْاِسْلَامِ اَفْضَلُ** (کون سا اسلام بہتر ہے؟)، تو آپؐ جواب میں یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ **مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَ**

یَـــدِہٖ (جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔ بخاری) پھر کوئی دوسرا آدمی آتا ہے، وہ یہی سوال کرتا ہے کہ اَیُّ الْاِسْلَامِ خَیْرٌ تو آپ ﷺ جواب میں ارشاد فرماتے ہیں: تُـطْعِمُ الطَّعَامَ وَ تُـقْرِءُ السَّلام (کھانا پیش کرنا سلام کرنا۔ بخاری)۔ایک موقع پر اسی طرح کے سوال کے جواب میں آپ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ اَلْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔ بخاری)۔ایک نوجوان نے خدمتِ اقدسؐ میں درخواست کی کہ مجھے نصیحت فرمائیں، اُس کی طبیعت میں غصہ تھا۔اس بات کو دیکھتے ہوئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ غصہ نہ کیا کرو۔ پھر اُس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ! مزید کوئی نصیحت، آپ ﷺ نے فرمایا کہ غصہ نہ کیا کرو۔ پھر اُس نے عرض کیا کہ مزید، تو آپ ﷺ نے تین دفعہ فرمایا غصہ نہ کیا کرو (بخاری)۔

ان مثالوں سے تعلیمی ابلاغ کا ایک اہم نکتہ ہمارے سامنے آتا ہے کہ طلبہ وسامعین کے حالات اور موقع کی مناسبت سے ابلاغ ہو تو وہ کارگر اور مفید ہوتا ہے۔ بے موقع بات عموماً ضائع ہوجاتی ہے یا نہایت کم کارگر و مفید ہوتی ہے، کبھی کبھار تو یہ سننے والوں میں ردّعمل کا سبب بن جاتی ہے۔

ذہنی استعداد کی رعایت: مؤثر تعلیمی ابلاغ کے لیے مخاطب کی ذہنی استعداد کی رعایت نہایت ضروری امر ہے۔ معروف اصول ہے کہ:

كَلِّمُوا لنَّاسَ عَلىٰ قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ

لوگوں سے اُن کی عقل کے مطابق بات کرو۔

ایک عام وسادہ انسان کے سامنے آپ بہت ٹیکنیکل بات کریں یا فلسفیانہ گفتگو کریں گے تو ممکن ہے کہ وہ بات سمجھنے کی بجائے مزید غلط فہمی کا شکار ہوجائے۔ اس لیے ذہنی استعداد (learning capacity) کا لحاظ نہایت ضروری ہے۔ دربارِ نبوّت میں بیک وقت پڑھے لکھے اور ان پڑھ اور حکمران اور عام بدّو سب ہی طرح کے لوگ بھی آتے تھے۔ آپ ﷺ اُن سب سے اُن کے حالات کے موافق رعایت فرماتے تھے۔ ایک بدّو نے آپؐ سے عرض کیا کہ میرے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا ہے جس کا رنگ بہت کالا ہے۔ حالانکہ نہ میں کالا ہوں، نہ میری بیوی کالی ہے، اس لیے میں نے اُس کو اپنا

بیٹا تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ آپ ﷺ نے اُس سے دریافت کیا کہ آپ کے پاس اونٹ ہیں؟ اثبات میں جواب ملنے پر آپؐ نے پوچھا کہ وہ کس رنگ کے ہیں؟ اُس نے کہا جی یہ زیادہ تر سرخ رنگ کے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا اچھا اُس میں کوئی کالا بھی ہے؟ اُس نے کہا، جی ہیں۔ وہ کس وجہ سے ہیں؟ آپؐ نے مزید استفسار فرمایا۔ اُس نے کہا، ممکن ہے کہ اُن اونٹوں کی نسل میں کوئی کالا جانور بھی رہا ہو، تو اس کی وجہ سے ہے۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: یہاں بھی تو یہ وجہ ہو سکتی ہے۔ اُس نے فوراً اُس بات کو تسلیم کر لیا۔ (بخاری) یعنی اُس کے مشغلے اور اُس کی استعداد کے مطابق آپ ﷺ نے ابلاغ فرمایا اور اُس کا فوراً اثر ہوا۔ اسی طرح اور بہت سی مثالیں قرآن و حدیث میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔

تدریج: اگر ابلاغ میں تدریج نہیں ہے تو وہ ابلاغ کارگر نہیں ہے۔ مثلاً حرمتِ خمر کے مسئلے کو ملاحظہ کیجیے۔ قرآنِ مجید میں پہلے یہ کہا گیا کہ شراب اور جوئے میں نقصان زیادہ اور فائدے کم ہیں:

> يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا
>
> پوچھتے ہیں: شراب اور جوئے کا کیا حکم ہے؟ کہو: ان دونوں چیزوں میں بڑی خرابی ہے، اگرچہ ان میں لوگوں کے لیے کچھ منافع بھی ہیں، مگر ان کا گناہ ان کے فائدے سے بہت زیادہ ہے۔ (البقرہ: ۲۱۹)

اگلے مرحلے میں فرما دیا کہ یہ شیطانی کام ہیں:

> يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ
>
> اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور پانسے، یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو، امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہوگی۔ (المائدہ: ۹۰)

یعنی پہلے مرحلے میں اُسے حرام نہیں قرار دیا۔ تدریج کی ایک اہم مثال حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ایک روایت ہے کہ ''شروع میں مختصر سورتیں نازل ہوئیں، جس میں لوگوں کو شوق اور ترغیب دی جاتی تھی۔ اگر پہلے ہی یہ احکام نازل ہو جاتے، مثلاً اگر کہا جاتا کہ شراب چھوڑ دو تو لوگ

شراب چھوڑنے سے انکاری ہو جاتے''۔اوراسی طرح اگر یہ کہا جاتا کہ زنا چھوڑ دو تو زنا چھوڑنے سے انکاری ہو جاتے ۔لیکن جب لوگ اسلام پر آ گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو منع فرمایا (السنن الکبری للنسائی)۔حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی یہ روایت ہے، آپ ﷺ نے اس کا اظہار فرمایا کہ ابھی تمہاری قوم کی اتنی استعداد نہیں ہے، مجھے خطرہ ہے کہ کہیں یہ واپس کفر میں نہ لوٹ جائیں۔اگر مجھے یہ خطرہ نہ ہوتا تو میں کعبہ کو گرا کر اُس کو دوبارہ ابراہیم علیہ السلام کی اساس پر قائم کرتا (لَوْلَا حَدَاثَةُ عَهْدِ قَوْمِكَ بِالْكُفْرِ لَنَقَضْتُ الْكَعْبَةَ وَلَجَعَلْتُهَا عَلٰى اَسَاسِ اِبْرَاهِيْمَ. صحیح مسلم)۔ اللہ کے نبیؐ نے اس کا اہتمام فرمایا: لَوْلَا اَن اَشُقَّ عَلٰى اُمَّتِيْ لَاَمَرْتُهُمْ بِالسِّوَاكِ عِنْدَ كُلِّ صَلٰوةٍ (ابن ماجۃ)، کہ اگر مجھے اپنی امت پر مشقت کا خوف نہ ہوتا تو میں ہر نماز کیساتھ مسواک کا حکم دیتا۔یعنی استعداد کی رعایت رسول اللہ ﷺ نے فرمائی ہے۔

اسی طرح اس میں ایک بہت اہم پہلو مخاطب کے جذبات اور اس کے احساسات کا لحاظ رکھنا ہے۔

کلمات کا استعمال:تعلیمی ابلاغ میں زبان و بیان کا بڑا کردار ہے۔حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت ہے کہ آپ ﷺ کا کلام فصلاً فصلاً ،یعنی الگ الگ جملوں میں ہوتا تھا (سنن ابی داود)۔مثلاً صیغے کیسے استعمال کیے جائیں۔ہم اپنی گفتگو میں 'تم' اور 'تو' کے صیغے بھی استعمال کرتے ہیں، اس کے بجائے جب 'آپ' کا صیغہ استعمال کرتے ہیں تو معاملہ بالکل مختلف ہوتا ہے ۔ان چیزوں کا خیال رکھنا بڑا ضروری ہے۔ بلکہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ قرآنِ مجید کو سات بولیوں میں نازل کیا گیا ہے: وَاُنْزِلَ الْقُرْآنَ عَلٰى سَبْعَةِ اَحْرُف (بخاری)۔یعنی لوگوں کی زبان اور اُن کی بولی کی رعایت اللہ تعالیٰ نے بھی کی۔اگر لوگوں کی زبان اور بولی کی رعایت نہیں کی جائے گی تو ابلاغ مؤثر نہیں ہوگا۔آپ ﷺ بھی اس کا خاص لحاظ فرماتے تھے۔خطیب بغدادی آپ ﷺ کا ایک واقعہ نقل کرتے ہیں۔حضرت کعب بن عاصم اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے،فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا،آپؐ فرمارہے تھے: لَيْسَ مِنْ امبِرّ امْصِيَامُ فِي امسَفَر ،یعنی حضور بعض

عرب کی طرز پر لام تعریف کی جگہ میم پڑھ لیتے تھے (سنن ابی داود) جب کہ خود آپؐ کے فصیح لہجے کے مطابق یوں ہونا چاہیے تھا کہ: لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ الصِّيَامُ فِي السَّفَرِ (یہ کوئی نیکی نہیں کہ سفر میں روزہ رکھا جائے۔)

یہ وہ چند بنیادی باتیں اور وہ بنیادی تصوّرات ہیں جن کو مدّنظر رکھا جائے گا تو ابلاغ جاندار، مضبوط اور مؤثر ہوگا۔ اَقُوْلُ قَوْلِيْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِيْ وَلَكُمْ۔

......حواشی......

۱۔ جب بدر کے موقعے پر مکہ سے قریش باہر نکلے تو وہ تھوڑی ہی دور آئے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کو اُس کی اطلاع مل گئی، وحی کے ذریعے نہیں، بلکہ عام دنیا کے طریقوں سے۔ یعنی آپؐ کا معلومات کے حصول کا نظام (میڈیا) اتنا تیز تھا۔ اور ایک موقع پر نہیں، کئی مواقع پر ایسا ہوا۔ رسول اللہ ﷺ کو پتہ ہوتا تھا کہ جو کفار ہمارے مقابلے میں نکلے ہیں ان کی تعداد کیا ہے، کس راستے سے یہ آ رہے ہیں، اور یہ کہ ان کے پاس کیا کیا ہتھیار ہیں۔ بڑی مشہور روایت ہے، مشرکین عرب کے قبیلے غطفان کے ایک اہم فرد نعیم بن مسعود مسلمان ہو گئے تھے لیکن ابھی لوگوں کو علم نہیں ہوا تھا۔ ان کا یہودی قبیلے بنو قریظہ سے ایک خاص تعلق تھا، وہ لوگ ان پر بھروسہ اور اعتماد کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی اجازت سے وہ ایک خفیہ سفارتی مشن پر گئے۔ یہود اور قریشِ مکہ کے مختلف گروہوں میں الگ الگ جا کر وہ ایسی باتیں کرتے تھے جس سے اسلام کے دشمنوں میں پھوٹ پڑ گئی۔

۲۔ ایک عمومی غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ چونکہ رسول اللہ ﷺ کا سب سے بڑا ذریعۂ علم و ابلاغ تو وحی تھا، اس لیے انہیں ابلاغ کے دنیاوی ذرائع استعمال ہی نہیں کرنے پڑے۔ حالانکہ سیرت کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آنحضورؐ نے اپنے دور میں موجود تمام ذرائع کو بھرپور طور پر استعمال کیا ہے۔ ہمارے لیے اس میں یہ سبق ہے کہ اپنے دور کے تمام ذرائع کو حتی الامکان مؤثر طور پر حق کے ابلاغ کے لیے استعمال کریں۔

مثالی تعلیمی ادارہ

مولانا حسین احمد

ہر مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ ہمارا دین مثالی ہے، ہمارا قرآن مثالی ہے، ہمارا پیغمبر مثالی ہے ان کی تعلیمات مثالی ہیں تو اس کتاب اور اللہ کے نبی کی تعلیمات کو آگے پھیلانے کے لیے جو ادارہ ہو وہ بھی ایک مثالی ادارہ ہونا چاہیے۔

ایک مثالی تعلیمی ادارہ ہم کس ادارے کو کہہ سکتے ہیں؟ کسی ادارے کے مثالی ہونے کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ جس مقصد کے لیے، جس ہدف تک پہنچنے کے لیے اس ادارے کا وجود عمل میں لایا گیا ہے، اُس مقصدِ وجود کو حاصل کرنے میں وہ کس حد تک کامیاب ہوتا ہے۔ اپنے اہداف تک پہنچنے میں وہ ادارہ پوری طرح کامیاب ہوتا ہے تو ہم یہ سمجھیں گے کہ وہ ادارہ مثالی تعلیمی ادارہ ہے۔ ظاہر ہے ایک دینی مدرسے کے وجود میں آنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ مسلم معاشرے کی ضروریات کو احسن انداز میں پورا کرے۔ عقائد، عبادات اور معاملات کی اصلاح اور ان کے اخلاق اور کردار کی درستگی معاشرے کی اوّلین ضرورت ہے؛ اور پھر اسلام کی آفاقی تعلیمات ناواقف مسلمانوں اور غیر مسلموں تک پہنچانے کے لیے رجال کار کی فراہمی بھی ایک دینی تعلیمی ادارے کا مقصد ہے۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ مدارس رجال سازی کے کارخانے ہیں۔ جب اس ادارے کا مقصد وجود یہ ٹھہرا کہ وہ رجال کار کو تیار کرے گا تو ظاہر ہے کہ اس ادارے کا مرکزی محور بھی طالبِ علم ہی ہوگا۔ اس ادارے کے اندر جو بھی کام ہو رہا ہو یا اہتمام ہو رہا ہو، چاہے بلڈنگ بن رہی ہو یا ملازمین کو رکھا جا رہا ہو یا وہاں اساتذہ کا تقرر کیا جا رہا ہو یا دیگر ضروریات پوری کی جا رہی ہوں، تو ان سب کا مقصد یہ ہو کہ طلبہ کو وہ ساری

ضروریات اور سہولیات فراہم کر دی جائیں جن کے ذریعے وہ اس ادارے میں اپنے مقصد کو حاصل کر سکیں۔تو کسی تعلیمی ادارے کے اندر جو سب سے بنیادی فرد ہے وہ طالب علم ہے۔ ہماری اس گفتگو میں بھی مرکزی محور طالب علم ہوگا کہ اس کے اندر وہ صلاحیتیں اور استعداد کیسے پیدا کی جا سکے گی جس سے وہ معاشرے کا ایک بہترین اور کارآمد فرد اور ہمارے دین متین کی تعلیمات کو عام کرنے والا اور دنیا کے اندر بہت اچھے طریقے سے اسلام کے پیغام کو پہنچانے والا بن سکے۔

کسی دینی تعلیمی ادارے کے اندر سب سے پہلی بات تو یہ پیش نظر رہنی چاہیے کہ اس ادارے کے طلبہ میں علمی رسوخ پیدا کیا جا سکے۔ یہ رسوخ اس طالب علم کو کیسے حاصل ہوگا، اس کے لیے ضرورت ہے ایک اچھے نصاب کی، ایک بہترین استاد کی، خوش گوار علمی ماحول کی؛ اور اس کے لیے ضروری ہے کہ استاد، نصاب اور ماحول کے ساتھ ساتھ طلبہ کی جو ضروریات ہیں ان کو پیش نظر رکھا جائے اور وہ ادارہ طالب علم کو یہ تمام ضروریات فراہم کرے۔

داخلے کا معیار

ان سب چیزوں سے پہلے اس ادارے میں طلبہ کے داخلے کے لیے ایک معیار مقرر ہو، تا کہ اس مدرسے کا جو نصاب ہے اس کے مطابق وہ تعلیم حاصل کر سکیں، اور جس طرح کی تربیت کرنا پیش نظر ہے ویسی تربیت کی جا سکے۔ اگر داخلے کا کوئی معیار مقرر نہیں ہوگا تو اس مقصد کو حاصل کرنے میں ناکامی اگر نہیں ہوگی تو دشواری ضرور ہوگی۔ وہ معیار تعلیم کے اعتبار سے بھی ہو سکتا ہے، عمر کے لحاظ سے بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً شہروں کے اندر کسی دینی مدرسے میں درسِ نظامی میں داخلے کے لیے معیار یہ مقرر ہو سکتا ہے کہ وہ طالب علم کم از کم میٹرک پاس ہو۔ دیہات اور قصبات میں یہ کم سے کم معیار مڈل مقرر کیا جا سکتا ہے۔ پھر مدرسے کا اپنا بھی ایک امتحان داخلہ (entry test) ہونا چاہیے اور اس معیار پر پورا اترنے والوں کو ہی داخل کیا جانا چاہیے۔ داخلے کے لیے کم از کم معیار مقرر کرنا ایک ضروری بات ہے۔ اس لیے کہ اگر مدرسے میں ہر آنے والے کو داخلہ دے دیا جائے، خواہ وہ جس معیار کا بھی ہو، تو ایک درجہ میں پڑھنے والے طلبہ کی عمر، سوچ، صلاحیت اور قابلیت میں بہت زیادہ فرق ہوگا۔ ایسی صورت میں

سارے طلبہ یکساں طور پر استاد سے مستفید نہیں ہوسکیں گے اور استاد کو بھی مشکل ہوگی کہ وہ ہر طالب علم کو کیسے پیش نظر رکھ کر اپنی گفتگو کرے، کس طرح وہ کتاب پڑھائے، کیوں کہ اس کے سامنے مختلف معیار کے لوگ ہیں۔ اس لیے کسی بھی معیاری تعلیمی ادارے کے لیے ضروری ہے کہ داخلے کا ایک معیار مقرر ہو۔ چاہے وہ حفظ کا داخلہ ہو یا درس نظامی کا داخلہ۔

نصاب

دوسری اہم چیز نصاب ہے۔ نصاب کے متعلق تو ظاہر ہے کہ ہم آزاد نہیں ہیں۔ جو مختلف مکاتب فکر کے مدارس ہیں ان کے اپنے اپنے وفاق بنے ہوئے ہیں ان کے بنے ہوئے نصاب ہیں جن کے ہم سب پابند ہیں کیوں کہ وفاق نے اسی نصاب کے مطابق امتحان لینے ہیں۔ لیکن یہ وفاق تمام درجات کا امتحان نہیں لیتے، اس لیے ہم غیر وفاقی درجات کے اندر مشاورت کے ساتھ مفید چیزیں داخل نصاب کر سکتے ہیں، وقت کے تقاضوں کو دیکھ کر ان کو پیش نظر رکھ کر، جو غیر وفاقی درجات ہیں ان میں کچھ تبدیلیاں کی جاسکتی ہیں۔ اسی طرح یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مقرر وقت میں اضافہ کر لیں۔ اگر اہلِ مدرسہ کی رائے میں وفاق کا نصاب ناقص یا غیر مکمل ہے تو مدارس اپنے نظام میں ایک سال کا اضافہ کر لیں اور جو کمی کوتاہی وہ سمجھتے ہیں اس ایک سال میں اس کو پورا کر لیں۔ وفاق جتنے بھی ہیں ان کی نصابی کمیٹیاں ہیں، ان کو تجاویز پیش کی جائیں اور کوشش کی جائے کہ جو بھی نصاب ہو وہ زیادہ سے زیادہ جاندار، وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ اور طلبہ کے لیے مفید ہو۔ نصاب میں جو ایک طرح کا جمود ہے وہ نہیں ہونا چاہیے۔ ضروری نہیں کہ سارا نصاب ہی بدل دیا جائے لیکن وفاق ہائے مدارس کے نصابوں کے اندر کچھ نہ کچھ تبدیلیاں ہوتی رہنی چاہییں، تبھی وہ نصاب وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوگا اور زیادہ سے زیادہ طلبہ کے لیے مفید ہوگا۔

ان مدارس کے اندر ایک قدر مشترک، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ایک عام کمزوری یہ ہے کہ یہاں عربی زبان و ادب کی طرف وہ توجہ نہیں ہے، جو ہونی چاہیے۔ درحقیقت عربی زبان کو سیکھنا ہماری ضرورت ہی نہیں ہماری عبادت کا حصہ ہے۔ قرآن کریم اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات عربی میں ہیں۔

اس لیے عربی ہمارے نصاب میں ایک لازمی حیثیت کی چیز ہونی چاہیے۔ بدقسمتی سے پہلے اس پر زیادہ توجہ نہیں تھی لیکن اب اس پر توجہ ہورہی ہے، ایسی نئی کتابیں ابتدائی درجات میں شامل کی جارہی ہیں جو عربی زبان بولنے اور لکھنے کی صلاحیت حاصل کرنے کے لیے مفید و معاون ثابت ہورہی ہیں، اس کی طرف اور بھی زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے، اس کے لیے ضرورت ہے علمی رسوخ کی اور بہترین استاد کی۔

استاد کا علمی رسوخ

استاد کے تقرر کے وقت سب سے پہلی چیز جو پیش نظر ہونی چاہیے وہ ہے اس کی علمی قابلیت اور رسوخ۔ ظاہر ہے جب علمی رسوخ ہوگا، صلاحیت ہوگی، قابلیت ہوگی تو وہ اپنا علم آگے طلبہ کی طرف منتقل کرسکے گا۔

یہ بات مناسب نہیں کہ ایک استاد کئی مضامین پڑھا رہا ہو اور اسے علمی رسوخ کسی ایک میں بھی حاصل نہ ہو۔ استاد، بطور خاص نئے فضلاء، کو اپنے لیے دو یا تین مضامین کو منتخب کرلینا چاہیے کہ وہ اس کے اندر تخصص اور امتیاز حاصل کریں اور ان ہی کی تدریس کریں۔ نصاب میں جو کتب شامل ہیں صرف ان کتابوں اور ان کی شروح پر اکتفا نہ کریں بلکہ اس علم کی جو قدیم اور جدید کتب ہیں، چاہے وہ اردو زبان میں ہیں یا عربی میں، ان سب کا مطالعہ کریں۔ اس سے خود ان کو اور اس سے زیادہ ان کے طلبہ کو فائدہ ہوگا۔ کیوں کہ جب استاد کو اپنے مضمون میں مہارت حاصل ہوگی تو وہ پوری بصیرت کے ساتھ اپنے طلبہ کو پڑھاسکیں گے۔ اساتذہ کو بھی اس کا اہتمام کرنا چاہیے اور مہتمم حضرات کو بھی اساتذہ کے لیے دو تین مضامین کا انتخاب کرکے اسی کے اندر انہیں آگے بڑھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس طرح مدارس کے اندر ہر فن کے بہترین مدرسین پیدا ہوں گے اور ان بہترین مدرسین سے طلبہ کو زیادہ اور بہتر فائدہ ہوگا۔

اساتذہ کے مراتب

ایک اہم چیز یہ ہے کہ اساتذہ کے مراتب طے کیے جائیں۔ ضروری نہیں ہے کہ جو استاد ایک ابتدائی کتاب بہت اچھی طرح پڑھا رہا ہے تو وہ بڑی کتابیں بھی اسی طرح پڑھا سکے۔ ہمارے ہاں ایک عمومی سوچ یہ ہوتی ہے کہ جو استاد تین سے چار سال ابتدائی درجات میں رہا ہے اس کو اب ثانوی درجات میں جانا چاہیے۔ اور اگر وہ ثانوی درجات میں ہے تو کچھ سال بعد اسے درجات علیا میں جانا چاہیے۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ استاد جو کچھ پڑھا رہا ہے اس میں اس کو پوری صلاحیت اور مہارت ہوتی ہے اور طلبہ کو بہت فائدہ ہوتا ہے لیکن اگر اسی استاد کو آگے کے درجات کی بڑی کتابیں دے دی جائیں تو طلبہ کو ویسا فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ اس لیے اساتذہ کے مراتب مقرر کیے جانے چاہییں کہ یہ اساتذہ ابتدائی کتب کے لیے، یہ درجات ثانویہ کے لیے اور یہ درجات علیا کے لیے مناسب استاد ہیں۔ خود اساتذہ کو بھی اصرار نہیں کرنا چاہیے۔ اسے دین کا کام سمجھ کر کرنا چاہیے اور طلبہ کو فائدہ پہنچانا ہی بنیادی مقصد ہونا چاہیے۔ اصل کام طلبہ میں استعداد پیدا کرنا ہے، چاہے وہ بڑی کتابوں کے اندر ہو یا چھوٹی کتابوں کے اندر۔

اساتذہ کی تربیت

اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اساتذہ تربیت یافتہ ہوں۔ بدقسمتی سے مدارس میں اس کی کمی ہے۔ طلبہ فارغ ہوتے ہیں اور اس کے بعد مدرسین لگ جاتے ہیں، سینئر اساتذہ کی جانب سے بھی ان کو کوئی قابل ذکر ہدایات نہیں ملتیں۔ مدرس ہو جانے کے بعد وہ خود بھی کوشش نہیں کرتے کہ وہ بزرگ اساتذہ کے تجربات سے فائدہ اٹھائیں، ان سے جا کر ملیں، ان کے پاس بیٹھیں اور ان سے پوچھیں کہ یہ کتاب کیسے پڑھانی چاہیے اور اس فن میں مہارت کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے۔ افسوس ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ مدارس کے اندر تربیت اساتذہ کے لیے کوئی مستقل انتظام نہیں ہے۔ ایک چیز چلی آ رہی ہے اسی پر اکتفا ہے۔ ہمیں اپنے حالات پر غور وفکر کرنا چاہیے، اپنی سوچ کے دروازے بند نہیں کر لینے چاہییں۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہمارے بزرگوں میں تو صلاحیت تھی، لیکن زمانہ گزر رہا ہے اور

ہر چیز کے اندر انحطاط آ رہا ہے۔اسی طرح صلاحیتوں میں بھی انحطاط آ رہا ہے۔وہ پہلے جیسی صلاحیتیں اور پہلے جیسی استعداد اب نہیں رہی۔ ہمارے بزرگوں نے اس چیز کی ضرورت محسوس نہیں کی لیکن آج کل ہمارے مدارس کی جو حالت ہے تو اس بات کی ضرورت ہے کہ مدارس میں تربیتِ اساتذہ کے لیے مستقل انتظام ہو۔طریقہ تدریس کیا ہونا چاہیے،طلبہ کی تربیت کس انداز سے کی جانی چاہیے اور کس علم وفن کو کس انداز سے پڑھانا چاہیے،اس کی بنیادی کتب کون کون سی ہیں،استاد کو کون کون سی چیزیں پیش نظر رکھنی چاہییں، وغیرہ۔علم حدیث،علم فقہ اور دیگر فنون کے ماہر اساتذہ اگر نئے مدرسین کے سامنے اپنے تجربات رکھیں گے تو یقیناً ان کو بہت فائدہ ہوگا اور ان نئے اساتذہ کی تدریس بہت زیادہ معیاری ہو جائے گی۔اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ استاد تربیت یافتہ ہو۔

اخلاص

اس کے ساتھ ساتھ استاد کا اخلاص بہت اہم ہے، جو کچھ وہ پڑھا رہا ہے اس کے ساتھ وہ بہت زیادہ مخلص ہو اور اس کی کوشش یہ ہو کہ جو کچھ مجھے آتا ہے اور جو کچھ میرے پاس علم ہے وہ میں کس طرح بہتر انداز میں طلبہ کی طرف منتقل کروں۔اگر تربیت نہیں بھی ہوگی اور یہ حرص ہوگی تو یہ حرص استاد کو بہت کچھ سمجھا دے گی۔جب اسے حرص ہوگی کہ میں کیسے زیادہ مؤثر انداز سے انتقال علم کرسکوں تو وہ جدید وسائلِ تعلیم اور طرق تدریس کے بارے میں جاننے کی خود کوشش کرے گا۔ایسے اساتذہ جو حریص ہوتے ہیں،طلبہ کو ان سے بہت زیادہ فائدہ ملتا ہے۔اور طلبہ کو عقیدت ومحبت بھی ایسے ہی استاد سے زیادہ ہوتی ہے۔

ایک بزرگ عالمِ دین سوات کے ایک دور دراز علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔منطق اور فلسفہ کے بڑے ماہر تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان سے کافی کام بھی لیا۔ان کے ایک شاگردِ خاص نے مجھے ان کا قصہ سنایا۔انہوں نے بتایا کہ جب ہم زیرِ تعلیم تھے تو مذکور عالمِ دین کے علاوہ بھی معروف مدرسین اور قابل لوگ اسی ادارے میں پڑھا رہے تھے۔لیکن طلبہ کی بہت زیادہ محبت وعقیدت مولانا ممدوح کے ساتھ تھی۔جن صاحب نے مجھے یہ واقعہ سنایا،ان کا کہنا تھا کہ وہ اپنے استاد کے ساتھ بے تکلف تھے اور

اسی بے تکلفی میں انہوں نے پوچھ لیا کہ مولانا یہ ادارے کے دیگر اساتذہ بھی تو اپنے اپنے علم اورفن کے اندر بڑی مہارت رکھتے ہیں لیکن طلبہ کی عقیدت آپ کے ساتھ کیوں ہے؟ کہتے ہیں کہ مولانا کچھ دیر خاموش رہے اور پھر مجھے کہا کہ مجھے اپنے اندر تو ایسی کوئی خاص بات نظر نہیں آتی، البتہ ایک بات ہے شاید یہ اس کا اثر ہو کہ میں اس بات پر بہت زیادہ حریص ہوا کرتا ہوں کہ جو کچھ میرے پاس ہے وہ طلبہ تک کیسے منتقل کر دوں۔ میں سبق تیار کر کے آتا ہوں تو یہ بات میرے سامنے ہوتی ہے کہ یہ کتاب یا یہ فن جس طرح مجھے سمجھ میں آیا ہے، بالکل اسی طرح میں طلبہ کی طرف کیسے منتقل کر دوں۔ میں یہی سوچتا رہتا ہوں- جب مطالعہ کرتا ہوں تب بھی، جب درس گاہ کی طرف آ رہا ہوتا ہوں تب بھی اور جب پڑھا رہا ہوتا ہوں تب بھی- کہ کس طرح سادہ اور دلنشین انداز میں سب طلبہ تک اپنی بات پہنچا سکوں۔ یہ ایک حرص ہے میرے اندر۔ شاید یہی وجہ ہے کہ طلبہ مجھ سے لگاؤ رکھتے ہیں ورنہ اس میں کوئی شک نہیں کہ دوسرے حضرات بہت زیادہ قابل ہیں۔

طلبہ کی ذہنی سطح کا لحاظ

اسی طرح استاد کو اپنے اسباق میں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ میں جن طلبہ کے ساتھ گفتگو کر رہا ہو وہ اس گفتگو کو کس حد تک سمجھ رہے ہیں۔ بالکل اس معروف قول کے موافق:

كَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰى قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ

لوگوں سے اُن کی عقل وفہم کے مطابق گفتگو کیا کرو۔

یعنی اس بات کا خیال رکھا جائے کہ ایسا نہ ہو جو بات میں کہہ رہا ہوں وہ مخاطبین کی عقل اور سمجھ سے بالا ہو۔ طلبہ کی استعداد اور صلاحیتوں کو پیش نظر رکھ کر ہی اپنے سبق میں علمی اصطلاحات و اطلاقات استعمال کرے تاکہ ہر بات ان کی سمجھ اور استعداد کے مطابق ہو۔ اسی طرح کتاب کو سمجھانے کے لیے جو تقریر ہو وہ بھی طلبہ کی استعداد کے مطابق ہو۔ مثلاً اگر طلبہ نحو میر پڑھنے کے لیے بیٹھے ہیں تو کافیہ تک کی تقریر ان کی سمجھ میں نہیں آئے گی، شرح جامی کی تقریر ان کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔

میرے علم میں ہے کوئی اٹھارہ بیس سال پہلے ایک بہت بڑے ماہر استاد کو ایک بڑے دار العلوم

میں نحو میر پڑھانے کے لیے دے دی گئی۔ انہوں نے بہت عرصہ بڑے درجے کے طلبہ کو پڑھایا تھا اور ان کی علمی سطح بہت بلند تھی۔ پھر جب انہیں نحو میر دی گئی تو وہ اس سطح پر نہیں آ سکے جو نحو میر کے طلبہ کی سطح ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نحو میر کی کلاس میں کافیہ اور شرح جامی کے طلبہ آ کر بیٹھنے لگے لیکن وہ کلاس نحو میر کے طلبہ کے لیے مفید ثابت نہیں ہوئی۔ اس لیے استاد کو اس بات کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے کہ اس کے سامنے طلبہ کس درجے کے ہیں اور کس استعداد کے حامل ہیں۔

طلبہ کی نفسیات

اسی طرح طلبہ کی نفسیات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ **تیسیر المنطق** کے مصنف مولانا عبداللہ گنگوہی کا ایک واقعہ میں نے پڑھا تھا کہ ان کو ایک مدرسہ میں مدرّس رکھا گیا اور پڑھانے کے لیے سُلّم دے دی گئی۔ انہوں نے طلبہ سے پوچھا کہ تفصیلی پڑھاؤں، لمبی تقریر کے ساتھ یا صرف کتاب ہی پڑھاؤں؟ طلبہ کا ایک مزاج ہوتا ہے، انہوں نے کہا تفصیل سے پڑھائیں۔ عبداللہ صاحب نے **سبحانہ ما اعظم شانہ** میں ہی کئی دن لگا دیے۔ پھر طلبہ سے پوچھا کہ کچھ سمجھ آیا یا نہیں۔ طلبہ نے بتایا کہ کچھ بھی پلے نہیں پڑا۔ پھر مولانا نے ان سے کہا اللہ کے بندو، میرے اندر جو استعداد پیدا ہوئی ہے وہ اس طرح پیدا ہوئی کہ میرے اساتذہ نے مجھے نفس کتاب سمجھائی ہے۔ پھر جب میں نفس کتاب سمجھ گیا تو دیگر تشریحات بھی سمجھنے کے قابل ہوا۔ لیکن اگر آپ نفس کتاب کو ہی نہیں سمجھیں گے تو طویل بحثیں آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ تب طلبہ کو یہ بات سمجھ آئی۔ اس کے بعد وہ طلبہ کی سطح کے مطابق پڑھانے لگے اور یوں طلبہ کو کتاب کی سمجھ آنا شروع ہوگئی۔ اس لیے استاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ طلبہ کی استعداد اور ان کی صلاحیت کو پیش نظر رکھے۔

رفتار میں توازن

ایک اور اہم چیز مقدار خواندگی کا لحاظ رکھنا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ سال کے شروع میں بہت لمبی لمبی تقریر یہ ہو رہی ہے اور ایک ایک سطر پر کئی کئی دن بحث ہو رہی ہوتی ہے پھر آخر میں صرف ورق

گردانی ہو رہی ہوتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ مقدار خواندگی مقرر ہو۔ اگر کسی مدرسے میں سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ امتحانی نظام مقرر ہے تو وہاں نصاب تقسیم ہو کہ کتاب سہ ماہی تک یہاں تک پہنچنی چاہیے، ششماہی تک یہاں اور سالانہ امتحان میں یہاں تک پہنچنی چاہیے۔ اور اگر کسی مدرسہ میں مثلاً ماہانہ امتحان ہوتا ہے تو وہاں ماہانہ مقدار خواندگی مقرر کر لی جائے۔ پھر اس کے بارے میں پوچھا بھی جائے۔ اس طرح سارے مدارس میں مقدار خواندگی مقرر ہو جائے گا تو پھر یہ نہیں ہوگا کہ ایک کتاب آدھی پڑھائی اور آدھی رہ گئی، ابتدائی اسباق بہت اچھے تھے لیکن آگے پھر صرف چل چلاؤ ہوا، ایسا نہیں ہوگا اور پوری کتاب پڑھانے میں ایک یکسانیت ہو جائے گی۔ اول تو یہ مدرسے کی ذمہ داری ہے، اگر مدرسہ مقرر نہیں کرتا تو استاد خود سال کے شروع میں مقدار خواندگی مقرر کر دے کہ مجھے کتاب فلاں امتحان تک فلاں جگہ تک پہنچانی ہے۔ اس کے لیے دن کتنے ہیں اور روزانہ کتنی مقدار پڑھاؤں تو وہاں تک پہنچ سکوں گا۔

سزا سے گریز

ایک اور اہم پہلو جس کی وجہ سے مدارس بہت بدنام ہیں وہ ہے مار پیٹ کا تصور۔ ظاہر ہے پڑھائی ہوتی ہے، استاد پوچھتا ہے اگر نہیں آتا تو سزا کا ایک تصور ہے۔ جس طرح جزا کا تصور ہے اسی طرح سزا کا بھی تصور ہے۔ لیکن موجودہ دور اس بات کا متقاضی ہے کہ مدارس میں مار پیٹ پر مکمل پابندی لگ جانی چاہیے۔ طلبہ کو پڑھنے پر مجبور کرنے کے اور بھی کئی طریقے ہو سکتے ہیں مار پیٹ ہی ایک طریقہ نہیں ہے۔ استاد اور طالب علم کے درمیان جو ربط اور تعلق ہو وہ انتہائی اخلاص، خیر خواہی، پیار اور محبت کا تعلق ہو۔ یہ نہ ہو کہ استاد سے طالب علم خوفزدہ ہوں اور خوف کی وجہ سے پڑھ رہے ہوں۔ بلکہ استاد ان کو ایسا ماحول فراہم کر دے اور ایسی محبت اور ترغیب دے دے کہ طلبہ پڑھنے پر مجبور ہو جائیں۔

مدرسہ سے وابستگی

ایک بات یہ بھی ضروری ہے کہ استاد مدرسے میں اپنے آپ کو ملازم نہ سمجھے بلکہ اپنے آپ کو

مدرسے کا ایک ذمہ دار فرد تصور کرے۔ اس لیے کہ اگر اس کے ذہن میں ملازم کا تصور ہوگا کہ میرا کام تو بس آنا اور پڑھا کر چلے جانا ہے، اس کے بعد طلبہ پڑھتے ہیں یا نہیں پڑھتے، یاد کرتے ہیں یا نہیں کرتے، اس سے مجھے غرض نہیں، تو اس طرح کے استاد سے طالب علم کو فائدہ نہیں ہوگا اور نہ ہی مدرسے کا نظام ایسے استاد سے مستحکم ہوگا۔ اس لیے کہ استاد اپنے آپ کو مدرسے میں صرف ملازم سمجھتا ہے اور صرف ملازم سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ کل اگر کسی مدرسے نے اسے یہاں سے زیادہ تنخواہ کی آفر کر دی تو وہ یہاں سے چھوڑ کر وہاں چلا جائے گا۔ اس لیے کہ اس نے اپنے آپ کو ملازم سمجھا ہوا ہے اور وہ اپنی خدمات کا معاوضہ لیتا ہے، تو جہاں اس کو معاوضہ زیادہ ملے گا وہ وہاں چلا جائے گا۔

اس بات میں کہ استاد اپنے آپ کو صرف ملازم نہ سمجھے، مہتمم کا کردار زیادہ اہم ہے۔ مہتمم استاد کی عزت نفس کا خیال رکھے، یہ بہت ضروری ہے۔ اگر مہتمم استاد کی عزت نفس کا خیال رکھے گا تو استاد بھی اپنے آپ کو ملازم نہیں سمجھے گا بلکہ خود کو ذمہ دار سمجھے گا، خوب دل لگا کر کام کرے گا اور خوب دل لگا کر پڑھائے گا۔ نیز پڑھانے کے علاوہ جو بھی ذمہ داری اس کو دی جائے گی اسے وہ دل و جان سے انجام دے گا۔ عزت نفس کے حوالے سے دو امور اہم ہیں، ایک تو یہ کہ مہتمم مدرسے کے معاملات میں اساتذہ کے ساتھ مشاورت کر لیا کرے، یہ بہت ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے گھر سے فیصلے کر کے آئے اور اساتذہ اور طلبہ پر ٹھونس دے۔ بلکہ جو کچھ بھی کرے اساتذہ سے مشورے کے ساتھ کرے۔ حضور ﷺ پر وحی اترتی تھی، وہاں سے رہنمائی بھی ملتی تھی، اس کے باوجود حکم ہے کہ "وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ" (معاملات میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا کرو)۔ اگر اس طرح سے ہو جائے تو پھر ایک مہتمم ایک ادارے کو چلانے میں مشورے کا بہت زیادہ محتاج ہوگا۔ اس کا بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ اساتذہ اس ادارے کو اپنا ادارہ سمجھیں گے اور خود کو ادارے کا صرف ملازم نہیں سمجھیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مہتمم اساتذہ کی ضروریات کا خیال بھی رکھے۔ اگر ضروریات کا خیال نہیں ہوگا تو ظاہر ہے کہ معاشی اعتبار سے ایک پریشان شخص دل لگا کر یکسوئی کے ساتھ کسی جگہ بھی کوئی کام نہیں کر سکتا۔ اگر مہتمم صاحب ان دو چیزوں کا خیال رکھیں، یعنی مشاورت اور ضروریات، تو اس سے استاد کے رویے میں بہت تبدیلی

آئے گی۔

علمی ماحول

تیسری چیز جو طالب علم کے اندر علمی رسوخ پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے وہ ہے ماحول۔طلبہ کو علمی ماحول فراہم کیا جائے، جو طالب علم کا مدرسے کے اندر وقت ہے اس وقت کو قیمتی بنا دیا جائے اور طالبِ علم کو اپنے پاس امانت سمجھ لیا جائے۔صرف پیسہ ہی امانت نہیں ہے طالب علم اور اس کا وقت بھی امانت ہے۔اس کے اوقات کی مناسب تقسیم ہو کہ یہ وقت اسباق کا ہے، یہ وقت تکرار کا اور یہ مطالعے کا ہے۔مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ایک ارشاد کہیں پڑھا کہ جو طالبِ علم مجھے تین چیزوں کی ضمانت دے کہ وہ سبق میں حاضر ہوگا، پڑھے ہوئے سبق کا تکرار کرے گا اور آئندہ کے سبق کے لیے مطالعہ کرے گا، تو میں لکھ کر دیتا ہوں کہ وہ عالم بنے گا اور اس میں صلاحیت ہوگی۔ مدرسہ میں یہ سب کام، یعنی اسباق کی ترتیب، تکرار اور مطالعہ کا انتظام اساتذہ کی نگرانی میں ہونا چاہیے۔خصوصاً مطالعے کا الگ وقت ملنا چاہیے اور مطالعہ بھی اساتذہ کی نگرانی میں ہو اور اساتذہ طلبہ کو مطالعے کا طریقہ بھی سکھائیں کہ دوران مطالعہ کون کون سی چیزیں پیش نظر رکھیں۔

یہ بھی ضروری ہے کہ مدرسے کا ماحول خالص علمی ہو اور وہاں کوئی دوسرا کام نہ ہو۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں سیاسی جلسے بھی طلبہ سے کامیاب کروائے جاتے ہیں، مدرسے کے اندر سیاسی بحثیں ہوتی ہیں اور سیاسی رسالے آتے ہیں۔ان سب چیزوں پر پابندی لگائی جانی چاہیے اور انہیں صرف پڑھنے میں مشغول رکھا جائے۔زندہ باد مردہ باد کے نعروں اور ہر طرح کی سیاست سے انہیں دور رکھا جائے۔ سیاست دینی مدرسے کے اندر بالکل شجر ممنوعہ ہو، علمی ماحول کے لیے یہ بہت ہی مضر چیز ہے۔

اسی طرح مدرسے میں فرقہ وارانہ اختلافی مسائل سے طلبہ کو دور رکھا جائے۔صرف طلبہ کی بحث پر پابندی نہ ہو بلکہ دوران تدریس بھی جو ایسے مسائل ہیں جن پر کفر و اسلام کا دار و مدار نہیں ان میں احتیاط کی جائے اور طلبہ کو بھی بتایا جائے کہ یہ مسائل صرف درسگاہ تک ہی محدود رکھیں اور بعد میں ان پر بحث مباحثے نہ کریں۔طلبہ کے درمیان فرقے اور گروپس نہ بنیں ورنہ علمی ماحول تباہ ہو جائے گا۔

علمی ماحول کے لیے ایک اور تباہ کن چیز موبائل فون ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ اس پر پابندی ہونی چاہیے۔ اگرچہ مجھے یہ بھی احساس ہے کہ مکمل پابندی مشکل ہوگی، بہرحال اس بات کی کوشش کریں کہ طلبہ موبائل کا استعمال بقدرِ ضرورت کریں، فضولیات سے بچیں۔ بطورِ خاص کیمرے والا موبائل نوجوان نسل کے لیے بہت بڑی مصیبت اور زہر ہے۔ اس پر سخت پابندی ہونی چاہیے۔ بغیر کیمرے کا موبائل بھی بوقت ضرورت ہی استعمال کریں، اور وہ بھی مخصوص اوقات میں۔ کلاس اور درسگاہ میں اس پر بھی پابندی ہونی چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ سبق چل رہا ہو اور طالب علم موبائل کے ساتھ مصروف ہو۔ یہ چیز طلبہ اور علمی ماحول کے لیے بہت ہی تباہ کن ہے۔ بہت سارے عصری تعلیمی اداروں میں موبائل فون پر قطعی پابندی عائد ہے۔ اگر عصری تعلیمی اداروں میں پابندی لگائی جاسکتی ہے تو مدارس میں کیوں نہیں۔

طلبہ کی ضروریات

مدارس میں طلبہ کی ضروریات کا خاص خیال رکھا جانا چاہیے۔ رہائش صاف ستھری، ہوادار اور اعلیٰ ہو۔ اگر یہ طالب علم کو میسر ہوگی تو یقینی بات ہے کہ اس سے اس کی تعلیم میں یکسوئی، بہتری اور ترغیب ہوگی۔ ماضی میں تو حصولِ علم کے لیے طرح طرح کی مشقتیں برداشت کرنی پڑتی تھیں، لیکن اب ماحول اس قدر بدل گیا ہے کہ اگر ہم طلبہ کی ضروریات کا لحاظ نہیں رکھیں تو یہ یکسوئی کے ساتھ تعلیم جاری نہیں رکھ سکیں گے۔ اسی طرح ان کی خوراک کا خیال رکھا جائے کہ ان کو معیاری خوراک میسر ہو۔

مدارس میں معیارِ تعلیم کو بہتر بنانے پر ہمیشہ اور ہر پہلو سے مسلسل توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً یہ ضروری نہیں کہ بہت زیادہ طلبہ کو داخل کیا جائے، پھر جہاں ایک کمرے میں دس کی گنجائش ہو وہاں بیس طلبہ کو رکھا جائے۔ اگر مدرسے کی عمارت میں سو کی گنجائش ہے تو سو طلبہ ہی رکھے جائیں۔ ہماری نظر کمیت پر نہیں کیفیت پر ہونی چاہیے۔ طلبہ کی تعداد کیا ہے؟ یہ کوئی اہم چیز نہیں، لیکن جو طلبہ مدرسے میں پڑھ رہے ہیں ان کا معیار کیا ہے؟ ان کی تربیت کیسے ہو رہی ہے؟ یہ زیادہ اہم ہے۔ مدرسے کے اندر رہائش اور خوراک کی جتنی گنجائش ہے، اس سے زیادہ طلبہ کو داخل نہیں کرنا چاہیے، اس

سے مدرسے کا معیار متاثر ہوتا ہے۔

طلبہ کو کھیل کود کی سہولت بھی حاصل ہونی چاہیے۔ ہمارے مدارس میں اس بات کا تصور ہی نہیں ہے کہ مدرسہ بنایا جائے تو اس میں کھیل کا میدان بھی ہو۔ یہاں ایسے کھیل کھیلنے کی ترغیب دی جائے جو طلبہ کی صحت کے لیے مفید ہوں، جیسے فٹبال، والی بال، ہاکی وغیرہ۔ کرکٹ کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے تو بہتر ہے۔ تاہم یہ میری ذاتی رائے ہے، آپ اس سے اختلاف کر سکتے ہیں۔

مدرسے میں علمی ماحول کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ایک کتب خانہ اور لائبریری ہو اور طلبہ بھی اسے استعمال کر سکیں۔ اکثر مدارس میں بہت اچھی لائبریریاں ہوتی ہیں لیکن ان کا مؤثر استعمال نہیں ہوتا۔ کوئی ایسا نظام بنایا جائے کہ لائبریری اور مکتبہ صبح سے لے کر عشاء تک کھلے ہوں، تاکہ کھیل اور تکرار کے اوقات کے علاوہ اگر طلبہ ان سے استفادہ کرنا چاہیں تو کر سکیں۔ یہ علمی ماحول کی ترقی کے لیے انتہائی مفید ہے۔

تربیت کا اہتمام

ایک اور چیز جو طلبہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ضروری ہے وہ ہے تربیت۔ اگر صرف تعلیم ہو، تربیت نہ ہو، تو ہم اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں کسی صورت کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ طلبہ کی صورت کے ساتھ ساتھ ان کی سیرت سازی کی طرف بھی توجہ دی جانی چاہیے۔ مدرسے میں اساتذہ کے اصلاحی بیانات کا سلسلہ ہو۔ صرف سبق اور اس کے اندر چند نصیحت آمیز باتوں پر اکتفا نہ کیا جائے، مستقل تربیت بھی ضروری ہے۔ ہفتہ وار، بیس دنوں میں یا کم از کم ایک ماہ میں کسی بڑے استاد کا اصلاحی بیان ہو یا کسی اور نوعیت کی اصلاحی مجالس کا انعقاد کریں، ان مجالس میں شرکت لازمی نہ ہو لیکن ترغیب دلائی جائے۔ اس کے اثرات بھی بہت گہرے ہوتے ہیں۔

تربیت کے حوالے سے یہ بھی اہم ہے کہ ہم طلبہ کے ذہن میں یہ بات بٹھا دیں کہ آپ پر اللہ کا بہت کرم اور احسان ہے کہ اللہ نے آپ کو اپنی کتاب اور اپنے رسول ﷺ کی تعلیمات کو سیکھنے کے لیے

منتخب کیا ہے۔ اگر ان میں یہ دینی جذبہ نہ ہو تو وہ دنیاوی اعتبار سے احساسِ کمتری میں مبتلا ہو سکتے ہیں، یا دینی تعلیم ہی سے متنفر ہو سکتے ہیں۔ ہم نے ایسی مثالیں دیکھی ہیں۔ اس لیے بہت ضروری ہے کہ ہم طلبہ کے دل و دماغ میں یہ بات بٹھا دیں اور دینی کام کا جذبہ ان کے دلوں میں پیدا کریں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ طلبہ کو بات چیت، گفتگو اور تقریر کرنے کا طریقہ بھی سکھایا جائے۔ نیز عمدہ تحریریں لکھنے کی تربیت بھی دی جائے۔ اس حوالے سے مدارس میں انجمنوں (بزم ادب) کا ایک سلسلہ ہوتا ہے، اس کو فعال ہونا چاہیے۔

عصری تقاضوں کا ادراک

ایک اور اہم اور ضروری بات یہ ہے کہ عصری تقاضوں کا ادراک اور ان سے آگاہی مدارس کی بہت بڑی ضرورت ہے۔ ہمارے مدارس کے نصاب میں آج بھی منطق اور فلسفہ شامل ہیں۔ حالانکہ ان میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو ہمارے مسلّمہ دینی عقائد کے خلاف ہیں جن میں قدم عالم کا تصور اور عقول عشرہ کی بحث قابل ذکر ہے۔ اس وقت ان چیزوں کو بوجہ ضرورت داخل نصاب کیا گیا تو آج کی ضرورت کی چیزیں کیوں داخل نصاب نہیں ہو سکتیں اور ہم انہیں شجرِ ممنوعہ کیوں سمجھتے ہیں۔ آج کے تقاضوں کے مطابق ہم اپنے مدارس میں انگریزی کیوں نہیں پڑھا سکتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عربی میں مہارت ہمارے لیے عبادت ہے لیکن اس وقت انگریزی کو پڑھنا، سمجھنا اور اس میں مہارت حاصل کرنا وقت کی ضرورت ہے۔ ہم اگر وہ چیزیں پڑھا سکتے ہیں تو انگریزی بھی پڑھا سکتے ہیں۔ اسی طرح طلبہ کو انفارمیشن ٹیکنالوجی سے متعارف کرانے کی بھی ضرورت ہے۔ مدارس کے پاس عموماً اتنے وسائل ہوتے ہیں کہ یہ ساری چیزیں کرائی جا سکیں۔ اسی طرح معاشیات اور تقابلِ ادیان کی تعلیم کا اہتمام، خصوصاً تخصص کے طلبہ کے لیے۔ چونکہ دار الافتا میں مختلف مسائل معاشیات اور قانونی نوعیت کے آتے ہیں، اس لیے یہ چیزیں اگر ابتدائی درجات میں نہیں تو کم از کم تخصص کے درجات میں لازمی پڑھائی جانی چاہییں۔

نئے زمانے کے نئے تقاضوں کے ضمن ہی میں ایک اور اہم چیز یہ ہے کہ جدید علم کلام کو مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ جو پڑھایا جارہا ہے وہ قدیم ہے، اب نئے دور کے نئے نئے فتنے ہیں، نئے نئے عقائد وخیالات ہیں اس لیے جدید علم کلام مرتب کیا جانا چاہیے۔

آخری بات یہ کہ طلبہ کا باقاعدہ تعلیمی ریکارڈ ہونا چاہیے۔ طلبہ کے داخلے سے لے کر فراغت تک اور ہر سال اس کی کارکردگی کا مکمل ریکارڈ موجود ہو۔ اسی طرح مالیات کے معاملات ہیں، مدرسے کی آمد وخرچ کا بھی ایک تفصیلی ریکارڈ ہونا چاہیے۔

گفتگو کے خلاصے کے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مدرسہ کی مرکزی شخصیت ''طالبِ علم'' ہے۔ مدرسہ کے نظام میں مرکزی اہمیت اس بات کو حاصل ہونی چاہیے کہ طالبِ علم مدرسے کے اندر کس طرح معیاری تعلیم، معیاری ماحول اور معیاری تربیت حاصل کرسکیں گے کہ وہ مدرسے سے نکل کر مسلمانوں کے لیے بھی اور غیر مسلموں کے لیے بھی مفید فرد ثابت ہوں۔ اللہ کرے کہ ہم مقاصد تعلیم میں ان چیزوں کو پیش نظر رکھ کر اپنے مدارس کو زیادہ سے زیادہ معیاری بناسکیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

حصہ دوم

مخصوص رہنمائی

بلحاظ مضامین

تدریسِ حدیث

مولانا محمد رفیق شنواری

ا۔ علمِ حدیث: ضرورت اور اہمیت

علمی دنیا میں ایک رواج چلا آتا ہے اور فطرت بھی ہے کہ ہر علم وفن سے پہلے اس علم وفن کی ضرورت واہمیت پر گفتگو کی جاتی ہے۔ اسی طرح یہ بھی ایک فطری قانون ہے کہ جس علم میں جتنی پختگی ہوگی اس سے اس قدر مطلوب اہداف ومقاصد بآسانی حاصل ہونگے۔ دوسری جانب اگر کسی علم وفن میں انحطاط رونما ہوتو اس سے وابستہ مقاصد واہداف کے حصول میں مشکل پیش ہوگی اور اس طرح اس علم کی ضرورت واہمیت بدیہی سے محض نظری ہوجاتی ہے۔ چنانچہ اس پر گفتگو بسا اوقات محض الفاظ و حروف کے نقوش تک محدود ہوجاتی ہے اور قلب ودماغ میں اس کا احساس نہیں ہو پاتا۔

اس فطری قانون پر اگر علم حدیث کی ضرورت واہمیت پر غور کیا جائے تو اس بارے میں کوئی شک نہیں کہ اولاً حدیث نبوی ﷺ قرآنِ کریم کی مستندترین اور اولین شرح ہے جو اس کے مفاہیم کو بتاتی اور اس کے احکام کی حد بندی کرتی ہے۔ دوسرا یہ کہ حدیث قرآن کریم کی ایک تطبیقی شرح وتفسیر ہے۔ یعنی قرآن مجید کے مختلف احکامات کو جزوی تفصیلات کے ساتھ عملی طور پر واضح کرتی ہے۔ تیسرا یہ کہ حدیث نبوی کے اندر انسانی زندگی کی تشکیل وتعمیر کا نظام ملتا ہے۔ چنانچہ انسانی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں رہتا جس سے علم حدیث کا تعلق نہ ہو۔ حدیث نبوی ﷺ کا ایک بہت بڑا کردار انسان کی نجی، اجتماعی، معاشی، معاشرتی اور روحانی زندگی وغیرہ میں راہنمائی اور اس کے اخلاق وکردار کی اصلاح ہے۔ آپ ﷺ کی سیرت کا بھی مستندترین ذریعہ حدیث کو قرار دیا جاسکتا ہے، اور حدیث کے حوالے

سے ہی ہم رسول اللہ ﷺ کو اُسوۂ حسنہ بنا سکتے ہیں۔

اس تناظر میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ تعلیم حدیث محض ایک نظری علم نہیں ہے بلکہ تطبیقی ہے، یعنی اس کے ذریعہ پڑھنے والے کو پتہ چلے کہ کون سا مسئلہ کہاں اور کیسے منطبق ہوگا۔ چنانچہ تدریس حدیث کا ایک اہم مقصد، جو استاذ حدیث کی ایک بنیادی ذمہ داری بھی ہے، یہ ہے کہ طلبہ کو زندگی کے تمام پہلوؤں میں جنم لینے والے مسائل اور عصرِ حاضر کے تقاضوں کے نشاندہی کے ساتھ موقع بموقع بتایا جائے کہ فلاں حدیث کس طرح عصر حاضر کے فلاں مسئلے میں رہنمائی دے رہی ہے۔

حدیث کی ضرورت اور اہمیت اگر اس انداز سے بتلائی جاتی رہے اور اس کو الفاظ وحروف کے نقوش سے آگے لے جا کر طلبہ کے ذہنوں اور دلوں میں بٹھایا جائے تو حدیث کی کتابیں محض تلاوت کے لیے نہیں رہیں گی اور نہ علم حدیث منطق وفلسفے کی طرح محض نظری علم ہوگا۔ بلکہ یہ ایک اطلاقی اور تطبیقی علم ہوگا اور اس فکر کیساتھ احادیث کا پڑھنا اور مطالعہ کرنا صحبت نبوی ﷺ کے مترادف ہوگا۔ اس حوالہ سے تدریسِ حدیث کے دوران استاد کو درج ذیل پہلوؤں کو پیش نظر رکھنا اور طالب علم تک منتقل کرنا ضروری ہے۔ا

۲۔ حدیث بطور ماخذِ شریعت

شریعتِ اسلامی کی تفہیم اور اس کی روشنی میں قانون سازی کے لیے ماخذِ اول قرآن کریم ہے۔ تشریع اور قانون سازی کے کسی بھی مرحلے میں قرآن مجید کا درجہ اولین ہوگا۔ تاہم قرآن مجید کے ساتھ دوسرا ماٗخذ ومصدر حدیث رسول ﷺ ہے۔ لیکن سنتِ نبوی کس طرح قرآنِ مجید کے ساتھ ماخذِ شریعت ہے؟ قرآن مجید کے ساتھ اس کی کیا حیثیت ہے؟ ماخذ ومصدر ہونے میں اس کا دائرہ کس حد تک ہے؟ ان امور کی تفصیلات اور اس باب میں اہلِ علم کے یہاں طے شدہ اصول وقواعد سے تفصیلی آگاہی فراہم کرنا بھی تدریس حدیث کی ذمہ داریوں میں شامل ہیں۔

یعنی استاذِ حدیث اولاً احکام دینے میں قرآنی اسلوب کو سمجھائیں کہ قرآن مجید بنیادی اور اوّلین

ماخذ ہے، لیکن تمام احکامِ شرعیہ جزوی تفصیلات کے ساتھ بیان کرنے کا التزام نہیں کرتا۔ پھر اس کے بعد سنت کا طرزِ عمل بیان کریں کہ سنت ایک عام مفہوم میں قرآن کی تفسیر ہے اور قرآنی احکام کی عملی اور تطبیقی شرح ہے۔ قرآن کے دیے ہوئے ضابطۂ حیات کی تکمیل وتشکیل کرتی ہے۔ اس کے بعد علمی تناظر میں سنت کی حیثیت اور اس کے مقام کو واضح کیا جائے۔ یعنی یہ مباحث کہ نبی کریم ﷺ کو تشریعی اختیارات دیے جانے کے بعد قرآن کے ساتھ سنت کی کیا حیثیت ٹھہرتی ہے۔ جب یہ دونوں (قرآن وسنت) ہی اسلامی قوانین اور شرعی احکام کے لیے مستقل اور بنیادی مصدر و ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں تو قانون سازی اور احکام دینے میں دونوں کا آپس میں تعلق کس نوعیت کا ہے۔ اور کیا اس تعلق کا احکام پر کوئی اثر پڑ سکتا ہے۔ اس مسئلے کی حساسیت اور اہمیت کا اندازہ پاکستان کی اعلیٰ عدلیہ کے اس فیصلے میں اٹھائے سوالات سے بھی لگایا جا سکتا ہے جس کے متعلقہ حصوں کا ترجمہ فراہم کرتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اس کا جواب دیا ہے۔[۱] جس میں فاضل جج نے بارہا نبی کریم ﷺ کی عقیدت ومحبت کے اظہار کے ساتھ ساتھ قرآن اور خدا کے مقابل آپؐ کی اطاعت کا سوال اٹھایا ہے۔ موصوف نے احادیث کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ''اسلام کی رو سے ایک مسلمان پر زندگی کے تمام شعبوں میں صرف اور صرف ''خدا کا قانون'' لاگو ہے۔ قانون ہی چونکہ اس انسانی آزادی پر بندش لگاتا ہے اسی لیے خدا نے بندشیں لگانے یعنی قانون سازی کا اختیار صرف اپنے پاس رکھا ہے۔ قرآن کے کسی حکم کو بجالانے میں نبی کریم ﷺ کا طریقہ اپنایا جائے گا۔ جہاں قرآن ساکت ہے وہاں اجتہاد کے بغیر محض سنت پر عمل کرنا درست نہیں۔ کیوں کہ اسلام کا عقیدہ ایک انسان کی دوسرے انسانوں پر برتری کی نفی کرتا ہے اور وہ اجتماعی فکر وعمل کی راہ دکھاتا ہے۔ انسانی زندگی مسلسل تغیر پذیر ہے جس میں بے لچک اور ناقابلِ تبدل قوانین نہیں چل سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن بسا اوقات عام قاعدے اور کلیات دیتا ہے''۔[۲]

اگرچہ علماء کی مسلسل اور مؤثر محنت کے نتیجے میں یہ فکر بڑی حد تک پسپا ہوگئی تھی لیکن حالیہ عرصہ میں دیگر فتنوں کے ساتھ ساتھ اس فکر کا احیا بھی نظر آرہا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اساتذہ کرام اس

امر کی توضیح کی کوشش کریں کہ قرآن مجید منصب نبوت اور اس کے فرائض کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ثبوت اور معنی کے اعتبار سے حدیث کی مختلف اقسام بتلائیں اور واضح کریں کہ اس تقسیم کا احادیث سے مستنبط احکام پر کیا اثر پڑتا ہے۔

نیز اساتذہ کرام اس امر کی توضیح کی بھی کوشش کریں کہ قرآن مجید منصب نبوت اور اس کے فرائض کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ اس کے ساتھ ثبوت اور معنی کے اعتبار سے حدیث کی اقسام بتلائیں۔ اور اس کے ضمن میں واضح کریں کہ ان اقسام کا احادیث سے مستنبط احکام پر کیا اثر پڑتا ہے۔

قدیم وجدید جن حضرات نے اصولِ فقہ پر لکھا ہے تقریباً ان سب نے دلائل شرعیہ کے ضمن میں حدیث کے ماخذ و مصدر ہونے پر تفصیل سے گفتگو کی ہے اور تمام ضروری تفصیلات فراہم کی ہیں۔

استاذِ حدیث ''علم الحدیث'' کی تعریف اور سنت اور حدیث کے درمیان ترادف یا تباین بتلانے کے بعد اس بات کو تفصیل سے بیان کریں کہ قرآن مجید نے نبوت کے اعلیٰ منصب اور بلند و بالا مقام کے بارے میں کیا کہا ہے اور اس بارے میں مسلمانوں کو کیا ہدایات دی ہیں، نیز اس نے خود منصب نبوت کی کون سی ذمہ داریاں بیان کی ہیں۔

قرآن مجید پر نظر ڈالنے سے نبی کریم ﷺ کی مختلف حیثیات معلوم ہوتی ہیں۔ یعنی نبی کریم ﷺ امت کو صرف قرآنِ کریم کا متن پہنچانے والے نہیں تھے۔ بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر تھے، اور علمِ حدیث کو اسی تناظر میں پڑھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ذیل میں دی گئی چند قرآنی آیات سے اس کی نشاندہی ہوتی ہے۔

(۱) معلّم اور مربیّ:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

درحقیقت اہلِ ایمان پر تو اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان خود انہی میں سے ایک ایسا پیغمبر اٹھایا جو اس کی آیات انہیں سناتا ہے، ان کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور دانائی

کی تعلیم دیتا ہے۔(آل عمران:۱۶۴)

یعنی نبی اکرم ﷺ ایک معلم ہیں، کتاب اللہ کی تعلیمات امت کو فراہم کرتے ہیں اوراس کے ساتھ ساتھ مربی بھی ہیں، یعنی امت کے اخلاق وکردار کی اصلاح بھی کرتے ہیں۔

(۲) قاضی:

اِنَّآ اَنۡزَلۡنَآ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِتَحۡکُمَ بَیۡنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىکَ اللّٰہُ

اے نبیؐ! ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ جو راہِ راست اللہ نے تمہیں دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔(النساء:۱۰۵)

(۳) حاکم وفرماں روا:

اِنَّمَا کَانَ قَوۡلَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اِذَا دُعُوۡۤا اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ لِیَحۡکُمَ بَیۡنَہُمۡ اَنۡ یَّقُوۡلُوۡا سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا

ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ اوررسول کی طرف بلائے جائیں تاکہ رسول ان کے مقدمے کا فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اوراطاعت کی۔(النور:۵۱)

قرآن کریم کی کئی آیات تمام امت کوحکم دیتی ہیں کہ وہ تمام نزاعات آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لے جائیں۔اورآپؐ کی اطاعت بالعموم،اوران فیصلوں میں بالخصوص فرض ہے۔آپؐ کے فیصلے پرکوئی تنگی محسوس کیے بغیر بسروچشم قبول کرنا ہراُمتی کا فرض ہے۔چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ آیات آپؐ کی حاکم اورایک فرمانروا کی حیثیت کو بتلاتی ہیں۔

پھراساتذہ کرام اپنے طلبہ کو یہ دکھائیں کہ قرآن مجید نے نبی کریم ﷺ کا مقامِ بلند کس طرح بیان کیا۔قرآن نے آنجناب نبی کریم ﷺ کی اطاعت کواطاعتِ الٰہی قراردیا۔چنانچہ کہا گیا:

مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ

جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے دراصل خدا کی اطاعت کی۔(النساء:۸۰)

نبیؐ کے کلام کوکلام الٰہی قراردیا گیا۔

وَمَا يَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰى. اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡىٌ يُّوۡحٰى.

وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا، یہ تو ایک وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔(النجم:۳-۴)

اسی طرح نبیؐ کے ہاتھ پر بیعت کو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ پر بیعت قرار دیا:

اِنَّ الَّذِيۡنَ يُبَايِعُوۡنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوۡنَ اللّٰهَ

اے نبیؐ، جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے۔(الفتح:۱۰)

الغرض استاد تدریسِ حدیث کے ابتدائی اسباق ہی میں قرآن کی روشنی میں نبیؐ کی عظمت اور آپؐ کی مختلف حیثیتیں بیان کرنے کے بعد منصب نبوت کی ذمہ داریوں کے بارے میں بھی بتلائیں کہ قرآن نے نبی ﷺ کو چار ذمہ داریاں دی ہیں:

يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيۡهِمۡ وَ يُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ

اس کی آیات انہیں سناتا ہے، ان کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے۔

(آل عمران:۱۶۴)

(۱) قرآن کریم کی تلاوت (۲) تزکیہ اور تربیت (۳) کتاب اللہ کی تعلیم (۴) حکمت کی تعلیم۔ یعنی نبی کریم ﷺ اپنے اقوال کے ذریعے قرآن کی تفسیر کرتے ہیں اپنے اعمال کے ذریعے امت کو احکام کی تعمیل کا عملی طریقہ بتلاتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ حکمت کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ ان امور کو پوری شرح وبسط کے ساتھ بیان کرنے کے بعد طلبہ کو یہ نکتہ ذہن نشین ہوگا کہ سنت کی قرآن کے ساتھ کیا حیثیت ہے، یعنی سنت قرآن کی شرح ہے اور قرآن ہی وہ منبع اور سرچشمہ ہے جس سے سنت کے راستے متعین ہوتے ہیں۔

کتاب اللہ کے ساتھ حدیث نبویؐ کا مقام ومرتبہ اور حیثیت ایک عام اور وسیع تر مفہوم میں طلبہ کو سمجھانے کے بعد اگلا مرحلہ اس سے نسبتاً محدود مفہوم سے متعلق ہے۔ یعنی تشریعی اور احکام دینے کے اعتبار سے قرآن وحدیث کا آپس میں کیا تعلق ہے۔

تشریع میں سنت کا ایک اپنا اسلوب اور مزاج ہے۔ سنت کا اسلوب ومزاج سمجھنے کے لیے طلبہ

حدیث کو قرآن وسنت کے درمیان تعلق کو سمجھانا استاذِ حدیث کے لیے ناگزیر ہوگا۔۲

جس کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ اس تعلق کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) کبھی کبھار حدیث وہی حکم دیتی ہے جو قرآن دیتا ہو، مثلاً **بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ ...الی الآخر** (بخاری) ۔اس حدیث میں نماز، زکوۃ، حج، اور روزے کا حکم ہے، اور ان سب امور کی فرضیت قرآن میں بھی ہے۔

(۲) کبھی کبھار حدیث قرآنی حکم کی تشریح کرتی ہے، مثلاً وہ تمام احادیث جن میں نماز کی تفصیلات ہیں وہ سب ''**اَقِیْمُوْا الصَّلَاۃَ**'' کی شرح ہے۔

(۳) کبھی کبھار حدیث میں کوئی ایسا حکم ہوتا ہے جس کے بارے میں بظاہر قرآن خاموش نظر آتا ہے۔ ہم سوال کی شکل میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ کیا حدیث مستقل طور پر ایسا حکم دے سکتی ہے جس کا ذکر قرآن میں نہ ہو؟ اس امر میں اہلِ علم کا اختلاف ہے۔ تفصیل کے لیے محولہ بالا کتابوں کی طرف مراجعت کی جائے۔

اس سوال کے جواب کے ساتھ ساتھ استاد یہ بھی سمجھائیں کہ کیا قرآن اور حدیث کے اندر تعارض واقع ہوسکتا ہے؟ اولاً تو ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں، لیکن اگر بظاہر کہیں نظر بھی آئے تو اس صورت کو سمجھنے کے لیے علماء نے کیا اصول دیے ہیں، اس جانب بھی طلبہ کی توجہ دلانا ضروری ہے۔

قرآن وسنت کے درمیان تعلق کی اس نوعیت کو سمجھنے کے بعد ثبوت اور معنی اور اسی طرح دیگر اعتبارات سے حدیث کی مختلف اقسام بتلائی جائیں۔ اس ضمن میں حدیث کے درجات کی وضاحت کے ساتھ یہ بھی بتایا جائے کہ اس درجہ بندی کے نتیجہ میں احادیث سے مستنبط احکام پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ حدیث کی اقسام اور احکام پر اس کے اثرات پڑنے کے بارے میں تفصیلات مصطلح الحدیث کی کتابوں، اور اصولِ فقہ کی کتابوں میں ''السنۃ'' کے مباحث کے ذیل میں ملیں گی۔

۳۔ حجیتِ حدیث

اسلام اور مسلمان روزِ اول ہی سے دشمنوں کی جانب سے مختلف نوعیت کے حملوں اور تنقیدات کا نشانہ بنتے رہے ہیں۔ ان حملوں کا ایک ہدف اسلامی تعلیمات اور ان کے مآخذ کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنا رہا ہے۔ ان ہی حملوں میں سے ایک فتنہ انکارِ حدیث ہے۔ باقی حملوں سے تو شجرۂ اسلام کے برگ و بار ہی کو نقصان پہنچتا ہے۔ لیکن اس فتنہ سے شجرۂ اسلام کی جڑیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔

اس عظیم فتنہ کی دست بُرد سے عقائد و اعمال، اخلاق و معاملات، معیشت، معاشرت اور دنیا و آخرت کا کوئی اہم مسئلہ بھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ لیکن الحمدُ لِلّٰہ مسلمان اہلِ علم اور محدثین جس طرح کسی بھی میدان میں اعداء اسلام کے حملوں کا جواب دیتے رہے اور کبھی بھی اسلام کی پاکیزہ تعلیمات پر دشمنوں کے بے جا الزامات اور بے بنیاد تنقیدوں کا دھبہ نہیں رہنے دیا، اسی طرح مختلف اہل علم نے مختلف ادوار میں اس فتنے کی بھی خبر لی ہے۔

اس سلسلہ کو آگے بڑھاتے ہوئے آج بھی حدیث کی درسگاہوں میں اس باب میں متقدمین یا معاصرین کی چند تصانیف کو کافی نہیں سمجھنا چاہیے۔ بلکہ اولاً تو اس فتنے کی وجہ طلبہ کے ذہنوں میں واضح کرنا ضروری ہے، اور پھر یہ بات ذہن نشین کرانی چاہیے کہ اس اصل وجہ کی موجودگی میں آج بھی یہ فتنہ مختلف نظریات کی صورت میں جاری ہے۔ اساتذہ کی ذمہ داری بنتی ہے کہ اس فتنے کا تعاقب کریں اِن مختلف نظریات و تصورات کو اصل حقائق اور پس منظر و پیش منظر اور اس کے نتائج سے حدیث کے طلبہ کو آگاہ کریں۔ اور انہیں اس فتنے کے خلاف لڑنے کے لیے ہر قسم کے علمی و فکری ہتھیار سے لیس کریں۔

اساتذۂ حدیث فتنہ انکارِ حدیث اور اس کے خلاف علمی اور فکری جنگ لڑنے کا ذکر بار بار طلبہ کے سامنے کریں اور وقتاً فوقتاً ان کی علمی صلاحیت کو توانا بنانے کے ساتھ ساتھ اس فتنے کے خطرات سے بھی آگاہ کیا کریں۔ کیونکہ دوسری صورت میں یہ امتِ مسلمہ کے لیے علمی و روحانی اعتبار سے ایک

بڑا خطرہ اور اسلامی تہذیب وتمدن کے نظام کے لیے ایک بڑا دھچکا ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کو یہ بھی بتایا جائے کہ منکرین حدیث کن افکار ونظریات کی صورت میں اپنی یہ مہم جاری رکھے ہوئے ہیں۔ مثلاً کبھی تو یہ کہا کہ متون کی اکثر کتابیں عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ کے سیکڑوں سال بعد مدوّن ہوئی ہیں، اس طویل عرصے میں حدیث کی حفاظت پر کیسے یقین کیا جاسکتا ہے۔ کبھی قرآن مجید اور احادیث کے درمیان، یا خود احادیث کے درمیان تعارض دکھا کر حدیث کو غیر معتمد بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور کبھی احادیث کو سائنس اور ٹیکنالوجی سے متصادم پا کر حدیث کو غلط قرار دیتے ہیں۔ بسا اوقات حدیث کو انسانی عقل کے ترازو میں تولا جاتا ہے، اور عقل سے تضاد کی صورت میں حدیث ہی کو مسترد کیا جاتا ہے۔ حفاظتِ حدیث کے لیے قرونِ اولیٰ سے ہی محدثین کی بے مثال کاوشوں کا یہ سلسلہ جاری وساری رہا ہے۔ آج کے طلبہ کو اس کام سے آگاہ رکھنا اور تیار کرنا آج کے اساتذۂ حدیث کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔

اس باب میں معاونت کے لیے حجیتِ حدیث پر لکھی گئی تمام کتابیں بالعموم، اور معاصرین کی بالخصوص زیرِ مطالعہ رہنی چاہئیں، نیز ''جدیدیت'' یا تجدد پسندی پر آنے والی کتب اور اُردو و عربی کے مختلف تحقیقی مجلّات کا مطالعہ کیا جائے، جن میں اس موضوع سے متعلق مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ طلبہ کو بھی ان کتابوں، مقالات سے آگاہی دینے کے ساتھ ساتھ ان موضوعات پر نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں میں مختصر مقالات لکھوانے اور سیمینارز منعقد کروانے کا اہتمام بھی کیا جائے۔

۴۔ فہمِ حدیث میں غلط فہمیاں

دینی مدارس میں حدیث بالعموم دقت کے اعلیٰ معیار کے مطابق فنی اور فقہی مباحث کے ساتھ پڑھائی جاتی ہے اور وہاں تدریسِ حدیث کا منصب علم، تقوی، للّٰہیت اور تجربہ کے لحاظ سے سب سے سینئر استاد کو سونپا جاتا ہے۔ دوسری جانب دینی مدارس کے علاوہ بھی بعض اہلِ علم اور علمی ادارے حدیث کو بحث وتحقیق کا موضوع بناتے ہیں۔ یوں حدیث کی روشنی میں مسائل کے حل پر روز نئی کتابیں آرہی ہیں۔ حدیث کے علوم سے مناسبت رکھنے والے حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ فہمِ حدیث کے

اپنے اصول، شرائط اور لوازمات ہیں، یہ لوازمات اور شرائط آج علوم اور فنون کی شکل اختیار کر چکے ہیں اور ان میں سے ہر ایک پر ضخیم کتابیں لکھی گئیں ہیں۔

اس سب کے باوصف بھی بعض اوقات حدیث کے فہم میں غلطی پائی جاتی ہے، اور نیت میں کھوٹ نہ بھی ہو تو اہداف کے تعین کے وقت کسی غلطی کے باعث خوشگوار نتائج حاصل نہیں ہو پاتے۔ اس ناگفتہ بہ صورتحال کے پیدا ہونے کی کیا وجوہات ہیں اور فہمِ حدیث میں اِن غلطیوں میں پڑ جانے کے کیا اسباب ہیں؟ اس موضوع پر بعض معاصر اہلِ علم کی کتابیں بھی آ چکی ہیں، لیکن تدریسِ حدیث کے منصب پر فائز اہلِ علم کی ذمہ داری ہے کہ اس امر کی جانب جہاں خود توجہ دیں، وہاں اپنے طلبہ کو بھی بنیادی معلومات فراہم کریں اور انہیں ان اصولوں سے لاپروائی برتنے کے منفی اثرات ونتائج سے آگاہ کریں۔

اس بارے میں دو قسم کے اسباب پائے جاتے ہیں۔ ایک قسم کے اسباب کا تعلق حدیث کی سند سے ہوتا ہے، جبکہ دوسری قسم کے اسباب کا تعلق حدیث کے متن سے ہوتا ہے۔ حدیث کے متن سے متعلق اسباب کا ذکر تو آگے ''متن حدیث کی صحیح قرأت اور فہم'' کے ذیل میں ہوگا، یہاں سند سے تعلق رکھنے والے اسباب کا ذکر کیا جاتا ہے، جو بنیادی طور پر دو ہیں۔

(۱) ائمہ جرح وتعدیل کے درجات: جیسا کہ پہلے بھی اشارہ ہوا ہے، حدیث ہی وہ واحد علم ہے جس کی برکت سے توثیق اور جرح یا تعدیل اور نقد کا تصور ملا۔ یہ تصور ترتیب وتدوین کے مختلف مراحل سے گزرتا ہوا ایک مستقل علم کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اس علم نے اسلام کی پوری تاریخ کھنگال کر حدیث کی سرگرمی سے متعلق تمام لوگوں کو ''مجروح، یا عادل'' کے درجے میں تقسیم کیا۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ کسی کو ''عادل'' یا ''مجروح'' قرار دینا ہر کسی کا ایسا ذاتی فیصلہ نہیں تھا جو محض اپنی خواہش کے تابع ہو، بلکہ اس کے اپنے اصول وقواعد ہیں جن کی پاسداری ہر ناقد حدیث پر لازم ہے۔ اور ان اصول وقواعد پر بھی علماء حدیث نے کتابیں لکھی ہیں۔ عام طور پر نقادِ حدیث کے فیصلے انہی اصولوں پر مبنی ہیں، لیکن مزاج اور طبائع کے اندر فطری فرق کی وجہ سے بعض اوقات فیصلوں

میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔کوئی راوی اگرایک محدث کے نزدیک دجال اور کذاب ٹھہرتا ہے۔تو وہی راوی دوسرے محدث کے ہاں، ثقہ اور عادل راوی قرار دیا جاتا ہے۔ ایسی مثالوں سے اسماء الرجال کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔اس امر کے پیش نظر خود جرح وتعدیل کے ان ائمہ کومختلف درجات میں تقسیم کیا گیا۔

ایک طبقہ تو ''متشددین'' کا ہے۔وہ ذراسی بات پرراوی کومجروح قرار دیتے ہیں، چنانچہ کوئی بھی راوی بآسانی ان کے یہاں عادل نہیں ٹھہرتا۔ دوسرا طبقہ ''متساھلین'' کا ہے جوتساہل سے کام لیتے ہیں۔ان کا انداز یہ ہے کہ انہوں نے اپنے انتہائی تقویٰ کی نظر سے سب کو دیکھا جو بظاہر نیک اور متقی نظر آیا اس کو اپنے پر قیاس کیا اور قابل اعتماد قرار دیا۔تیسرا طبقہ ''معتدلین'' کا ہے۔ جو میانہ روی اور اعتدال سے کام لیتے ہیں۔

یہ بنیادی نکتہ ذہن میں رکھتے ہوئے ،اساتذہ کرام کی ذمہ داری ہے کہ طلبہ کے سامنے اس امر کو مکمل وضاحت کے ساتھ پیش کریں۔اور اُنھیں یہ بات ذہن نشین کروائیں کہ کسی بھی حدیث سے استدلال واستنباط کرنے سے پہلے اگرچہ اولاً اس حدیث کا مرتبہ اور حکم معلوم کرنا ضروری ہے۔اور حدیث پر حکم رجال کے مراتب معلوم ہونے کے بعد لگتا ہے۔تو رجال کا مرتبہ اوران کے ضعیف یا ثقہ ہونے کے بارے میں خود ائمہ جرح وتعدیل کو جاننا بھی ضروری ہے کہ راوی کی توثیق یا اس پر جرح کرنے والے امام کا تعلق کس طبقہ سے ہے۔اگر طلبہ کو اس امر سے روشناس نہیں کرایا گیا اور انھیں یہ بنیادی اصول اپنانے کی وصیت نہیں کی گئی۔تو جہاں ان کے استدلال واستنباط کے لیے صحیح حدیثوں کا ذخیرہ ضعیف کے ساتھ خلط ملط ہونے کا اندیشہ ہوگا وہاں احادیث کے رُوات اور رجال کے جانچنے کے متعلقہ اصول بھی مجروح ہوں گے۔

اس باب میں مصطلح الحدیث کی عام کتابوں اور جرح وتعدیل پر لکھی گئی خصوصی کتابوں سے مدد لی جاسکتی ہے۔مثلاً علامہ عبدالحی لکھنوی کی **الرفع و التکمیل**۔

(۲) تحقیق کا رخ: جرح وتعدیل کا علم وضع کرنے کا مقصد ثقہ رواۃ کی صحیح حدیثوں کا ضعیف حدیثوں سے امتیاز ہے۔یعنی راویوں کے احوال کو جرح وتعدیل کے اصولوں پر جانچنے کا عمل آخر کار حدیث پر صحیح یا ضعیف ہونے کا حکم لگائے جانے پر ختم ہوتا ہے۔لیکن آج کے دور میں احادیث پر نئے پہلوؤں سے اور نئی معلومات کی روشنی میں صحت یا ضعف کا حکم لگانے پر بھی بیسیوں کتابیں لکھی گئی ہیں۔اور صحیح اور ضعیف احادیث کے الگ الگ موسوعات (انسائیکلو پیڈیا) تیار ہو گئے ہیں۔جنہیں بجاطور پر جرح وتعدیل کے باب میں متقدین کی کاوشوں کا ثمرہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس باب میں طلبہ کی راہنمائی بھی استاذ حدیث کی ذمہ داری میں آتی ہے۔استاد بجائے اس کے کہ کسی خاص مسلک کی فکر اور مزاج کے مطابق تحقیقی رخ طلبہ پر واضح کر دیں،انہیں چاہیے کہ اس فن میں طے شدہ متفقہ اصولوں کی طرف راہنمائی کریں اور ان اصولوں کے اطلاق کا صحیح طریقہ بتائیں۔دوسری جانب طلبہ کی یہ فکر اور مزاج بنانے کی کوشش کریں کہ اس باب میں لکھی گئی کتابوں پر اعتماد کے ساتھ خود بھی اجتہادی صلاحیت پیدا کریں۔کیونکہ خود قرآن دنیوی امور کے بارے میں چھان پھٹک کرنے اور تحقیق کرنے پر اُکساتا ہے۔مثلاً:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب فاسق شخص تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کرو۔ (الحجرات:۶)

نیز

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تمہارے پاس مومن عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو ان کو آزما کر دیکھو۔ (الممتحنۃ:۱۰)

ظاہر ہے قرآن میں عام باتوں کے بارے میں تحقیق کا یہ حکم ہے تو پھر روایت حدیث تو انتہائی اہمیت رکھنے والا معاملہ ہے۔اس میں یقینی طور پر تحقیق کرنا ناگزیر ہوگا۔طلبہ کو محض اس باب میں لکھی گئی

کتابوں سے آگاہ کر دینا کافی نہیں، بلکہ خود ان اصولوں کی طرف راہنمائی، اور پھر ان اصولوں کے بنیاد پر روایات کی تحقیق کی صلاحیت پیدا کرنا اساتذہ حدیث کی بنیادی ذمہ داری ہے۔

۵۔ فنِ حدیث کی اہم کتب کا تعارف

علم حدیث اسلامی ہی نہیں، انسانی تاریخ کا ایک انتہائی منفرد اور بے مثال علمی کارنامہ ہے۔ یہ محض حفاظت حدیث کے لیے چند اصول وقواعد مرتب کرنے کا نام نہیں بلکہ بیسیوں علوم وفنون کو وضع کرنے میں انسانی تاریخ میں اپنی نوعیت کی منفرد کاوش ہے۔ اگر چہ ذخیرہ حدیث کو جمع کرنے کا کام آپ ﷺ کے زمانے میں ہی انفرادی طور پر شروع ہو چکا تھا، لیکن دور خلافت راشدہ میں حدیث کے بارے میں غیر مدون شرائط اور احتیاطیں شروع ہو چکی تھیں، اس کے بعد محدثین نے احادیث کو رطب ویابس سے پاک کرنے کے لیے کڑی شرائط کی چھلنی لگائی۔ قرون اولیٰ کے بعد جب مختلف قسم کے فتنے سر اٹھانے لگے اور مختلف پہلوؤں سے اسلام اور مسلمانوں پر حملوں میں شدت آ گئی، تو حفاظت حدیث کی خاطر محدثین کے طے شدہ اصول علوم وفنون کی شکل اختیار کر چکے تھے، اور محدثین نے ان سب پر کتابیں لکھنا شروع کر دی تھیں۔ اِنہی کاوشوں کے نتیجے میں آج مسلمانوں کے پاس علم حدیث پر اتنا وسیع ذخیرہ موجود ہے کہ دنیا کی دیگر اقوام اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔

علمِ حدیث اور اس سے متعلقہ اُمور پر لکھی گئی کتابوں میں اس عظیم وسعت کے پیش نظر اس فن کی بنیادی معرفت اور اس کی معروف ومشہور کتابوں سے محض شناسائی حاصل کرنا خود تدریسِ حدیث کا ایک حصہ بنا دیا گیا ہے اور استادِ حدیث کی اہم ذمہ داریوں میں شامل ہو گیا ہے کہ وہ اِن فنون اور کتابوں کے بارے میں طلبہ کو آگاہ کریں۔ اب اساتذہ کرام حدیث اور فنِ حدیث کی کتابوں کا تعارف کیسے کرائیں اور اس پر کتنا عرصہ لگائیں تو بنیادی طور پر تو یہ ہر استاد کے ذاتی علم، تجربے اور صوابدید پر موقوف ہے۔ تاہم اس سلسلے میں چند تجاویز پیشِ خدمت ہیں۔

- اولاً تو فنونِ حدیث کا تعارف کرائیں، مثلاً طبقات، اسماء الرجال، جرح وتعدیل، اور مصطلح الحدیث وغیرہ۔ نیز ہر علم کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کریں اور اس حوالہ سے کتب کی تدوین

کے تاریخی پس منظر سے آگاہ کریں، تاکہ طلبہ کو ہر فن کی ضرورت، اہمیت اور تدوین کے اسباب معلوم ہوں۔

- فنون کے تعارف کے بعد ہر فن کی مشہور و معروف کتابوں کے بارے میں بتائیں اور اگر وہ کتابیں آپس میں ایک تاریخی تسلسل رکھتی ہیں تو وہ تاریخی مراحل بھی بتائیں، تاکہ طلبہ کو ہر کتاب کی خصوصیات کے بارے میں بھی علم ہو۔

مثال کے طور پر طلبہ کو یہ بتانا مفید ہوگا کہ فن اسماء الرجال میں سب سے پہلے طبقات ابن سعد لکھی گئی اور وقت کے ساتھ ساتھ یحییٰ بن معین، علی ابن المدینی اور امام بخاری وغیرہ حضرات نے بھی کتابیں لکھیں۔ یہاں تک کہ جب پانچویں صدی کے بعد براہ راست اپنی سند سے روایت حدیث کا سلسلہ ختم ہو گیا تو رجال کی بھی ساری معلومات جمع ہو گئیں۔ پھر ان متفرق معلومات کو جمع کر کے اور ان کا تقابل کر کے جامع مجموعے تیار کرنے کا عمل شروع ہوا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے علامہ عبد الغنی المقدسی کی کتاب ''**الکمال فی اسماء الرجال**'' ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے رجال پر اس وقت تک کا تمام مواد جمع کرنے کی کوشش کی۔ اس کتاب کو بنیاد بنا کر بہت سے محدثین نے اس فن کی خدمت کی اور متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ سب سے پہلے حافظ مزی نے اس میں سے نسبتاً غیر اہم باتیں حذف کر کے مفید اور نئی معلومات کے اضافے کے ساتھ ''**تہذیب الکمال فی اسماء الرجال**'' کے نام سے ایک نئی کتاب تیار کی۔ اس کے بعد حافظ علاء الدین الکمال نے تکملہ کی حیثیت سے ''**اکمال تہذیب الکمال فی اسماء الرجال**'' کے نام سے ایک اور کتاب لکھی۔ اصل کتاب بارہ جلدوں میں اور اسکا تکملہ تیرہ جلدوں میں ملا کر کل پچیس جلدوں پر مشتمل ایک جامع کتاب تیار ہوئی، لیکن چونکہ ضخامت اور طوالت کی وجہ سے اس کام سے استفادہ خاصا مشکل تھا، چنانچہ حافظ ذھبی نے اس کی تہذیب کر کے ''**تذھیب الکمال**'' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب کو مقبولیت ملی اور یہ تحقیق میں بنیادی حوالے کی کتاب بن گئی۔ اس کے علاوہ بھی بیسیوں کتابیں اس موضوع پر تیار ہوئیں۔

اس مثال کا مقصد کتابوں کا تعارف کروانے میں تاریخی تسلسل کا اسلوب اپنانے کی تجویز کی وضاحت ہے۔اس طرح ہر کتاب کا نظام، خصوصیات اور مرتبہ ودرجہ بآسانی واضح ہو جاتا ہے۔

○ متون حدیث کی کتابوں کا تعارف کروانے میں اولاً تو ان کی اقسام بتائی جائیں، یعنی جامع، سنن، مسند، مشکل الحدیث، اطراف، غریب، معجم وغیرہ۔ پھر ان تمام اقسام میں محدثین کی الگ الگ کتابوں کا تعارف کروایا جائے۔ مثلاً سنن کے نام سے کس کس نے لکھا۔ جیسے سنن ترمذی، سنن دارقطنی، سنن ابوداود وغیرہ۔ جامع کون کون سی کتابیں ہیں۔ معاجم کن محدثین نے لکھی ہیں۔

تعارف کروانے کے بعد ہر کتاب کی خصوصیات، اور محدثین کی نظر میں اس خاص کتاب کے درجہ اور مقام ومرتبہ پر گفتگو کی جائے۔ یہ امر محدثین کے ہاں ''طبقات کتب حدیث'' کے عنوان سے جانا جاتا ہے۔اس کا فائدہ متونِ حدیث کی کتابوں کے درجات کا تعین ہے۔ مثلاً ایک طرف صحیح بخاری کی حدیث ہے اور دوسری طرف سنن ابن ماجہ کی، تو طبقات کتب حدیث کے ذیل میں صحیح بخاری کا درجہ سنن ابن ماجہ کے بہ نسبت اونچا ہے۔ تو ترجیح صحیح بخاری ہی کی حدیث کو ہوگی۔ طبقات اور درجہ بندی کی صورت میں کتبِ حدیث کے تعارف کا فائدہ طلبہ حدیث کو کسی بھی مسئلے کے استنباط واستخراج کے وقت ہوگا۔

○ عصر حاضر کے تقاضوں کے پیش نظر آج کل بھی متونِ حدیث کے مختلف مجموعے تیار ہو رہے ہیں۔ مثلاً کسی نے مالیات کے امور سے متعلق روایات کا ایک مجموعہ تیار کیا۔ بعض حضرات نے حدود سے متعلق احادیث جمع کیں۔ کچھ لوگ بین الاقوامی امور سے متعلق احادیث کی طرف متوجہ ہوئے۔اساتذہ کرام کو اس قسم کی کتابوں کی طرف بھی طلبہ کی توجہ مبذول کرانا چاہیے، کہ یہ پہلو بھی فقہی مسائل کے استخراج اور غور وفکر میں مفید ثابت ہوسکتا ہے۔

٦۔ متنِ حدیث کی صحیح قرأت اور فہم

حدیث کا صحیح فہم، اس علم کا بنیادی اور مرکزی مرحلہ ہوتا ہے۔ اور اس سے پہلے مصطلح الحدیث،

رجال، جرح وتعدیل وغیرہ فنون مبادیات کی حیثیت رکھتے ہیں۔حدیث کی درسگاہوں کا اولین مقصد یہ ہوتا ہے کہ طلبہ حدیث کا صحیح فہم حاصل کریں۔

حدیث کے صحیح فہم کے لیے ایک بنیادی شرط متنِ حدیث کی صحیح قرأت ہے۔کیونکہ حروف بلکہ بعض اوقات حرکات وسکنات میں تبدیلی سے معانی میں تبدیلی رونما ہوتی ہے اور مطلب کچھ سے کچھ ہوجاتا ہے۔قرأت کی تصحیح کا تعلق عربی کے قواعد کی معرفت سے ہے۔اس باب میں صرف، نحو، اور علم بلاغت کے قواعد سے واقفیت لازمی ہے۔کیونکہ جب کوئی فرد کسی کامل ادیب کے کسی جملے یا چوٹی کے شاعر کے کسی شعر کی تشریح کرتا ہے تو اس کی تحلیل کرکے عربی کے تمام قواعد کی تطبیق کرتا ہے، تب اس کا کمال، علمیت اور معانی واضح ہوتے ہیں۔نبی کریم ﷺ افصح العرب تھے۔آپؐ کو ''جوامع الکلم'' عطا کیے گئے تھے۔آپؐ کی ہر ہر حدیث عربی بلاغت وفصاحت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہے۔اس میں تو تاکید کے ساتھ ضروری ہوگا کہ استاد حدیث کی تشریح کرتے وقت طلبہ سے اس کی صحیح قرأت کروائیں، تحلیل کرکے عربی کے قواعد کی تطبیق کریں، صحیح قرأت اور درست معانی کے تعین کے بعد حدیث کا صحیح مطلب واضح ہوجائے گا۔

حدیث کی صحیح قرأت کے سلسلے میں مہتممین اور اساتذہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ ابتدائی درجات ہی سے طلبہ کی عربی کو پختہ کرائیں، یعنی انہیں حدیث کا متن صحیح پڑھنے کے قابل بنائیں۔اس کے بعد بھی مشکل جگہوں میں استاد کو مدد کے لیے تیار رہنا چاہیے۔جس کے لیے اگر بورڈ کا استعمال کیا جائے تو طلبہ کو سمجھنے میں زیادہ آسانی ہوگی۔یعنی متعلقہ حدیث کا متن لکھ کر تمام الفاظ کی الگ الگ نشاندہی کرکے تشریح کی جائے۔

حدیث کے صحیح فہم کے لیے صرف، نحو، بلاغت، رجال، جرح وتعدیل اور مصطلح الحدیث کی چند بنیادی معلومات پر ہرگز اکتفا نہیں کیا جاسکتا۔یہ واضح کرنا چاہیے کہ شریعت اسلامی ایک مکمل نظام ہونے کی حیثیت سے چند بنیادی قواعد، اصول ومقاصد رکھتی ہے، جن کی رعایت کیے بغیر حدیث کے فہم میں خطا کا قوی امکان ہوتا ہے۔وہ قواعد واصول اور مقاصد کیا ہیں، ان کی طرف راہنمائی کرنا

اساتذ کرام کی ذمہ داری ہے۔ اس باب میں متقدمین اور معاصرین دونوں قسم کے علماء کی کتابیں دستیاب ہیں۔ جیسے امام شافعیؒ کی ''الرسالة''، حافظ ابن القیم کی ''اعلام الموقعین''، پیر کرم شاہ الازھری کی ''سیرة النبی ﷺ''، سید مودودیؒ کی ''سنت کی آئینی حیثیت''، مولانا مناظر احسن گیلانی کی ''تدوین حدیث''، علامہ ڈاکٹر خالد محمود کی ''آثار الحدیث''، شیخ محمد الغزالی مرحوم کی ''السنة النبوية بين اهل الفقه و اهل الحديث'' اور ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی ''كيف متعامل مع السنة النبوية'' وغیرہ۔

ذیل میں ہم بطور نمونہ اصول کی حیثیت رکھنے والے چند امور کا اختصار کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔

قرآن وسنت کا تعلق

اس بارے میں ایک سنگین غلط فہمی جو بدقسمتی سے ایک فتنے کی شکل اختیار کرتی جارہی ہے، اس سے مدارس کے طلبہ کا آگاہ ہونا ضروری ہے۔ غلط فہمی یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی حیثت صرف قرآن میں دیے احکام کے شارح کی تھی اور آپ کا یہ منصب نہیں کہ آپ ﷺ قرآن کے علاوہ بھی کوئی حکم صادر فرماتے۔ بظاہر دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اگر آنحضرت ﷺ کے لیے بھی تشریعی حیثیت تسلیم کی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نعوذ باللہ قرآن ادھورا رہ گیا تھا جس کی تکمیل آپ ﷺ نے اپنی حدیثوں اور سنتوں کے ذریعے کی۔

یہ سوچ بظاہر تو قرآن کی عظمت میں مبالغے پر مبنی دکھائی دیتی ہے لیکن دراصل یہ ایک بنیادی مغالطہ ہے جس کو رفع کرنے کا کافی سامان خود قرآن مجید میں موجود ہے۔ قرآن کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ آپؐ کی حیثیت محض شارح کی نہیں بلکہ شارع کی بھی ہے۔ گویا دورانِ تدریس قرآن کی نسبت سے آپؐ کے منصب کو خود قرآن ہی کی روشنی میں define کیا جائے گا، یہ بتایا جائے گا کہ اگر آپؐ کے شارع ہونے کی حیثیت کسی خاص حد تک محدود ہے، تو وہ حدود کیا ہیں اور اگر لامحدود ہے تو قرآن و

سنت کے درمیان ممکنہ تعارض کی صورت میں کیا کیا جائے گا۔

ان تمام پہلوؤں کو خوب بسط و تفصیل کے ساتھ واضح کر دینا چاہیے؛ تا کہ اس بنیادی مغالطے پر مبنی فتنے کی شکل اختیار کرنے والی کج فہمی کا تعاقب کیا جا سکے۔ ا

ایک موضوع سے متعلق تمام حدیثوں کو جمع کرنا

سنت کے صحیح فہم کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ایک مسئلے سے متعلق تمام حدیثوں کو اکٹھا کیا جائے۔ کیونکہ اگر حدیث قرآن کے مجمل بیان کی تفسیر کر سکتی ہے اور اس کے مشکل مقام کے معانی اور مفاہیم بتا سکتی ہے تو خود احادیث میں عام کی تخصیص کسی اور حدیث سے ہو سکتی ہے۔ اسی طرح کوئی حدیث مشکل و مجمل کے قبیل سے ہو تو اس کی تفسیر ہم دیگر احادیث سے لے سکتے ہیں۔ لہٰذا کسی بھی مسئلے سے متعلق تمام حدیثوں کا یک جا کر کے مطالعہ کرنا فہمِ حدیث کے لیے بے حد مفید اور ضروری ہے۔

باہم متعارض نصوص میں تطبیق

کتاب و سنت کبھی بھی ایک دوسرے سے متعارض نہیں ہو سکتے۔ لیکن بالفرض اگر بادی النظر میں ایسا لگ رہا ہو تو اس کے لیے اولاً جمع اور تطبیق کا طریقہ اختیار کیا جائے کیونکہ یہ ایک معروف اصولی قاعدہ ہے۔ ''**اعمال الدلیلین اولی من اھمالھما او من اھمال احدھما**'' (دونوں دلیلوں پر عمل کرنا، دونوں یا ان میں سے ایک کو ترک کرنے سے بہتر ہے)۔ جمع اور تطبیق میں دونوں دلیلوں پر عمل ہوتا ہے۔ لیکن اگر جمع اور تطبیق کی کوئی صورت ممکن نہ ہو تو پھر نسخ یا ترجیح کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

احادیث کے ورود کے اسباب، تناظر اور مقاصد

علماء نے جس طرح قرآن مجید کی آیات کے فہم میں ان کے اسبابِ نزول کو مفید اور معاون قرار دیا ہے، اسی طرح اگر حدیث کو سبب الورود، تناظر علت، اور مقاصد کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی

جائے تو یہ بھی مفید ہوگا۔ یعنی اس سنت کی علت کیا ہے، کس صورتِ حال، کس واقعہ اور کن مقاصد کے حصول کے پیشِ نظر وہ سنت صادر ہوئی۔ کیونکہ تمام احکام علتوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان علتوں کے وجود کے وقت ان سنتوں پر عمل کیا جائے گا اور انہی مقاصد کے حصول کے لیے اِن سنتوں کو بجالایا جائے گا جن کے پیشِ نظر یہ سنتیں نبی کریم ﷺ سے صادر ہوئی تھیں، اور ان علل و مقاصد کے نہ ہونے کی صورتوں میں ان احادیث پر عمل نہیں کیا جائے گا۔

تاہم فہم حدیث کا یہ باب ہر کسی کے لیے کھلا نہیں ہے بلکہ اس باب سے وہ لوگ ہی گزر سکتے ہیں جو تقویٰ، طہارت اور اخلاص کے حامل ہوں؛ نصوص کا گہرا فہم، فقہ پر عمیق نظر اور مقاصد شریعت کا مکمل ادراک رکھتے ہوں۔

ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا تھا۔ کہ بعض لوگ ’’کَلِمَةُ حَقٍ اُرِيْدَ بِهَا الْبَاطِلِ‘‘ (کلمہ تو حق ہے، مقصود باطل ہے) کے مصداق غلط نظریات اور شریعت کے بعض احکام کے بارے میں اجماعِ اُمت کے دھارے سے الگ ہو کر اپنے مفروضات قائم کرتے ہیں۔ اور استدلال میں زیرِ بحث طریقہ اپناتے ہیں کہ احادیث کے مخصوص اسباب، علتیں اور مقاصد ہیں ان کے ہوتے ہوئے تو ان احادیث پر عمل ہوگا اور نہ ہونے کی صورت میں اُن احادیث پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ اس طرح یہ لوگ اِن احادیث کے علل و مقاصد کا تعین بھی خود کریں گے اور پھر ان کے نہ ہونے کا فیصلہ بھی خود کر کے اپنے بے جا اجتہاد کا جواز پیدا کریں گے، اور پھر ’’کُلُّ اِنَاءٍ یَتَرَشَّحُ بِمَا فِیْهِ‘‘ (برتن سے وہی نکلتا ہے جو اس کے اندر ہوتا ہے) کے مصداق ان کے دماغ اور فکر و نظر کی صورت وہی ہوگی جو ان کا پہلے سے ہدف تھا اور یہ ساری کارروائی اس کے حصول کے لیے کی گئی ہوگی۔

اساتذہ کرام جہاں صحابہؓ اور تابعین کو نمونہ بتلا کر ان ہی کی زندگیوں سے مثالیں دے کر اس طریقہ استدلال کی مکمل تفصیلات اور اطلاقات و تمثیلات کے ساتھ وضاحت کریں؛ وہاں اس ضمن میں ان نو مولود نظریات اور غلط تصورات کا بھی تعاقب کریں اور طلبہ کو اس بارے میں محتاط رہنے کی وصیت

کریں۔

وسائل اور اہداف کا امتیاز

احادیث میں بعض اوقات کچھ اہداف کا ذکر ہوتا جن کا حصول مقصود ہو۔ اور اس کے ساتھ کچھ وسائل اور ذرائع بھی بیان کیے گئے ہوتے ہیں جن کے استعمال سے ان اہداف کا حصول ممکن ہوسکتا ہے۔ حدیث کے صحیح فہم کے لیے اساتذہ یہ ضرور بتائیں کہ ہدف اور ذریعے میں امتیاز کیا جانا چاہیے، کیونکہ اہداف دائمی ہوتے ہیں، کبھی بھی نہیں بدلتے؛ جبکہ وسائل وقتی ہوتے ہیں، کسی خاص دور یا کسی خاص صورتِ حال اور معاشرے میں بدل سکتے ہیں۔

بعض لوگ فہم کی غلطی کی بناء پر وسائل کو بھی اہداف کی طرح دائمی سمجھنے لگتے ہیں اور اِن مقاصد کے حصول کے لیے کسی نئے وسیلے کو سنت کے خلاف سمجھتے ہیں۔ مثلاً احادیث میں بعض بیماریوں کے علاج کے لیے چند مخصوص طریقوں کا ذکر آیا ہے۔ تو وہ طریقہ وسیلہ ہے اور اصل ہدف یا مقصد بیماری سے صحت یاب ہونا ہے۔ اگر اسی بیماری کے لیے حدیث میں مذکور طریقہ کے علاوہ کوئی نیا طریقہ علاج اختیار کیا جائے تو یہ سنت نبویؐ کے خلاف نہیں ہوگا، اس لیے کہ حدیث میں نبیؐ کا طریقہ وسیلہ ہے، جو بدل سکتا ہے اور اس کے خلاف کوئی دوسرا وسیلہ اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ طلبہ کے سامنے اس قاعدہ کو شواہد اور مثالوں کے ساتھ واضح کیا جائے تو ان کے ہاں فہم حدیث میں غلطی کا امکان کم ہوگا۔

یہ چند امور تھے جنھیں ہم نے اختصار کے ساتھ بطور مثال عرض کیا۔ ورنہ اس سلسلے میں علماء کے ہاں کافی تفصیلات ہیں جن کے لیے ابن القیم کی ''**اعلام الموقعین**'' اور شاہ ولی اللہؒ کی ''**حجة الله البالغة**'' خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

۷۔ متنِ حدیث سے مسائل استنباط کرنے کی صلاحیت

دینِ اسلام کا امتیاز دیگر آسمانی ادیان کے مقابلے میں یہ ہے کہ سابقہ ادیان مخصوص مقام کے لوگوں کے لیے اور مخصوص دور تک محدود تھے، جبکہ اسلام پوری دنیا کے لیے اور قیامت تک آنے والے

تمام انسانوں کے لیے ہے۔ اسی طرح اس امت کے علماء کا سابقہ اقوام کے علماء کے مقابلے میں یہ امتیاز ہے کہ اس اُمت کے علماء کا علم اپنے نبی ﷺ کی بتلائی ہوئی نصوص کے الفاظ پر رک جانے کے بجائے ان کے اندر پنہاں معانی کی گہرائی میں اُتر کر ہر دور کے لحاظ سے شریعت کے افکار و ہدایات کو واضح کرنا ہے۔ نصوص کے معانی اور مطالب کے گہرائیوں اور وسعتوں میں جانا اور پیش آمدہ جدید مسائل کا حل تلاش کرنا ان کی ذمہ داری ٹھہرائی گئی ہے۔ اور حق تک پہنچنے پر دوہرا اجر جبکہ غور وفکر کے اس سفر میں راستہ بھٹکنے یعنی غلطی ہوجانے پر کوئی سزا نہیں بلکہ اس پر بھی ایک اجر کا وعدہ کیا گیا ہے۔ شرط یہ ہے کہ یہ کام اخلاصِ نیت کے ساتھ اور صرف اللہ کی رضا جوئی کے لیے ہو۔ نصوص میں غور وفکر اور استنباط واستخراج جہاں علماء کرام کی امتیازی شان ہے وہاں یہ ان کی انتہائی نازک اور اہم ذمہ داری بھی ہے۔ طلبہ کو بھی فراغت کے بعد والی ذمہ داریوں کا احساس شروع ہی سے دلایا جائے۔

طلبہ کو حدیث کے صحیح فہم کے بعد استنباط واستخراج کے قابل کیسے بنایا جائے؟ یہ مرحلہ نسبتاً مشکل اور صبر آزما ہے لیکن اس کے لیے ہدایات، طریقہ کار، مجوزہ کتب کی نشاندہی اور تھوڑی بہت مشق تدریس حدیث کے لیے متعین وقت میں ہوسکتی ہے۔ اساتذہ کرام اس باب میں طلبہ کو کیا ہدایات دیں، ان کی کیسے راہنمائی کریں، ذیل میں اس بارے میں کچھ تجاویز پیش ہیں۔

۱۔ استنباط اور استخراج کی صلاحیت کے لیے فقہ کے بعض اصولوں کی گہری سمجھ بوجھ اور عملی مشق بہت مددگار ہوتی ہے۔ مثلاً تعلیل قیاس، تحقیق مناظر، تخریج مناط وغیرہ۔

۲۔ طلبہ میں اجتہادی ذوق پیدا کرنے میں جو عناصر اہم کردار ادا کرتے ہیں، ان میں فقہ کے قواعد، **تخریج الاصول علی الفروع، تخریج الفروع علی الاصول اور علم الفروق وغیرہ** خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اساتذہ کرام دورانِ تدریس اِن علوم وفنون کی طرف راہنمائی کریں ان میں عمدہ اور اچھی کتابوں کی نشاندہی کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ خود بھی تفقہ اور تعلیم کے لیے اِن اصولوں اور قواعد کی تطبیق کا اہتمام کریں۔

۳۔ شروحِ حدیث کی کتابوں کے مختلف عنوانات میں سے ایک عنوان ''فوائد'' یا ''مسائل مستنبطہ'' کا ہوتا ہے جس کے تحت مذکورہ حدیث سے معلوم ہونے والے فوائد اور مسائل کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اساتذہ کرام تدریس حدیث میں اِن اقتباسات کو طلبہ کے سامنے بیان کریں۔ نیز سہولت ہو تو بعض فوائد اور مسائل کے ساتھ وہ قواعد اور اصول بھی بتلائیں جو اس حدیث سے اِن فوائد و مسائل کے استنباط کے لیے بنیاد بنتے ہیں۔

۴۔ اساتذہ کرام تدریس حدیث کے دوران طلبہ کے سامنے عملی نمونہ کے طور پر خود بھی عصرِ حاضر کے مسائل کا حل احادیث میں تلاش کر کے بیان کرنے کی کوشش کریں۔ اس سلسلے میں اساتذہ کرام معاصرین کی شروحِ حدیث، مخصوص مسائل پر لکھی جانے والی کتب، اور تخصصات کی ڈگری کے حصول کے لیے فقہ اور حدیث سے متعلق مقالات سے مدد لے سکتے ہیں۔

۸۔ تدریسِ حدیث آغاز وارتقاء

تدریسِ حدیث میں مصروف اساتذہ کے لیے خود اس مضمون کے آغاز وارتقاء اور عصری تجربات سے آگہی اس حوالے سے بہت مفید ہوگی کہ تدریس کی مختلف روایات میں سے جو برمحل اور مفید ہو، اس سے استفادہ کیا جاسکے۔

قدیم روایت

حدیث کے بارے میں راوی کے دو کردار ہیں۔ ایک کردار تو اس وقت آتا ہے جب اس نے حدیث حاصل کی۔ دوسرا کردار اس وقت آتا ہے جب اس نے وہ حدیث آگے بیان کی۔ علم الحدیث کے اصطلاح کے مطابق پہلے کو ''تحمل'' یعنی حدیث نبویؐ کی ذمہ داری یا امانت کو اٹھانا کہتے ہیں؛ اور دوسرے کو ''ادا'' یعنی حدیث نبویؐ کی ذمہ داری یا امانت کو ادا کرنا اور کسی اور کو سونپنا کہتے ہیں۔ یہ دو کردار جس چیز سے تعلق رکھتے ہیں اسے **علم روایۃ الحدیث** کہتے ہیں۔ یعنی کسی راوی کا حدیث نبویؐ کو سند کے ساتھ کسی شیخ سے لینا اور آگے کسی شاگرد کو بیان کردینا۔

ایک چیز ''روایت'' کے علاوہ ہے جسے ''تدریس'' کہتے ہیں۔ ''تدریس حدیث'' میں صرف حدیث نبویؐ کے متن اور اس کی سند پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے معانی، مفہوم، صحت اور ثبوت کے اعتبار سے اس کا درجہ، اس سے مستنبط ہونے والے احکام، اگر بظاہر اس حدیث کا کسی قرآنی آیت یا دوسری حدیث سے تعارض پایا جاتا ہے تو اس کو رفع کرنے کا طریقہ، غرض جملہ امور کی وضاحت ہوتی ہے۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی مرحوم نے ''محاضراتِ حدیث'' میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ و شیخ، شیخ ابوطاہر الکردی کے حوالے سے تدریس حدیث کے تین طریقے بیان کیے ہیں۔

۱۔ طریق السرد: سرد کے معنی ہیں بیان کرنا۔ یہ طریقہ اہل علم کے لیے ہے، اور خواص کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس لیے کہ وہ علم حدیث پڑھ چکے ہیں۔ حدیث کے معانی اور مطالب جانتے ہیں، علم حدیث کے سارے مباحث ان کے سامنے ہیں۔ بس شیخ کا کام اس طریقے کے تحت صرف یہ ہوتا ہے کہ اس نے خود کتاب پڑھ کر سنائی اور سب کو اجازت دی؛ یا کسی ایک طالب علم نے پڑھ کر سنائی اور شیخ نے سب کو اجازت دی اور سب طلبہ نے پڑھ کر کتاب سنائی اور سب کو اجازت دی۔

۲۔ طریق الحل والبحث: یعنی حدیث کی مشکلات حل کرنے اور مسائل پر بحث کرنے کا طریقہ۔ یہ طریقہ حدیث کے طلبہ کے لیے ہے۔ یہاں علمِ حدیث کے لغوی، فنی اور فقہی مباحث کا ذکر ہوگا۔ یعنی مشکل الفاظ کے معانی اور متونِ حدیث کے مباحث، اور فقہی مسائل کی تحقیقات کا ذکر ہوگا۔

۳۔ طریق الامعان: امعان کا مطلب ہے گہرائی سے کوئی کام کرنا۔ یعنی حدیث میں جو مسائل بیان ہوئے ہیں، ان سب پر بہت تفصیل سے گفتگو کرنا، بلکہ جو مسائل براہِ راست حدیث سے متعلق نہ ہوں بلکہ جن کا بالواسطہ تعلق ہو ان پر بھی تفصیل سے بات کرنا۔ یہ طریقہ امعان کہلاتا ہے۔

دینی مدارس میں بالعموم دوسرا طریقہ اپنایا جاتا ہے، طلبہ حدیث کے لیے اہلِ علم نے یہی طریقہ متعین کیا ہے۔ تیسرے طریقے کو شیخ ابوطاہر الکردی اور دیگر اہلِ علم نے (حدیث کے طلبہ کے لیے)

اچھا نہیں سمجھا۔اس میں ایک واضح نقصان یہ ہے کہ مدارس میں تدریس حدیث کے لیے جو مدت متعین ہے۔اس کا اکثر حصہ چند احادیث یا حدیث کے چند ابواب کی نذر ہو جاتا ہے۔اور بنیادی مسائل کے لیے وقت ہی نہیں بچتا، یا مناسب وقت نہیں رہتا۔لہٰذا اس تیسرے طریقے کے مقابلے میں دوسرا طریقہ یعنی **طریقة الحل و البحث** ہی متوازن اور مناسب ہے۔

جدید تجربات

جدید و قدیم کی بحث میں اُلجھے بغیر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ہر زمانے کے تجربات معروضی حالات کو پیش نظر رکھ کر کیے جاتے ہیں۔عصرِ جدید کے مسائل کا حل بتانے کے لیے جدید تقاضوں کے مطابق جدوجہد سے کام لینا ہوگا اس حوالے سے چند باتوں پر غور کیا جاسکتا ہے۔

ا۔مقاصدِ احکام کی رعایت: تمام اسلامی احکام،تشریعی ہوں یا تکوینی،سب میں مقاصدِ احکام کا وہ بنیادی کردار ہوتا ہے جو اِن احکام کے لیے روح کی حیثیت رکھتا ہے۔دراصل وہ تمام احکام انہی مقاصد کے گرد گھومتے ہیں۔اور اگر کسی فقہی اجتہاد میں وہ مقاصد ملحوظِ خاطر نہیں لائے گئے تو وہ اجتہاد مقبول ہی نہیں۔

اہلِ علم جانتے ہیں کہ شرعی احکام بہ تمام وکمال جزوی تفصیلات کے ساتھ قرآن مجید میں مذکور نہیں۔قرآن مجید نے چند احکام کے علاوہ باقی ہدایت کے لیے اصول اور کلی قواعد دیے ہیں۔حدیث ہی وہ مصدر اور ماخذ ہے جس میں احکام کا بیشتر حصہ جزوی تفصیلات کے ساتھ محفوظ ہے۔

اس طرح حدیث احکام کا ایک مستند ماخذ بھی ہے،اور شرعی احکام کی جزوی تفصیلات بھی پیش کرتی ہے۔اور دوسری طرف مقاصد کی اہمیت کا حال یہ ہے کہ انہی کے حصول کے پیشِ نظر احکام کو شروع کیا گیا اور نئے اجتہادات کے لیے ایک بنیادی حیثیت دی گئی۔شاید اسی تعلق کے پیش نظر امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے جب اپنی مایہ ناز کتاب ''**حجة الله البالغة**'' کا دوسرا حصہ احکام کے مقاصد اور دین کے اسرار در موز بیان کرنے کے لیے مختص کیا تو انہوں نے کسی فقہی کتاب کے بجائے احادیث ہی

سے براہِ راست مدد لی اور اسلوب یہ اپنایا کہ اولاً حدیث جو کوئی فقہی حکم دیتی ہو بیان کی اور پھر اس کے مقاصد اور احکام بیان کیے۔

مقاصدِ دین اور دین کے اسرار و رموز کی اہمیت اور حدیث کے ساتھ اس کے گہرے ربط و تعلق کے پیشِ نظر آج بھی تدریس حدیث میں مقاصد اور دین کے اسرار و رموز بیان کرنے پر توجہ مرکوز رہنی چاہیے۔ تدریس حدیث میں اگر فقہی احکام سے متعلق احادیث میں ان احکام کے مقاصد اور ان کے اسرار و رموز اور حکمتیں بیان کی جائیں تو اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ حدیث کے فہم میں گہرائی اور پختگی پیدا ہوگی، اور دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ احکام کے مقاصد ذہن نشین ہونے کے بعد طلبہ کے لیے اِن مخصوص احکام پر نئے اجتہاد کرنے میں آسانی ہوگی؛ اور استنباط و استخراج کی صلاحیت میں اضافہ ہوگا۔

۲۔ جدید تحقیقات کا تعارف: حدیث کا مفہوم، شرح اور وضاحت کرنے والے امور میں سے ایک ''عصر'' یعنی ''زمانہ'' بھی ہے۔ یعنی احادیث میں بعض ایسی حدیثیں بھی پائی جاتی جن کا مطلب، معنی اور مفہوم قرون اولیٰ میں بہت زیادہ واضح اور قابلِ فہم نہیں تھا لیکن آج کا دور اس کو واضح کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ آج سائنس کے مختلف شعبوں میں نئی دریافتوں، ایجادات اور تحقیقات کی مدد سے ان احادیث کا سمجھنا آسان ہو گیا ہے۔[۳]

اس حوالے سے احادیث کا ایک معتد بہ ذخیرہ ایسا ہے جس کی بہترین شرح آج کا دور اور آج کے دور کی سائنسی تحقیقات ہیں۔ اس جانب اہلِ علم نے توجہ بھی دی ہے اور کافی کام بھی کر رہے ہیں، بالخصوص ''**الهيئة العالميه لأعجاز العلمي فى القرآن و السنة**'' کا ادارہ تو خاص اس مقصد کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ اس ادارہ کا کام کتابی شکل میں بھی دستیاب ہے اور ان کی ویب سائٹ (quran-m.com) پر بھی موجود ہے۔ اساتذہ حدیث کو ایسے کاموں کی جانب بھی توجہ دینا چاہیے اور اپنے طلبہ کو بھی متعارف کرانا چاہیے، جس سے حدیث کے فہم میں گہری بصیرت حاصل ہوگی اور حدیث پر ایمان کا درجہ بھی بلند ہوگا۔

تاہم اس میں احتیاط کی بھی اشد ضرورت ہے اس لیے کہ سائنسی تحقیقات کے نتائج بدلتے رہتے ہیں اس لیے محض سائنسی تحقیقات کو بنیاد بنا کر کسی حدیث کے صحیح یا کمزور ہونے کا حکم نہیں لگایا جا سکتا، البتہ ثابت شدہ حقائق سے استفادہ ضرور کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ فقہی احکام سے متعلق احادیث کی تدریس کا اسلوب: احادیث کا ایک وافر ذخیرہ ایسا ہے جس کا تعلق فقہی احکام سے ہے۔ مدارس میں ان احادیث کی تدریس باریک بینی اور تفصیل کے ساتھ ہوتی ہے۔ سال کے شروع میں مدارس میں بالعموم اکثر کتابوں کو عبادات سے شروع کرایا جاتا ہے۔ اِن کو ہر استاد تفصیل سے پڑھاتا ہے۔ فقہا کے اقوال پھر ان کے دلائل اور ان کا محاکمہ اور اس کے بعد ترجیحِ راجح میں کافی وقت صرف ہوتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ مدتِ تدریس کا آدھا دورانیہ اکثر عبادات کی تدریس ہی میں صرف ہو جاتا ہے، کیونکہ بعض مسائل کی تحقیق اور تفصیل میں دو دو تین تین دِن لگ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایمانیات کے ابواب کے ذیل عقیدہ وعلم الکلام سے متعلق بعض اختلافی مسائل کی تحقیق، نیز لفظی اختلافات کی تحقیق وتفصیل پر کافی وقت خرچ کیا جاتا ہے۔

پھر کتاب ختم کرانے کے رواج کی پابندی کے پیشِ نظر دورانیہ کے باقی حصے میں کتاب کے دیگر حصوں کو جلدی جلدی اور سرسری طور پر پڑھایا جاتا ہے۔ زندگی کے دیگر پہلوؤں، مثلاً معیشت و تجارت، گھریلو معاملات، اخلاق کی اصلاح اور بین الاقوامی تعلقات وغیرہ پہلوؤں سے متعلق احادیث کی تدریس کے لیے سال کا صرف تہائی یا چوتھائی حصہ ہی بچتا ہے۔ تدریسِ حدیث کو زیادہ مفید بنانے کے لیے اس طرزِ عمل پر نظر ثانی کرنی ہوگی۔

اس معاملے میں اگر دیگر عصری یا بعض دینی مدارس کے تجربات سے فائدہ اٹھایا جائے تو حدیث کی تدریس زیادہ مؤثر اور جامع ہو سکتی ہے۔ بعض معاصر فقہا نے وضعی قانون کے ساتھ تقابل کرتے ہوئے اسلامی قانون کو فقہ الاسرۃ (خاندان)، فقہ العلاقات الدولیۃ (بین الاقوامی تعلقات) اور الاقتصاد الاسلامی (اسلامی معاشیات) وغیرہ کی قسموں میں تقسیم کیا ہے اور ہر قسم کی تدریس الگ الگ

ہوتی ہے، جس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم کو زندگی کے تمام پہلوؤں کے بارے میں اسلام کی بنیادی ہدایات و معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اگر وفاق، تنظیم یا رابطہ کی سطح پر یہ کام کرایا جائے اور تمام مدارس میں تدریس کا یہ اسلوب متعارف کرایا جائے تو اس کی افادیت اور بھی بڑھ جائے گی۔ یعنی حدیث کا ذخیرہ بھی اِن اقسام میں تقسیم کیا جائے اور پھر دیکھا جائے کہ کون سی کتاب کس موضوع کے لیے زیادہ بہتر ہے۔ مثلاً غزوات اور جہاد سے متعلق احادیث کا ذخیرہ صحیح بخاری میں بہ نسبت دیگر کتبِ حدیث کے زیادہ پایا جاتا ہے تو غزوات اور جہاد کی تدریس کے لیے صحیح بخاری کا یہ حصہ متعین ہو۔ یا مثلاً مالیات سے متعلق احادیث صحیح مسلم میں کثرت سے موجود ہیں تو معیشت وتجارت یا اقتصاد کی تدریس کے لیے صحیح مسلم کا یہ حصہ متعین کیا جائے۔

اس معاملے کا ایک عملی پہلو محلِ نظر ہے۔ وہ یہ کہ اگر اِن تمام قسموں کے لیے حدیث کی کتابوں میں حصص کا تعین کیا گیا اور سال کے آغاز میں اِن سب کو شروع کرایا گیا تو اِن سب کا ضبط کرنا طلبہ کے لیے مشکل ہوگا۔ اس سلسلے میں ایک حل تو یہ ہے کہ تدریس حدیث کے دورانیہ میں توسیع کی جائے جیسا کہ بعض مدارس میں سال کو دو یا تین حصوں تقسیم کیا گیا ہوتا ہے۔ اسی تناسب سے موضوعات کو بھی دو یا تین حصوں میں تقسیم کر لیا جائے۔ مثلاً سال کے شروع میں فقہ السیر اور الاقتصاد الاسلامی کی تدریس کے لیے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے متعین حصے شروع کرائے جائیں اور ان دونوں کے لیے اولین اور زیادہ وقت دیا جائے۔ وقت کا دوسرا حصہ اِنہی دو کتابوں کے دیگر فقہی حصوں کی تدریس کے لیے دیا جائے۔ پھر کتابوں کے اُن حصوں کی تدریس کی جائے جو مذکورہ فقہی موضوعات کے لیے متعین نہیں ہیں۔ یہی طرزِ پھر سال کے دوسرے حصے میں بھی اپنایا جائے۔

تدریس حدیث کا یہ انداز اگر اپنایا جائے تو طلبہ کو حدیث اور اس کے ذریعہ سے اسلام کی جامعیت کا بھرپور اندازہ ہوگا۔ عبادات اور ان میں بعض اختلافی مسائل کی نسبتاً غیر اہم تفصیلات میں جانے کے بجائے انسانی زندگی کے دیگر عملی پہلوؤں میں حدیث سے براہِ راست راہنمائی ملے گی۔

تدریس کے اس اسلوب کی تجویز دینے کا یہ ہرگز مقصد نہیں کہ تدریسِ حدیث میں فقہا کے اقوال کا ذکر نہ کیا جائے۔ تدریس حدیث میں مختلف فقہا کے اقوال کو توجہ دینا اپنی جگہ ایک ضروری امر ہے، کیونکہ ایک تو حدیث صرف ایک مذہب کے لیے مصدر و ماخذ نہیں بلکہ تمام فقہی مذاہب کے لیے اس کی یہی حیثیت ہے۔ تمام ائمہ ان سے استدلال کرتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ ہر جگہ ہر مذہب کے پیروکار موجود ہوتے ہیں۔

حدیث کی روشنی میں الفقہ المقارن سے واقفیت ہو تو دیگر مذاہب کے پیروکاروں کا طرزِ عمل نا آشنا نہیں رہے گا۔ تدریس حدیث میں فقہا کے اقوال کا اس لیے بھی ذکر کرنا چاہیے تاکہ ان کے تصورات معلوم ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی آراء کی صحت اور بنیاد بھی معلوم ہو۔ تاہم اس جانب انتہائی گہرائی یا بالواسطہ مسائل کی تحقیق میں جانے کے بجائے اگر وقت کو بچا کر اسے حدیث کے دیگر موضوعات کی تدریس میں صرف کیا جائے تو اس میں زیادہ افادیت ہوگی۔

۴۔ تعبیر اور زبان: ابلاغ میں تعبیر اور زبان کا کردار بنیادی حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ تعبیر و بیان جتنا عمدہ، سہل اور سمجھنے میں آسان ہوگا ابلاغ اتنا ہی مؤثر ہوگا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن میں بھی کہا ''وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ'' (ہم نے اپنا پیغام دینے کے لیے جب کبھی کوئی رسول بھیجا ہے، اس نے اپنی قوم ہی کی زبان میں پیغام دیا ہے)۔ یہاں لسان سے مراد صرف لغت نہیں بلکہ لغت سمیت اس میں محاورات، طرزِ گفتگو اور اندازِ بیان وغیرہ سب چیزیں شامل ہیں اور اس کی وجہ یہی ہے کہ نبی کا ابلاغ مؤثر ہو اور قوم کے لیے اس کو سمجھنا آسان ہو۔

یوں تو دینی مدارس میں ابتدا سے انتہا تک تمام کتابوں کی عبارات کا ترجمہ اردو یا مقامی زبان میں کیا جاتا ہے۔ مگر سچ بات یہ ہے کہ ہم لغت تو اردو یا مقامی ہی استعمال کرتے ہیں لیکن یہ ایسے الفاظ اور طرز کی زبان ہوتی ہے جسے بعض اوقات وہی زبان بولنے والا بھی مشکل ہی سے سمجھ سکتا ہے۔ یہی انداز دیگر کتابوں کے ترجموں کے ساتھ حدیث کے ترجمہ میں بھی ہوتا ہے۔ طلبہ اگر حدیث کا یہی ترجمہ سنتے رہیں، جو سلیس اور بامحاورہ نہیں ہوتا، اور یہی ترجمہ کرنے کی ان کی عادت بن گئی تو عوام کو

ان کی بات سمجھنے میں مشکل ہوگی اور اس طرح ان کا ابلاغ غیر مؤثر ہوگا۔

لہٰذا مدارس میں تمام اساتذہ کے لیے بالعموم اور اساتذہ حدیث کے لیے بالخصوص لازم ہے کہ وہ ترجمہ بامحاورہ اور مزید سلیس کریں اور طلبہ کو بھی ایسے ہی ترجمہ کرنے کا عادی بنائیں۔ نیز وضاحت اور تشریح وتقریر میں گفتگو کا وہ انداز اور روزمرہ اسلوب اپنائیں جو عام لوگ بھی آسانی کے ساتھ سمجھ سکیں۔

۵۔ سائنسی وتکنیکی ذرائع کا استعمال: علوم الحدیث مسلمانوں کا بیش بہا ذخیرہ ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اسنادو متون اور اس فن پر لکھی گئی کتابوں کی وسعت اس حد تک جا چکی ہے کہ کسی بھی فرد کے لیے اس کا مکمل احاطہ نہایت غیر معمولی صلاحیت کا تقاضا کرتا ہے۔ لیکن سائنس کی ایجادات بالخصوص کمپیوٹر نے متون، اسناد اور علوم وفنون کی وسعتوں کو سمیٹ کر ہمارے سامنے رکھ دیا ہے اور اس اعتبار سے علم حدیث کو بھی آسانی کے ساتھ قابلِ فہم بنایا ہے کہ اب کسی حدیث کی مختلف اسناد اور کئی متون تک رسائی بہت آسان ہو چکی ہے۔

Google پر ہر قسم کی حدیث کی تخریج آسانی کے ساتھ کی جاسکتی ہے۔ بس اس کے Search option میں متعلقہ حدیث کے کچھ الفاظ دیے جائیں اور کلک کیا جائے تو Google کئی کتابوں سے پوری حدیث نکال کر پیش کر دے گا۔

اس کے علاوہ انٹرنیٹ پر کئی ایسی ویب سائٹس (مثلاً ''**المکتبة الوقفية**'' وغیرہ) ہیں جہاں PDF میں لاکھوں روپے مالیت کی کتابیں، بلکہ بعض ایسی کتابیں، جو اَب بالکل نایاب ہو چکی ہیں یا جن تک رسائی بہت مشکل ہو گئی ہے، اور اس کے علاوہ مخطوطات اور معاجم دستیاب ہیں اور انہیں بہ سہولت ڈاؤن لوڈ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ ویب سائٹس (مثلاً ''**ملتقیٰ اهل الحديث**'' وغیرہ) ایسی بھی ہیں جن میں کتابوں اور علمی مسائل پر اہل علم کے درمیان مباحثوں اور آراء کا تبادلہ ہوتا ہے جس سے ہر کوئی بہ سہولت استفادہ کر سکتا ہے۔ نیز ایسے سوفٹ ویئرز (مثلاً ''**المكتبة الشاملة**'' وغیرہ) تیار کیے گئے ہیں جن میں سیکڑوں اور ہزاروں کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے۔ ان سوفٹ ویئرز میں حدیث کی تخریج متونِ حدیث کی کتابوں سے کی جاسکتی ہے۔

عالم اسلام بلکہ پوری دنیا میں کئی شخصیات، مجلّات اور ادارے ایسے ہیں جن کی قدر و منزلت، خدمات اور کام کا معیار مسلمہ ہے۔ انٹرنیٹ پر تقریباً ان سب کی ویب سائٹس موجود ہیں، جن پر ان کا سارا کام آڈیو ویڈیو شکل میں پروگرامات، رپورٹس اور تحقیقی مجلّات، کتابیں اور علمی مقالات وغیرہ موجود ہیں اور ان تک ہر آدمی کے لیے آسانی کے ساتھ رسائی ممکن ہے۔

اساتذہ حدیث کو دورہ حدیث میں طلبہ بالخصوص تخصص کے طلبہ کو ان سائنسی تحقیقات اور تکنیکی ذرائع سے استفادہ کرنے کی طرف متوجہ کرنا چاہیے اور اُنہیں ممکنہ حد تک اس باب میں راہنمائی دینے کے قابل ہونا چاہیے۔

اِن ذرائع کے استعمال کا ایک فائدہ تو وقت اور رقم کی بچت کی صورت میں ہوگا کہ کتابوں سے براہ راست حدیث کی تخریج پر بہت وقت صرف ہوتا ہے۔ اور اس سے پہلے لاکھوں روپے مالیت کی کتابیں جمع کرنا بھی ہر کسی کے بس میں نہیں۔ دوسرا فائدہ پورے عالم اسلام میں حدیث پر ہونے والے کام سے آگاہی کا ہوگا۔ چند منٹ میں ان اہلِ علم کی آراء اور مباحث وتحقیقات سے مستفید ہونا ممکن ہو جائے گا۔

٦۔ **مشکل الحدیث ومختلف الحدیث پر کام کی ضرورت:** سائنسی وتکنیکی ذرائع سے استفادہ کرتے ہوئے یہ بات دہرانے کی ضرورت ہے کہ جس طرح آج سے قبل بھی کسی فرد کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ بدنیتی کے ساتھ تحریف پر مبنی تحریریں اور کتب شائع کردے، انٹرنیٹ پر اس کے خدشات اور بھی زیادہ ہیں۔ طلبہ کو اس حوالہ سے محتاط رہنا ہوگا۔

حجیتِ حدیث سے انکار کرنے والے گروہ کا ایک حربہ یہ بھی ہے کہ وہ چند احادیث کا قرآن مجید کے ساتھ تقابل کرتے ہیں اور تعارض نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر قرآن مجید کو استناد کا اولین درجہ دے کر تمام احادیث کو مسترد کرتے ہیں۔ یا احادیث کو تجربات ومشاہدات اور عقل کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ حدیث کے رموز کو سمجھے بغیر بظاہر حدیث کے فہم میں جو مشکل پیش آرہی ہوتی ہے اس کی بناء پر

احادیث کا پورا نظام نا قابلِ اعتبار قرار دے دیتے ہیں۔لیکن اس طرح کی سوچ رکھنے والے لوگوں کی تمام تر کوششوں کے باوجود مسلمانوں کا اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے ساتھ تعلق نہ ٹوٹ سکا اور نہ ٹوٹ سکتا ہے(ان شاءاللہ)۔اس کے سدّ باب کے لیے محدّثین ہی نے ایک مستقل علم ’’مشکل الحدیث‘‘ کے نام سے وضع کیا اور کئی کتابیں لکھی گئیں۔

دوسری طرف بعض اوقات احادیث کا ذخیرہ کھنگال کر باہم متعارض حدیثوں کی نشاندہی کی جاتی ہے اور اس طریقے سے حدیث پر سے اعتماد اور استناد ختم کرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔اس کی روک تھام کے لیے محدثین نے ’’مختلف الحدیث‘‘ کے نام سے ایک مستقل فن وضع کیا اور کئی کتابیں لکھی گئیں۔

عصر حاضر میں ’’مشکل الحدیث ‘‘سمیت حدیث کے معنوی پہلو پر کام کو آگے بڑھانے کی ضرورت نہ صرف بڑھ گئی بلکہ چیلنج کی شکل اختیار کر گئی ہے۔دوسری جانب اس کام کے لیے آسانیاں اور امکانات بھی زیادہ ہو گئے ہیں۔ضرورت تو اس لیے بڑھ گئی ہے کہ نظام کائنات سے متعلق احادیث میں جن موضوعات پر بات کی گئی ہے ان میں سے کئی چیزوں کے بارے میں گزشتہ زمانوں میں بیشتر طبعی علوم خاموش تھے یا ان کے پیش کردہ نظریات محض تخمینوں پر مبنی تھے،اس لیے ان نظریات کو بجا طور پر علمی اعتبار سے غیر ثابت شدہ قرار دے دیا جاتا تھا۔اب ان میں کئی امور پر جدید سائنس نے نہ صرف سکوت توڑا ہے بلکہ محض تخمینوں کے بجائے تجربے اور استقراء پر مبنی نظریات پیش کر دیے ہیں۔اب گویا ان میں سے کئی امور عقلی ثبوت کے اس درجے تک پہنچ چکے ہیں،جس سے نقل صحیح کا تعارض نہیں ہو سکتا۔اب ان احادیث میں دی گئی معلومات اور ان سائنسی نظریات کا تقابلی مطالعہ ضروری ہو گیا ہے۔ چنانچہ اب ان نظریات کو غیر ثابت شدہ کہہ کر نہ ماننے والی بات مناسب نہیں۔اسی طرح اب عمرانی علوم (Social Sciences) سوشل سائنسز میں عقلی اعتبار سے مجرد عقلی مقدمات ہونے کو کافی نہیں سمجھا جاتا بلکہ اکثر باتوں کو ان نتائج و آثار کے حوالے سے پرکھا جاتا ہے،اور آثار و نتائج پرکھنے کے لیے خالص اندازوں اور تخمینوں کے بجائے شماریاتی طریقوں پر بھی انحصار کیا جاتا ہے۔

معنوی پہلو سے اس کام کے امکانات بڑھنے اور آسانیاں پیدا ہونے کی سب سے پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اس نوعیت کے کام کی پہلی سیڑھی ہر حدیث کے تمام طرق وروایات کو یک جا کرنا ہے اور اس کام کے لیے آج کے دور نے بڑی سہولتیں پیدا کردی ہیں۔اس آسانی کی دوسری وجہ یہ ہے کہ پہلے بہت سی احادیث ایسی تھیں جنہیں حل کرنے کے لیے مروج طبعی علوم سے کوئی مدد نہیں ملتی تھی جبکہ آج سائنس کے مختلف شعبوں میں نئی نئی دریافتوں، تحقیقات اور ایجادات نے بہت سی احادیث کو سمجھنا آسان کردیا ہے۔اس لیے کہ کئی جگہوں پر آج کی سائنسی تحقیق کے نتائج وہی باتیں ہیں جو چودہ صدیاں پہلے حضور اقدس ﷺ نے بیان فرمادی تھیں۔[۴]

تدوین حدیث میں محدثین کے وضع کردہ اصول وضوابط

اہلِ علم اس حقیقت سے واقف ہیں کہ مسلمانوں اوران کے علمی ورثے پر حملہ کرنے کے لیے اور اسلامی لٹریچر کے ساتھ مسلمانوں کا اعتماد کی صورت میں قائم رشتہ توڑنے کیلئے ''استشراق'' کی تحریک کی بنیاد رکھی گئی چنانچہ اس سلسلے میں ''مستشرقین'' نے اسلامی قانون کے مصدر دوم یعنی احادیثِ نبویؐ پر بھی اعتراضات اٹھانے اور غلط فہمیاں پیدا کرنے پر اپنا زور صرف کردیا۔ان کے اعتراضات میں سے ایک اعتراض جس کی رو میں کچھ غیر مغربی دانشور بھی بہہ گئے یہ تھا کہ حدیث کی جملہ تحریری کتابیں عہدِ رسالتؐ کے دوصدیوں بعد مرتب ہوئی ہیں۔اس ضمن ایک اعتراض تو یہ ہے کہ اِن کتابوں میں نبی کریم ﷺ کے الفاظ واحادیث ٹھیک طور پر موجود نہیں، کیونکہ کس طرح یقین کیا جاسکتا ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ سے صادر ہونے والے اقوال وافعال پر مشتمل ہزاروں حدیثیں دوسوسال تک محفوظ رہی ہوں اور پھران کتابوں میں شامل ہوگئی ہوں۔دوسرا اعتراض یہ ہے کہ خلفاء راشدین کے دور کے بعد مسلمانوں میں سیاسی اختلافات پیدا ہوئے تھے، مختلف فرقے اور حکومتیں قائم ہوئی تھیں، لوگ اپنے فرقے اور لیڈر کے حق میں اور مخالفین کے خلاف خودساختہ احادیث تراشنے لگے تھے، حکمرانوں کا قرب اوراُن سے مال ومتاع اور معاشرے میں محدث ہونے کے بناء پر عزت ومرتبت کے حصول کے لیے لوگ جھوٹی حدیثیں بیان کرنے لگے تھے۔ اسی طرح صحیح حدیثوں کا جتنا بھی ذخیرہ تھا وہ

سارا 'موضوع' اور من گھڑت حدیثوں کے ساتھ خلط ملط ہو کر نا قابلِ اعتماد ہو گیا تھا۔ ایسے میں صحاح اور دیگر کتب حدیث کے مؤلفین نے (نعوذ باللہ) محض دنیوی جاہ و منزلت کے حصول کی خاطر جھوٹی اور غلط حدیثوں کے ذخیرے مدون کیے اور لوگوں میں مشہور کرا دیے۔

اِن اور اس طرح کے دیگر کئی اعتراضات کا جواب تاریخ اسلام اور علم الحدیث کی تاریخ میں سے ڈھونڈنا محدثین کا ایک اہم فریضہ رہا ہے اور اپنے طلبہ کے سامنے علوم الحدیث میں تحقیق کا یہ پہلو بھی زیرِ بحث لانا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس موضوع پر کس نے کتنا کام کیا ہے، اور آج کیا کام ہو رہا ہے نیز اس سلسلے میں اور کیا کام باقی ہے۔ یہ تمام تفصیلات طلبہ کو فراہم کرنا اور خود بطورِ مشق اُن سے اس سلسلے میں کام کروانا تدریسِ حدیث کے منصب کے ذمہ داریوں میں شامل ہے۔

اس ضمن میں بطورِ تجویز چند امور پیش کیے جاتے ہیں۔

۱۔ بنیادی طور پر تو تدوین حدیث کے متعلق بتایا جائے کہ حدیث کی تدوین کس طرح ہوئی۔ کیا قرآن کریم کو مصحف کے طور پر محفوظ کرنے کی طرح محدود وقت میں مخصوص لوگوں نے یہ کام سرانجام دیا، یا اس میں کوئی طویل وقت لگا؟ ظاہر ہے کہ تدوینِ حدیث کا کارنامہ محدود وقت میں کچھ مخصوص لوگوں کے ہاتھوں سرانجام نہیں دیا گیا، بلکہ کئی صدیاں اس میں لگی ہیں۔ لاکھوں لوگوں نے عظیم قربانیوں، مشقتوں اور صبر و استقامت کے ساتھ یہ کام کیا ہے۔

۲۔ اس ضمن میں طلبہ کے ذہن نشین کرنے والی دوسری اہم بات، جو ہمارا عنوان بھی ہے، یہ ہے کہ احادیث کی تدوین میں تحقیق کے لیے کیا شرائط اور اصول رکھے گئے۔ نیز یہ کہ تدوینِ حدیث کے مختلف مراحل میں، مختلف سیاسی و سماجی حالات میں، مختلف ادوار میں ان شرائط اور اصولوں میں بہتری کے لیے کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ مختلف لوگ احادیث قبول کرنے کے لیے سابقہ شرائط و اصول میں اپنے تحقیقی ذوق کے مطابق کیا کچھ حذف و اضافہ کرتے رہے ہیں۔۵

مثال کے طور پر صحابہؓ کرامؓ کا دور تدوینِ حدیث کے اوّلین مراحل میں شمار ہوتا ہے۔ تاریخ

کے کئی واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ:

۱۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ بعض اوقات ایک شخص کی روایت کردہ (خبرِ واحد) کو قبول کرنے میں تأمل کرتے تھے اور کسی حدیث کو قبول کرنے سے پہلے ایک سے زائد صحابہؓ سے اس حدیث کی تصدیق کا اہتمام کرتے تھے۔

۲۔ بعض صحابہؓ محض خبر کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کے بجائے رسول اللہ ﷺ سے براہِ راست حدیث سننے والے اُس صحابیؓ سے خود جا کر ملنے کا اہتمام کرتے تھے اور اس حدیث کی براہِ راست تصدیق حاصل کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں انہیں بہت طویل سفر بھی کرنے پڑتے تھے۔

۳۔ حضرت عمرؓ نے اس اصول کو واضح طور پر بیان کیا ہے کہ کتاب اللہ اور سنتِ نبویؐ میں تعارض ممکن نہیں ہے۔ اگر تعارض نظر آئے تو ہوسکتا ہے کہ یہ حدیث بیان کرنے والے کی یادداشت کی کمزوری کی بنیاد پر ہو۔

حدیث میں تحقیق کا شوق اور صلاحیت پیدا کرنا

علم الحدیث کے بارے میں ایک غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ علم الحدیث کے متعلق تحقیق وجستجو کا جتنا کام ہونا تھا وہ ہو چکا، اب مزید کسی کام کی ضرورت نہیں رہی۔ احادیث ترتیب وتدوین کے مختلف مراحل سے ہوتے ہوئے ہم تک پہنچی ہیں، جرح وتعدیل اور رجال کے متعلق تمام معلومات موجود ہیں، دوبارہ ان کو چھیڑنا بے فائدہ ہے۔ لیکن یہ نقطۂ نظر غلط فہمی سے زیادہ کم ہمتی پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ اساتذہ حدیث طلبہ میں یہ تاثر پیدا نہ ہونے دیں کہ علم حدیث کے متعلق جتنا کام ہونا تھا ہو چکا اور اب اس کو محض آثارِ قدیمہ کے طور پر پڑھایا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ حدیث کے تمام علوم وفنون کی آج بھی وہی اہمیت ہے جو متقدمین علماء کے ادوار میں تھی، اور اِن علوم میں تحقیق کے اب بھی بہت سے ایسے گوشے موجود ہیں، اور سامنے آتے رہیں گے، جو اہل علم اور طلبہ کی توجہ اور کام کے منتظر ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ طلبہ کو علم حدیث کی ایسی نئی جہات اور نئے موضوعات کی طرف

راہنمائی دی جائے جو تحقیق کے مستحق ہیں۔اس سلسلے میں عرب جامعات[۶] کے کام سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔انہوں نے حدیث کو نئی جہتیں عطا کیں جدید موضوعات پر ایسے تحقیقی کام کرائے گئے جنہیں نظر انداز کیا گیا تھا۔

دورانِ تدریس مختلف نئے موضوعات پر عملاً بھی طلبہ سے کام کرایا جائے۔ان کی تحقیقی اور فکری طاقت کو پروان چڑھانے کے لیے پروگرامات کا انعقاد کیا جائے۔بطورِ تمرین مقالات اور مضامین لکھوائے جائیں۔

۹۔ محدثین کی خدمات

حدیث کی تدریس نبیؐ کے ساتھ ایک خاص تعلق اور رشتہ پیدا کرتی ہے۔یہ کارِ نبوت سے ایک نوعیت کی مماثلت و مشابہت ہے۔اس لیے فضلیت کے ساتھ ساتھ کام اور ذمہ داری میں بھی حدیث کے استاد کے لیے نبیؐ کا وارث ہونا ضروری ہے۔اور یہ واضح ہے کہ قرآن کی روشنی میں منصب نبوت کی ذمہ داری میں تعلیم کے ساتھ ساتھ تزکیہ اور اخلاق کی اصلاح بھی شامل ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ قرن مجید اور سنت منطق و فلسفے کی طرح محض نظری و عقلی علوم نہیں ہیں، بلکہ ان سے بنیادی مقصود انسان کی روحانی اصلاح اور اس کے اعضاء سے صادر ہونے والے اعمال اور کردار کی تصحیح ہے۔

حدیث کے اساتذہ دورانِ تدریس طلبہ کی روحانی تربیت اور اندرونی و بیرونی اصلاح پر خاطر خواہ توجہ مرکوز رکھیں۔اور ان کی یہ ذہن سازی کریں کہ علماء صرف فضلیت میں انبیاء کے وارث نہیں بلکہ منصب نبوت کے ساتھ جو فرائض اور ذمہ داریاں منسلک ہیں، آج کے دور میں انہیں سنبھالنا بھی ان ہی کی ذمہ داری ہے۔ان ذمہ داریوں کو نبھانے میں انبیاء کو جن مشقتوں اور صعوبتوں کو جھیلنا پڑا، فقر و افلاس کا سامنا کیا، امت کی تعلیم و تربیت کی خاطر قربانیاں دیتے رہے، بے خوابی اور بھوک کی مشقتوں کو برداشت کیا، ایسی ہی آزمائشوں اور امتحانات کا سامنا آج بھی علماء کو ہوسکتا ہے۔ان کے لیے ذہنی طور پر ہمہ وقت تیار رہنا، اور سامنا کرنے کی صورت میں ان پر صبر کرنا شیوۂ پیغمبری ہے۔

اس سلسلے میں اساتذہ حدیث کتاب وسنت کی ان نصوص سے بھی مدد لے سکتے ہیں، جن میں پچھلے انبیاء کے واقعات ذکر ہیں۔ ہمارے نبی کریم ﷺ کو بھی دیگر انبیاء کی طرح آزمائشوں اور مشقتوں کے آنے کی صورت میں تسلی دی گئی اور مختلف مواقع پر نصرتِ خداوندی کی بشارتیں دی گئیں۔

اس کے علاوہ ایک اور اہم مؤثر ذریعہ اُن قدیم محدثین اور راویانِ حدیث کے حالات ہیں جن کے نام پڑھائی جانے والی کتب حدیث میں متون کے اسانید میں آتے ہیں۔ ویسے بھی تعلیمی وتدریسی پہلو کے اعتبار سے ان محدثین کا تعارف، بقدرِ ضرورت ان کے حالات اور دیگر محدثین کی نظر میں ان کے مرتبہ ودرجہ پر گفتگو کرنا استادِ حدیث کے لیے ضروری ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ تزکیہ وتربیت کا پہلو اُجاگر کرنے کے لیے ان محدثین کی للٰہیت وتقویٰ، زہد اور عبادتوں کے حالات بھی بیان کیے جائیں۔ کیونکہ ان تمام محدثین کے حالات آج ہمارے پاس ''**اسماء الرجال**'' پرلکھی گئی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ان کے حالات پرغور کرکے مشقتوں اور آزمائشوں پرصبر واستقامت اور قربانیوں کے ایسے متعدد پہلو نکلتے ہیں جنہیں سن کرآج انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

علم حدیث کے حصول اور بعض اوقات صرف ایک یا کئی حدیثوں کی تحقیق بلکہ اس سے ایک قدم اور آگے بڑھ کر صرف اپنی سند کے علو کے لیے محدثین نے وسائل اور سہولیات سے خالی اُس دور میں جو طویل سفر اختیار فرمائے تھے، آج کے ترقی یافتہ دور میں اسباب، سہولیات اور وسائل کے ماحول میں پروردہ ذہن ان کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ مثلاً جابر بن عبداللہؓ نے صرف ایک حدیث کی تحقیق اور الفاظِ نبویؐ معلوم کرنے کی غرض سے مدینہ منورہ سے شام کا سفر کیا۔ دوسرے موقع پر کسی ایک حدیث ہی کی تحقیق کے سلسلے میں مدینہ منورہ سے مصر کا سفر کیا۔ اس طرح ابوایوب انصاریؓ نے بھی ایک حدیث کی تحقیق کے سلسلے میں مدینہ منورہ سے مصر کا سفر کیا تھا۔ تاریخ میں یہ محض چند واقعات ہی نہیں ہیں، بلکہ صحابہ کرامؓ اور ان کے بعد کے دور میں سیکڑوں کی تعداد میں ایسے واقعات ملتے ہیں۔

تربیت اور تزکیہ کا ایک اور پہلو استغناء، دنیا سے بے رغبتی، تصحیح نیت اور کامل اخلاص بھی ہے۔

اساتذہ کرام طلبہ کی ذہن سازی کریں کہ وہ علم صرف انسانوں کی خدمت اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لیے حاصل کریں، دنیا کے مال و متاع کا حصول یا کسی عہدے پر فائز ہونا کبھی بھی علم الحدیث کے حصول سے مقصود نہ ہو۔ اسماء الرجال کی کتابیں اس قسم کی مثالوں سے بھی بھری پڑی ہیں۔ سیکڑوں کی تعداد میں ایسے واقعات ملتے ہیں جہاں محدثین کو بڑے بڑے عہدوں اور خطیر اموال کی پیشکش ہوئی مگر محدثین نے یہ کہہ کر انہیں ٹھکرا دیا کہ ہم صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لیے علم حاصل کرتے اور اس کی خدمت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی سے اس کا اجر مقصود ہے، کوئی دنیوی اجر نہیں چاہتے۔

......حواشی ......

۱۔ اخذ واستفادہ: ''تدریس حدیث اور عصر حاضر''، ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ، مئی/ جون/ ۲۰۰۹ء۔ ترجمان السنۃ، مولانا بدرِعالم میرٹھی۔

۲۔ امام شافعیؒ نے اپنی مایہ ناز کتاب ''الرسالۃ'' (ص۹۱ و مابعدہ) میں اس پر گفتگو کی ہے۔ اور اس کی مزید وضاحت ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی نے بھی اپنی کتاب ''السنة و مكانتها فی التشريع الاسلامی'' (صفحہ ۳۷۹ و مابعدہ) میں کی ہے۔

۳۔ اس کی ایک مثال یہ بھی دی جاسکتی ہے کہ ماضی میں بالخصوص عہدِ رسالتؐ میں لوگوں میں مشہور تھا کہ بچے کی تخلیق صرف مرد کے پانی سے ہوتی ہے اور عورت محض اس تخلیق اور نشو و نما کا محل ہے۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے اس کو رد کرتے ہوئے فرمایا کہ عورت کے اجزاء بھی استقرارِ حمل میں کردار ادا کرتے ہیں۔ جدید سائنس میں مرد و زن کے کروموسومز (Choromosomes) کے حقائق ظاہر ہونے کے بعد تخلیق انسانی کے وہ اسرار بھی کھل رہے ہیں جن کا ذکر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا۔ تفہیمِ حدیث کا استاد اِن سائنسی حقائق سے جس قدر آگاہ ہو تدریسی عمل اسی قدر کامیاب اور مؤثر ہوسکتا ہے۔

۴۔ مولانا مفتی محمد زاہد، ماہنامہ الشریعہ، مئی- جون ۲۰۰۹ء، ص۶۴-۶۵

۵۔ تدوین حدیث کے تاریخی اور علمی مطالعہ کے لیے ملاحظہ ہو:

۱۔ السنة قبل التدوين از محمد عجاج الخطيب۔

۲۔ منهج تدوين الحديث النبوی الشريف و السنة النبوية المطهرة از زهدی جمال الدين محمد

نیز یہ ویب سائٹ دیکھیے: (forum.stop55.com1351961.html)

۶۔ مثلاً جامع الازہر، مصر۔

تدریسِ فقہ

مولانا محمد رفیق شنواری

I۔ ضرورت واہمیت، تاریخ اور مختلف مذاہب کا تعارف

اُمت مسلمہ کا فقہی ورثہ مختلف جہات سے اس طرح تنقید کا نشانہ بنایا جارہا ہے کہ محض عام افراد ہی نہیں بلکہ اچھے خاصے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد اور بعض اوقات خود دینی حلقوں سے وابستہ افراد اشکالات کا شکار ہوجاتے ہیں۔ ان اشکالات اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کے ساتھ ساتھ چند امور کا تدریس فقہ کے آغاز میں اور تدریس کے دوران میں خیال رکھنا ضروری ہے۔ ایک بڑا اشکال یا اعتراض فقہ اسلامی پر یہ کیا جاتا ہے کہ فقہ اسلامی رومی قانون سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہ اعتراض چند مستشرقین بڑے شدومد کے ساتھ کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک سوال یہ بھی اٹھایا جاتا ہے کہ قدیم ادوار ہی سے فقہا آپس کے اختلافات میں الجھ گئے اور بعد والے اپنے اپنے اماموں کے دفاع اور دوسروں کی عیب جوئی میں لگے رہے، جس کی وجہ سے اسلامی قانون جامد رہا اور اس میں عصر حاضر کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔ اسی طرح عصر حاضر کے چند مفکرین فقہ اسلامی کو کتاب وسنت پر ایک بوجھ سمجھتے ہیں۔ اس تناظر میں فقہ کی تدریس کے آغاز ہی میں مبادیات کے طور پر فقہ کا تعارف کراتے ہوئے مکمل وضاحت کے ساتھ طلبہ پر یہ واضح کیا جائے کہ فقہ اسلامی کتاب وسنت پر بوجھ نہیں بلکہ اس کی حیثیت قرآن کریم اور سنت نبوی کے لیے شارح اور خادم کی ہے۔ فقہ بذاتِ خود نہ تو کتاب وسنت سے الگ کوئی چیز ہے، اور نہ نصوص سے زیادہ قوی، اور نہ اس کے برابر۔ بلکہ علم فقہ جہاں کتاب وسنت کی نصوص کی تشریح اور مفاہیم کی توضیح کرتا ہے وہاں کتاب وسنت کے مقام ومرتبت کی حفاظت بھی کرتا ہے۔

فقہ: ضرورت واہمیت اور تعارف

فقہ کی حقیقت واضح کرنے کے بعد فقہ کی ضرورت واہمیت بتلائی جائے۔ یہ احساس دلایا جائے کہ کتاب وسنت کے احکام اور تعلیمات کو سمجھنے میں فقہ اسلامی اور متقدمین ائمہ کی کاوشوں سے کس طرح مدد ملتی ہے۔اوران اسلاف کی کوششوں کونظر انداز کر کے ازخود نصوص سے تمام احکام کا استخراج کر کے ازسرنو مرتب کرنے میں کن مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا۔تمام محدثین اور ائمہ فقہ واجتہاد کی محنت اور کوششوں کی اہمیت کے حوالہ سے یہ شعور پیدا کیا جائے کہ وہ لوگ جو فروعی مسائل میں فقہا کے اختلافات کوفقہ اسلامی کے تخلف کا سبب قرار دے رہے ہیں ان ہی فقہا کی سوچ اتنی دُوررَس تھی، اور وہ غور وفکر میں اتنی بصیرت اور طاقت کے مالک تھے کہ انہوں نے صرف اپنے زمانے ہی کا نہیں بلکہ اپنے دور سے بعد تک کا احاطہ کرلیا تھااور **الفقہ التقدیری** کی طرح ہزاروں مسائل پر مشتمل وافر ذخیرہ چھوڑا تھا۔قرآن وسنت کے علوم کے وسیع وعریض دریا میں غواصی کر کے وقت کے تقاضوں میں رہبری حاصل کرنا ہر فردِ بشر کے بس کی بات نہیں۔اس لیے ماضی کے فقہا اور محدثین ومفسرین اور ان کی کاوشیں ہمارے لیے نعمت ہیں اور نہایت قدر کے ساتھ ان سے استفادہ کرنا چاہیے۔فروعی مسائل میں ان کے اختلافات احکام اسلام میں وسعت کا مظہر ہیں، جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے سہولت رکھی ہے۔ان میں کسی کو ترجیح دینے کے لیے آج بھی غور وفکر کا دروازہ کھلا ہے اور دلائل کا ذخیرہ بھی موجود ہے۔

تاریخ فقہ اسلامی

تدریس فقہ کے حوالہ سے دوسرا اہم عنوان خود فقہ کی تاریخ ہے۔اہلِ علم واقف ہیں کہ ہر علم بالکل اپنے آغاز میں انگلیوں پر گنے جانے والے چند مسائل کا مجموعہ ہوا کرتا ہے۔تاہم خود علم کی تدوین اور حالات میں تبدیلی کے ساتھ رفتہ رفتہ اس کا حجم بڑھتا جاتا ہے، اور جس طرح ہر دور کے تقاضوں سے اُسے ہم آہنگ کرنے کے لیے اس میں اضافے کیے جاتے ہیں۔اسی طرح اسے تہذیب وتنقیح کے مراحل سے بھی گزارا جاتا ہے۔اس بناء پر فقہ بھی بالکل اپنی ابتدا میں صرف چند

احکام کے فہم کا نام تھا، پھر فطری طور اس کا حجم اس طرح بڑھتا چلا گیا کہ یہ آج ہمارے پاس اس شکل میں موجود ہے کہ اس کا ایک ایک باب مستقل علم کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ یہی حال تمام اسلامی علوم کا ہے۔ اسلامی علوم اور بالخصوص فقہ اسلامی کے اس سرعت کے ساتھ وسیع ہونے کے پیش نظر بہت سے اہل علم فقہ کے طالب علم کے لیے اس کی تاریخ اور تدوین وترتیب کے مختلف مراحل کا مطالعہ بھی اہم اور ضروری قرار دیتے ہیں۔ فقہِ اسلامی کی تاریخ پر نظر ڈالنے کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ ان اسباب کو سمجھا جائے جن کی بدولت فقہ اسلامی انحطاط اور کمزوریوں کا شکار رہی تا کہ طلبہ اپنے اس سفر میں اُن سے احتراز کریں اور دوسری جانب ان اسباب کا تعین کیا جائے جن کی بناء پر فقہ اسلامی نشو ونما اور ارتقا کی منازل سرعت کے ساتھ طے کرتی رہی تا کہ طلبہ مستقبل کے لیے اس سفر میں انہی مناہج پر چلیں۔

علماء نے فقہ اسلامی کی تاریخ جاننے کے کئی فوائد لکھے ہیں۔ مثال کے طور پر:

۱۔ فقہِ اسلامی کا اولین دور، جسے تاسیسی مرحلہ کہا جاتا ہے، وہ عہدِ نبویؐ ہے، جس میں براہِ راست اللہ تبارک وتعالیٰ احکام نازل فرماتے تھے۔ اس مرحلے میں نزولِ احکام کے اسباب کا پتہ چلتا ہے جس کا ایک بڑا فائدہ تشریع اور احکام دینے میں شارع کا منشا اور حکمت ومصلحت کا جاننا ہوتا ہے۔ اور کوئی بھی حکم دیتے وقت مکلّف کی حالت کو دیکھ کر کیا انداز اختیار کیا گیا اس کا سلیقہ سمجھ میں آ جاتا ہے۔

۲۔ اس کے بعد خلفاء راشدینؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ کا دور آتا ہے۔ ان کے پاس کسی مسئلے کا حل نص کی صورت میں نہ ہوتا تو وہ ان مسائل میں شرعی احکام بتانے میں کیا اسلوب اختیار کرتے تھے۔ اس طرح ان کے بعد تابعین وتبع تابعین اور دیگر علماء فقہ وحدیث کا دور شروع ہوجاتا ہے۔ وہ اپنے دور کے نئے مسائل کا حل شریعت کی روشنی میں کس طرح بتاتے تھے، احکام اسلام کے استخراج میں ان کے کیا اسالیب تھے۔ فقہ اسلامی کے ان ادوار کا مطالعہ کرنے سے یہ مختلف اسالیب سامنے آجاتے ہیں اور ان اسالیب کی معرفت فقہ کے طالب علم کے لیے اہمیت کی چیز ہے۔

۳۔ مستشرقین کی طرف سے اسلامی علوم اور بالخصوص فقہ اسلامی پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان سب یا بیشتر اعتراضات کا جواب فقہ اسلامی کی تاریخ کے مطالعے کے بعد آسانی سے دیا

جاسکتا ہے۔

۴۔ فقہ اسلامی کی تاریخ طلبہ کے سامنے رکھنے کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ مختلف مراحل میں فقہ کے سفر کو صحیح سمت پر رکھنے والے عوامل اور بعض اوقات اس کے ارتقا میں رکاوٹیں پیدا کرنے والے اسباب کا پتہ چل جاتا ہے۔ جن کی روشنی میں طلبہ بآسانی اپنے اس فقہی سفر کے لیے لائحہ عمل طے کر سکتے ہیں۔

فقہ اور فقہا کی تاریخ پر کئی صدیاں پہلے کام شروع ہو چکا تھا چنانچہ اس موضوع پر اساتذہ کی تیاری کے لیے متقدمین کی بھی کتابیں موجود ہیں اور متاخرین بالخصوص ماضی قریب اور عصر حاضر کے اہل قلم کی بھی۔ لیکن متقدمین اور متاخرین کے کام میں ایک واضح فرق ہے۔ اور وہ یہ کہ متقدمین فقہ سے زیادہ فقہا اور ان کے کام کا تعارف کراتے ہیں کہ فلاں فقیہ کس دور میں پیدا ہوا کن حضرات سے پڑھا اور خود کیا کام کیا۔ اس سے بآسانی ہر دور میں علمِ فقہ کی صحیح کیفیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اس موضوع پر متقدمین کی کتابیں اکثر **طبقات الفقهاء** کے عنوان سے لکھی گئی ہیں جن میں اکثر و بیشتر نے فقہی مذاہب کی ترتیب سے لکھا ہے۔ مثلاً حنفی، شافعی۔ اسی طرح دیگر مذاہب کے فقہا کے لیے الگ الگ کتابیں لکھی گئی ہیں۔

متقدمین کے اسلوب کے برخلاف متاخرین نے اس تاریخ کو مرتب کرنے کا ایک الگ اسلوب اپنایا۔ چنانچہ معروف مالکی عالم شیخ محمد بن الحسن الحجوی الثعالبی (متوفی ۱۳۷۶ء) نے جب فقہ کی تاریخ پر اپنی مشہور کتاب **الفكر السامي في تاريخ الفقه الاسلامي** لکھنی شروع کی تو انہوں نے فقہا کی ترتیب سے نہیں بلکہ خود فقہ کی حیات کی ترتیب سے لکھی۔ انہوں نے فقہی حیات کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ بچپن کا دور، جو عہدِ رسالت ﷺ پر مشتمل ہے۔

۲۔ جوانی کا دور، جو خلفاء راشدینؓ کے دور سے شروع ہو کر دوسری صدی کے اختتام تک پہنچتا ہے۔

۳۔ ادھیڑ پن، جو تیسری صدی سے شروع ہو کر چوتھی صدی کے اختتام تک ہے۔

۴۔ پانچویں صدی کے آغاز سے لے کے آج تک کا دور، جسے فقہی حیات کے بڑھاپے کا حصہ کہا جاتا ہے۔

فقہ اسلامی کی تاریخ پر اس کتاب کو مصدر و ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ تاہم اس کے بعد معروف مصری عالم شیخ محمد الخضری نے فقہ اسلامی کی تاریخ کی ترتیب میں ایک نیا منہج اختیار کیا اور کسی ذی روح کی حیات کی ترتیب سے مشابہت کی بناء پر نہیں بلکہ اس کی ترتیب اسلامی تاریخ میں رونما ہونے والے ان واقعات کی بناء پر ہے جو کسی بھی طرح فقہ کے سفر پر اثر انداز ہوتے رہے اور کسی بھی طرح فقہ میں اضافے اور تکمیل کا باعث بنے، یا جن سے فقہ کو دھچکا لگا۔ تقریباً یہی طریقہ کار شیخ محمد الخضری مرحوم کے بعد تاریخ فقہ اسلامی پر سب لکھنے والوں نے اپنایا ہے، مگر جزوی واقعات اور حوادث میں ان کے ساتھ اتفاق کا التزام نہیں کیا گیا۔۱

مختلف فقہی مذاہب اوران کے اصول کا تعارف

تدریس فقہ کے متعلق ایک اور چیز جس کی طرف طلبہ کی توجہ دلانا ضروری ہے وہ مختلف فقہی مذاہب کا مطالعہ ہے۔ مختلف فقہی مذاہب کا مطالعہ کے الفاظ ایک وسیع مفہوم رکھتے ہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ مدارس دینیہ میں طالب علم کو ایک محدود مدت ہی گزارنی ہوتی ہے۔ آٹھ یا دس سال کا یہ دورانیہ محض تربیت اور غور وفکر کی صلاحیت پیدا کرنے اور سوچ بچار کے لیے صحیح راستے کے تعین اور اس سلسلے میں اصول و ہدایات کے ساتھ زادِ راہ کی طرف راہنمائی کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ اس مدت میں طالب علم سے ایسی توقع وابستہ نہیں کی جاسکتی جو کسی کہنہ مشق تحقیق کار یا عالم سے کی جاسکتی ہو۔ جو توقعات اور خواہشات تجاویز کی صورت میں یہاں پیش کی جارہی ہیں انہیں اسی تناظر میں پیش نظر رکھا جائے۔

تدریسِ فقہ کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو فقہ درحقیقت کوئی نئی چیز نہیں بلکہ شریعت کے نصوص کو سلف نے کس طرح سمجھا، اپنے ددر کے مسائل کو دیکھ کر کیا حل نکالا، مسلسل غور وفکر کرنے کے

بعد وہ کن نتائج پر پہنچے، اِن سب چیزوں کے مجموعے کا نام فقہ رکھا گیا۔ یہ بات بہت واضح ہے کہ ہر مجتہد اور فقیہ کے اصول وقواعد، جن سے وہ استخراجِ مسائل میں کام لیتا تھا، مختلف تھے۔ اِن مختلف اصولوں کے بنیاد پر حاصل ہونے والے نتائجِ فکر میں اختلاف بھی ایک بدیہی امر تھا۔ انہی مجتہدین وائمہ فقہ میں سے کچھ حضرات ایسے تھے جن کے بتلائے ہوئے اصولوں اور اخذ کردہ نتائج فکر پر آج بھی امت عمل کر رہی ہے۔ اُمت کی کسی جماعت کا کسی بھی امام یا فقیہ کی آراء کا اتباع کرنا اور جدید مسائل کا حل تلاش کرنے میں انہی کے بتلائے ہوئے اصولِ استخراج پر اپنی اجتہادی رائے قائم کرنے یا عمل کی بنیاد رکھنے ہی کو "مذہب" کہا جاتا ہے۔ گویا ہر فقہی مذہب کی آراء کی بنیاد اصولوں پر ہے اور اصولوں سے توافق کی بدولت ہر مذہب اپنے اندر تکامل اور انضباط رکھتا ہے۔ اگر کسی بھی فقہی مذہب کے لیے اصول نہ ہوتے یا فروع کا اصول سے توافق نہ ہوتا تو ایسا مذہب تکامل اور انضباط نہ ہونے کی وجہ سے تحلیل ہو کر ختم ہو جاتا۔ لیکن سیکڑوں سال تک ان کا زندہ رہنا اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ ہر فقہی مذہب اپنے اندر اصول وفروع کا ایک مضبوط نظام رکھتا ہے اور ان کے اندر ہم آہنگی، انضباط اور تکامل کی روح پائی جاتی ہے جن کی وجہ سے وہ آج بھی کئی صدیوں قبل کی طرح زندہ ہے۔ البتہ اس پس منظر میں کچھ نئے فطری سوالات جنم لیتے ہیں جن کا جواب دینا تدریس فقہ کی ذمہ داری لینے والے اساتذہ کرام کے لیے ضروری ہے تاکہ طلبہ اس عظیم میراث کی اہمیت سے واقف اور اس سے استفادہ کے اہل ہوں۔

مثلاً یہ کہ فقہی مذاہب کب اور کیسے پیدا ہوئے؟ جن شخصیات کی طرف یہ فقہی مذاہب منسوب ہیں ان کی سوانح عمری؟ اور ایک اہم ترین سوال کہ اِن مذاہب کی بناء کن اصولوں پر ہے؟ یعنی شریعت ایک ہے، اسی ایک شریعت کے نصوص سب ائمہ کے سامنے تھے تو وہ کون سے اصول ہیں جن میں فرق کی بنیاد پر یہ مختلف فقہی مذاہب پیدا ہوئے؟ ان اصول وقواعد کا تفصیلی جائزہ پیش کرنا ضروری ہے۔ اس کے بعد ایک سوال یہ کہ ان مذاہب کی مزید نشو ونما کیسے ہوئی؟ اِن ائمہ فقہ واجتہاد کے کن تلامذہ اور متبعین نے ان مذاہب کی تشہیر میں کردار ادا کیا؟ آخر میں ایک اور اہم سوال جس کا ذکر اگلے عنوان میں

آئے گا۔ وہ یہ کہ ہر مذہب کی معروف ومشہور کتب کون سی ہیں؟

فقہی مذاہب کی تاریخ اور جامع تعارف پر کئی اہل علم نے لکھا ہے جن میں شیخ ابوزہرہ کی کتابیں قابل قدر ہیں۔ ان کی ایک کتاب **تاریخ المذاهب الاسلامية** ہے۔ اس کتاب میں فقہی مذاہب کے علاوہ اعتقادی مذاہب کا بھی ذکر آتا ہے۔ اس کے علاوہ علامہ احمد تیمور پاشا کی کتاب **نظرة تاريخية في حدوث المذاهب الفقهية** اور اس پر شیخ ابوزہرہ کا فکر انگیز مقدمہ ہے۔ اس کتاب میں زیادہ تر التزام اس بات کا کیا گیا ہے کہ کن علاقوں میں کن مذاہب کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ مصر کے سابق مفتی اعظم شیخ ڈاکٹر علی جمعہ کی کتاب **المدخل الى دراسة المذاهب الفقهية** بھی ایک اہم کاوش ہے۔ ان سب کے علاوہ ہماری ناقص رائے میں وہ کتابیں بھی متعارف کرائی جائیں جو فقہی مذاہب کی تاریخ کے ساتھ ساتھ ان مذاہب کے اصولوں اور قواعد سے بھی بحث کرتی ہیں۔ مثلاً وہ کتابیں جو شیخ ابوزہرہ نے امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، ابن تیمیہؒ، ابن حزمؒ، امام جعفرؒ، اور امام صادقؒ پر الگ الگ لکھی ہیں۔ اِن میں سے ہر کتاب کو فاضل مؤلف نے دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ پہلا حصہ اصحابِ مذاہب کے حالاتِ زندگی کے لیے، جبکہ دوسرا حصہ ان کے اصول وقواعد کی تفصیلات کے لیے مختص ہے۔ اساتذہ کرام اگر ان کتابوں کی روشنی میں ہر مذہب کی تاریخ، تعارف اور ان کے اصول وقواعد پر تفصیلی روشنی ڈالیں گے تو توقع ہے کہ طلبہ کے حق میں یہ زیادہ مفید ہوگا۔

مختلف مذاہب کی معتمد ومشہور کتب کا تعارف

فقہی مذاہب کے تعارف اور ان کے اصولوں پر بحث کے دوران طلبہ کو فقہی مذہب کی کتب کے متعلق معلومات دینا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ کوئی بھی مذہب کسی ایک فرد کے ذریعے، ایک وقت میں اور ایک جگہ پر یک بارگی معرضِ وجود میں نہیں آیا، بلکہ ہر مذہب مختلف مقامات پر، مختلف ادوار میں اور مختلف حالات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی آراء کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ایسی صورت حال میں ایک مذہب

کے اندر ایک ہی مسئلے سے متعلق مختلف آراء کا سامنے آنا بعید نہیں، خصوصاً جب ان کے درمیان جغرافیائی فاصلہ بہت زیادہ ہو۔ فقہا نے ایک مذہب کے اندر مختلف اقوال وآراء کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ تقسیم کیا ہے۔ جس میں تمام فقہا کی کاوشوں کی قدر و قیمت بھی برقرار رہی اور ان سے استفادہ بھی کیا جاتا رہا ہے۔ اس ترتیب اور تقسیم کے لیے تقریباً ہر مذہب کے اندر کافی ضخیم اور عمدہ و مستند کتابیں لکھی گئی ہیں، اور ہر نوع کی کتابوں کے لیے مخصوص اصول اور ہدایات فراہم کی گئی ہیں۔ مثلاً فقہ حنفی کے اندر ''اصول'' یعنی **ظاہر الروایۃ** کی کتابوں کا مقام و مرتبہ الگ ہے اور نوادرات کا الگ۔ اسی طرح فتاویٰ اور واقعات کا الگ درجہ ہے۔ اس طرح فقہا کی کاوشوں کو بھی مختلف طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مثلاً **اصحاب الاجتہاد المطلق، اصحاب الاجتہاد فی المذہب، اصحاب التخریج اور اصحاب الترجیح** وغیرہ۔

الغرض اگر اس طرح ہر مذہب کو ایک نظام کی طرح طلبہ کو متعارف کرایا جائے جس میں مختلف طبقات کی شخصیات اور مختلف مراتب کی کتابیں ہیں، تو اُمید ہے کہ طلبہ اس عظیم فقہی میراث کو آسانی کے ساتھ سمجھیں گے، کثرت اختلاف کی وجہ سے اضطراب کا شکار بھی نہیں ہوں گے، نیز ان پر اس لچک اور وسعت کی حقیقت واضح ہوگی جو اسلامی احکام کے اندر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ طلبہ کے لیے ممکن ہو سکے گا کہ کسی بھی فقہی مسئلے کے متعلق کسی بھی فقہی مذہب کا موقف معلوم کرنے میں درجہ اول کے مصادر تک رسائی کی کوشش کریں۔ ایسا کرنے میں اس مذہب کے اندر راجح اور مرجوح اقوال کا بھی پتہ چلے گا۔

فقہ کا قانون وضعی کے ساتھ تقابلی مطالعہ (فقہ اسلامی کے امتیازات)

عصرِ حاضر کی ایک اہم خصوصیت بڑھتی ہوئی ''گلوبلائزیشن'' ہے۔ اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے معاصر قوتیں مواصلات کے جدید وسائل کے ذریعے مشرق ومغرب کے فاصلوں کو ختم کر کے دنیا کو ایک گاؤں کی شکل میں کنٹرول کرنا چاہتی ہیں۔ چنانچہ میڈیا اور نشر واشاعت کے وسائل کے ذریعے اس طرح وہ اپنی اقدار اور تہذیب وثقافت دنیا پر مسلط کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ لیکن یہ بات کسی

وضاحت کی محتاج نہیں کہ کوئی بھی معاشرہ اپنی حیات و بقا میں تہذیب کے ساتھ ساتھ قانونی نظام پر انحصار کرتا ہے۔ قانون کے حسن و معیار کے مطابق اس معاشرے کو جینا نصیب ہوتا ہے۔ یوں دیکھا جائے تو اس گلوبلائزڈ دنیا کے اندر مغربی تہذیب کے حملوں سے دفاع اور اسلامی اقدار و روایات کے احیاء کے لیے مسلمانوں کے پاس ایک بہترین پلیٹ فارم قانونی نظام کا ہے۔

تدریسِ فقہ کے عمل میں طلبہ میں یہ صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے کہ وہ دونوں نظامہائے قوانین، شرعی اور مغربی، کا تقابلی انداز میں مطالعہ کریں اور اس قانونی نظام کے راستے سے دنیا پر واضح کریں کہ شریعت کیا ہے اور مغربی تہذیب اور نظامِ قانون کیا ہے۔ انسانیت کی فلاح و بہبود کا سامان کس جانب پایا جاتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ جن مصالح تک مغربی دنیا کی سوچ آج پہنچی ہے وہ خود مغرب کے علمی احیاء سے کئی صدیاں پہلے اسلام نے دنیا کو دی تھی۔ اس علمی و فکری مبارزے اور مقابلے کے لیے طلبہ کو تیار کرنا ہوگا، اور اس کا ایک مناسب راستہ دونوں قوانین کا تقابلی مطالعہ ہے۔ یہاں ہرگز یہ مطالبہ کرنا مقصود نہیں کہ مدارس کے طلبہ جس دقتِ نظر اور امعان کے ساتھ فقہ اسلامی پڑھ رہے ہیں، اس گہرائی کے ساتھ قانون وضعی بھی پڑھیں۔ اساتذہ کرام فقط منتہی کلاسوں میں تدریس فقہ کے دوران چند ابواب اس طرز پر پڑھائیں کہ اس باب سے متعلق اولاً مغربی اصول سامنے رکھیں اور اس کے بعد مذکورہ باب سے متعلق مقاصدِ شریعت اور چند بنیادی اصول بتلائیں، اس کے بعد متعلقہ نصابی کتاب میں موجود فروعی مسائل کی تطبیق کریں۔ مثلاً الاحوال الشخصیة یا عائلی نظام کے بارے میں قانون وضعی کے اصول و اہداف کیا ہیں؟ وہ خاندانی نظام کو کس طرح تعمیر کرنا چاہتا ہے؟ اس کی نظر میں خاندان کے تمام افراد کے درمیان کیا رشتہ ہے؟ یہ بنیادی خاکہ ذکر کرنے کے بعد مذکورہ امور شرعی نقطہ نگاہ کے مطابق ذکر کریں۔ اس طرح چند ابواب کی مدد سے فقہ اور قانون کے تقابلی مطالعہ کا تصور دیا جائے اور اس باب میں مستند اور عمدہ کتابوں کی طرف راہنمائی کی جائے۔

علماء اور بالخصوص عرب اہل علم نے اس پہلو پر خاصا کام کیا ہے۔ مثلاً حدود کے متعلق فقہ اسلامی اور قانون وضعی کا تقابلی مطالعہ مصر کے سابق چیف جسٹس ڈاکٹر عبدالقادر عودہ شہید کی مشہور کتاب

التشریع الجنائی الإسلامی مقارنا بالقانون الوضعی اوربین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے پروفیسر عمران احسن خان نیازی کی انگریزی تصنیف *General Principles of Criminal Law*، جس کا اردو ترجمہ بھی کیا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ بعض ابواب پر اسی طرح اسلامی اور قانون وضعی کے درمیان تقابل پر ایک اچھی کتاب شیخ علی منصور کی **مقارنات بین الشریعة الإسلامیة و القوانین الوضعیة** بھی ہے۔ الغرض فقہ اسلای کے تمام ابواب پر بلکہ بعض وہ مسائل جو فقہ کی کسی کتاب میں باب کے اندر موجود فصل کے تحت ذکر کیے جاتے ہیں، ان مسائل پر بھی فقہ اسلامی اور قانون وضعی کے درمیان تقابلی مطالعہ اور تحقیقات کی گئی ہیں اور تقریباً یہ سارا ذخیرہ انٹرنیٹ پر موجود ہے۔

عمومی طور پر شریعت اسلامی پر جمود اور جدید دور کی ضروریات سے ہم آہنگ نہ ہونے کے اعتراضات کیے جاتے ہیں۔ منتہی طلبہ کے سامنے سال کے شروع میں مبادیات کے ضمن میں اس پہلو پر بحث کرنا چاہیے اور اعتراضات کے جواب کے ساتھ ساتھ فقہ اسلامی کی خصوصیات اور امتیازات بھی تفصیل کے ساتھ ان کے سامنے رکھنے چاہییں۔ اس پہلو پر اچھی کتابیں ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی **الشریعة الإسلامیة صالحة للتطبیق في کل زمان ومکان** اور **عوامل السعة و المرونة في الشریعة** موجود ہیں۔ اس طرح موصوف کی دیگر کتب بھی اس باب میں مفید ثابت ہوسکتی ہیں۔ نیز ڈاکٹر محمد الدسوقی کی کتاب **الفقه الإسلامی بین المثالیة و الواقعیة** بھی اس باب میں ایک اہم حوالہ ہے۔

II۔ فقہ کا تقابلی مطالعہ

تعارف، اہمیت اور ضرورت

الفقه المقارن یا تقابلی فقہ کا مقصد مختلف فقہا کی آراء اور کسی مسئلے کے متعلق ان کے اجتہادات کا دلائل کے ساتھ مطالعہ ہوتا ہے۔ چنانچہ کسی بھی مسئلہ میں فقہاء کے مختلف اقوال ہوں تو ان سب

اقوال وآراء کا دلائل سمیت مطالعہ کرنا اور ترجیح کے لیے ان کے دلائل کا محاکمہ کرنا **الفقہ المقارن** کا وظیفہ ہے۔ ایک لحاظ سے تو **الفقہ المقارن** یا فقہ کا تقابلی مطالعہ مدارس دینیہ میں کافی حد تک ہوتا ہی ہے۔ یہ تقابلی مطالعہ دینی مدارس میں فقہی کتابوں کی تدریس کے وقت نسبتاً کم مگر کتب حدیث کی تدریس کے دوران زیادہ ہوتا ہے۔ جس کی اپنی ایک حکمت ہے اور وہ یہ کہ احادیث کی تدریس کے وقت فقہی مذاہب کا مطالعہ اس پورے فقہی نظام کا اِن مصادر کے ساتھ براہِ راست تعلق سمجھنے میں معاون ہوتا ہے۔ بالخصوص اس نقطۂ نظر سے کہ کوئی بھی فقہی مذہب فقہا کی ذاتی خواہشات کا نتیجہ نہیں بلکہ نصوص کے ساتھ براہِ راست تعلق رکھتا ہے۔ **الفقہ المقارن** کے اس کے علاوہ بھی کئی فوائد ہیں، جن پر نظر ڈالنے سے فقہ اسلامی کے تقابلی مطالعے کے اغراض ومقاصد واضح ہوں گے۔

۱۔ الفقہ المقارن کا ایک بڑا فائدہ تو مستشرقین کے اس اعتراض کا جواب ہے کہ فقہ اسلامی کافی حد تک رومی قانون سے متاثر ہے اور اس کے بیشتر احکامات رومی قانون ہی سے ماخوذ ہیں۔ طلبہ کو احکامِ اسلام کا اِس عقلیت اور فقہاءِ اسلام کے وسیع تر مختلف اجتہادات کے ساتھ مطالعہ کرایا جائے۔ اس طرح انہیں فقہی مسائل وجزئیات کو اس طرز پر دیکھنے کا موقع ملے گا کہ مثلاً ایک متعین جزئیے میں فلاں فقیہ کی یہ رائے ہے اور یہ اس کے دلائل ہیں۔ پھر دوسرے فقیہ کی اس سے مختلف رائے ہے، جس کے اپنے دلائل ہیں۔ جب طالب علم خود دیکھتا ہے کہ فقہ اسلامی اتنی وسعت کی حامل ہے اور دوسری جانب رومی قانون میں اتنی لچک اور وسعت نہیں ہے، تو اس تقابلی مطالعے کے ساتھ فقہ کا مطالعہ کرنے کے بعد طالب علم کے ذہن میں فقہ اسلامی کے رومی قانون سے متاثر ہونے یا اس سے ماخوذ ہونے کے بارے میں شائبہ تک نہیں رہ سکتا۔

۲۔ دوسرا فائدہ اپنے اسلاف کے علوم کی حفاظت کا جذبہ بیدار ہونا ہے۔ صحابہ کرامؓ، تابعین اور ان کے بعد تمام فقہا نے کتنی ان تھک محنتوں سے امت کے لیے ہر سمت راستے روشن کر دیے اور علوم کا بیش بہا ذخیرہ چھوڑا۔ ان کا ہمارے اوپر حق ہے کہ ہم ان علوم سے استفادہ کریں اور اپنی جدید نسلوں کا اس فقہی ورثہ کے ساتھ اعتماد واطمینان کا رشتہ قائم کریں۔

۳۔ تیسرا فائدہ یہ ہے کہ طلبہ کے سامنے کسی بھی مسئلے کے متعلق مختلف آراء رکھی جائیں اور اجتہاد اور غور وفکر کے مختلف پہلو بتائے جائیں تو غور وفکر اور اجتہاد و استنباط کے یہ مختلف پہلو ان میں سوچنے کی عادت ڈالتے اور ان کے اندر فقہی ملکہ پیدا کرتے ہیں۔ یوں وہ استنباط کرنے اور نتائج اخذ کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے فوائد ہیں، اختصار کے پیش نظر انہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

دینی مدارس میں فقہ کے تقابلی مطالعے کے مروجہ طریقہ کار کا جائزہ لیا جائے تو یہ طرز کچھ مزید بہتری لائے جانے کا منتظر ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ اکثر طلبہ فقہی آراء کو محض امتحانی ضرورت کے لیے زبانی حفظ کرتے ہیں، اس طرح فقہی ملکہ کا حصول بطریق احسن نہیں ہو پاتا۔ لہٰذا فقہ کے تقابلی مطالعہ اور تدریس کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ طریقہ اختیار کیا جائے جو امام محمد بن الحسن الشیبانیؒ کے ہاں **کتاب الحجة علي أهل المدينة** میں اور امام شافعیؒ کے ہاں **کتاب الأم** میں اور امام قدوریؒ کے ہاں **التجرید** میں ہے۔ کہ یہ حضرات ایک مسئلہ سامنے رکھتے ہیں اور اپنا موقف پیش کرتے ہیں، پھر دوسرا مختلف موقف سامنے لاتے ہیں اور سوال و جواب کی شکل میں اس کے ساتھ خیالی مباحثہ و مذاکرہ شروع کرتے ہیں۔ فقہا کی اگر تاریخ دیکھی جائے تو اکثر و بیشتر کے ہاں فقہی مسائل میں مذاکرہ و مباحثے کا اہتمام ملتا ہے۔ مختصر یہ کہ طلبہ کو مختلف فقہی اقوال حفظ کرنے کے بجائے اُنہیں باریک بینی کے ساتھ دلائل کی روشنی میں بات کو سمجھنے کی عادت ڈالی جائے تو اس طرح فقہی فہم بھی حاصل ہوگا اور اسلاف کی محنتوں اور کاوشوں کا ایک حد تک اندازہ بھی ہوگا۔

آدابِ اختلاف: اہمیت اور ضوابط

فروعی مسائل میں اختلاف کی کئی جہتیں ہیں، اور ہر جہت کے اعتبار سے اس اختلاف کی حیثیت بھی مختلف ہو جاتی ہے۔ مثلاً اگر کسی مسئلے میں اختلاف دلائل میں غور وخوض کیے بغیر اجتہاد کے اصول و ضوابط سے بالاتر ہو کر کوئی موقف اختیار کیا جائے جس میں ٹھوس علمی دلائل کی طرف اعتنا نہ ہو بلکہ تعصب، عناد، نفس پرستی یا کسی مادی خواہش کی تسکین کے لیے ہو تو ایسا اختلاف علماء امت کی نظر میں

مذموم ہوتا ہے اور طلبہ کو بہرصورت اس سے گریز واجتناب کی تلقین کرنی چاہیے۔ اس کے برخلاف اگر اختلاف کی جہت حق تک رسائی کے جذبے کے ساتھ ہو، اور ہر قسم کی نفس پرستی اور تعصب وعناد سے بالاتر ہو، اس عمل میں اجتہاد اور استنباط کے تمام اصولوں اور ضوابط کی پابندی کی گئی ہو، دِقت نظر اور گہرائی کے ساتھ متعلقہ مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور وفکر کیا گیا ہو اور پھر غور وفکر کا یہ سارا عمل کسی اختلاف پر منتج ہوتو علماء اسلام کی نگاہ میں یہ اختلاف مقبول ومحمود ہے۔ درحقیقت ہمارے اسلاف کا آپس میں جو اختلاف ہے وہ بھی اِسی نوعیت کا ہے۔

یہ اختلاف فقہا کے دور کا نہیں بلکہ صحابہؓ اور عہد رسالت میں بھی موجود تھا اور ایک موقع پر تو آنحضرت ﷺ نے اس قسم کے اختلاف کو برقرار رکھا۔ اور شریعت کے تمام احکام پر عمل کرنے میں آسانی پیدا کرنے کے لیے اِس نوعیت کے اختلاف کو ''رحمت'' کہا گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ طلبہ کو ان اصول وضوابط اور آداب سے بھی آگاہ کرانا ضروری ہے جن کے بنیاد پر یہ اختلاف مقبول ومحمود قرار پاتا ہے۔ کیونکہ فروعی وفقہی مسائل میں اختلاف کے دوران اگر ان آداب اور اصولوں کا پاس نہیں رکھا گیا تو یہ امت میں افتراق وانتشار اور تعصب کی آگ پھیلائے گا اور اس سے فقہ اسلامی کی وقعت بھی متاثر ہوگی۔ اس لیے اساتذہ کرام کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اپنے طلبہ کو جہاں اس اختلاف کی اہمیت اور ضرورت سے آگاہ کریں، وہاں اس اختلاف کی شرائط اور آداب اور اس کے تمام اخلاقی ضوابط بھی ان کے سامنے رکھیں اور ان کو مضبوطی سے تھامے رکھنے کی تلقین کریں۔ ۲

الفقه المقارن پر مشتمل کتب کا تعارف

الفقه المقارن پر دو طرح کی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ایک تو وہ کتابیں ہیں جن میں فروعی مسائل میں مختلف فقہی آراء کا تقابل تو براہِ راست نہیں کیا جاتا لیکن اس تقابلی مطالعہ کے مبادیات، طریقہ کار اور اسی طرح اس کی اہمیت، فوائد اور ضرورت وغیرہ سے متعلقہ مباحث کا تذکرہ ہوتا ہے۔ طلبہ کو اِس نوع کی کتابوں کی نشاندہی بھی ضروری ہے تاکہ اِن کتابوں کی طرف مراجعت کرکے استاد سے سنی

ہوئی ہدایات قدرے تفصیل کے ساتھ سامنے آ جائیں اور اگر سہولت ہو تو وہ کتابیں اپنی مستقبل کی ضرورت کے لیے بھی رکھ لیں۔[۳]

الفقه المقارن کے موضوع پر لکھی گئی دوسری قسم کی وہ کتابیں ہیں جن میں فقہ کے جزئیات اور مسائل کو لے کر مختلف فقہی مذاہب کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ اِس پہلو پر متقدمین ہی کی بہت سی گراں قدر تصانیف بھی موجود ہیں۔[۴]

اس موقع پر طلبہ کو یہ رہنمائی ضرور دی جائے کہ جوں جوں وہ اپنی استعداد میں اضافہ کرتے چلے جائیں، بحث و تحقیق کے وقت فقہی مذاہب اور اقوال ایک ہی کتاب سے لینے کے بجائے ہر مذہب کا موقف لینے کے لیے اس مذہب کی معتبر اور مستند کتاب سے استفادہ کریں، کیونکہ **الفقه المقارن** پر موجود کتابوں میں، ان کی قدر و قیمت کے ساتھ، یہ مشکل بعض اوقات پیش آتی ہے کہ مؤلف کسی خاص مذہب کا متبع ہوتا ہے وہ مختلف اقوال و آراء کا تقابل کرتے وقت دوسرے مذہب کی مرجوح رائے یا غیر مفتیٰ بہ قول لیتا ہے۔ اِس صورت میں بہتر یہ ہوگا کہ ہر مذہب کا موقف معلوم کرنے کے لیے اس مذہب کی معتبر کتاب کی طرف مراجعت کی جائے۔

III۔ فقہ نظری و فقہ تطبیقی

فقہ نظری: کتب کا تعارف اور ان سے استفادہ کے طریقے

فقہ نظری یا فقہ تقدیری سے ہماری مراد فقہ اسلامی کا وہ بیش بہا ذخیرہ ہے جو اسلاف کی مستند کتابوں کی صورت میں ہمارے پاس ہے۔ فقہ تقدیری کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کچھ فرضی مسائل بنا کر کتاب وسنت کی نصوص سے ان کا حل اور جواب ڈھونڈا جائے۔ اس طریقہ کار سے فقہا کا مقصد نصوص میں موجود احکام کی علتوں کا استخراج اور تعین ہوا کرتا تھا۔ اس طرح وہ کسی بھی منصوص حکم میں غور و فکر کر کے ایک علت کا استخراج کرتے اور پھر کچھ مسائل فرض کر کے ان علل کی مدد سے احکام کی تطبیق کی

کوشش کرتے تھے۔تاریخی شواہد کی روشنی میں شیخ ابوزہرہ کی تحقیق کے مطابق فقہ تقدیری، جسے فقہ نظری بھی کہا جاتا ہے، کا وجود امام شعبی کے دور میں بھی تھا، جسے امام ابوحنیفہؒ نے پروان چڑھایا۔امام ابوحنیفہ کے بعد دیگر فقہا بھی مقدار میں کمی وبیشی کے ساتھ اس طریقہ کار پر چلتے رہے اور اپنی فکر ونظر میں مسائل فرض کر کے ان کا حل پیش کرتے تھے۔

غور وفکر کے اس طریق کار کے بارے میں فقہا کا اختلاف ضرور موجود رہا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے جواز وعدمِ جواز تک پر بحثیں ہوئی ہیں۔لیکن غلو اور مبالغے کی حد تک نہ ہو تو اس کی اہمیت میں کوئی شک نہیں کیونکہ آج ہمارے پاس فقہ کا جتنا بھی ذخیرہ ہے اس کی ترتیب وتدوین میں فقہ نظری یا فقہ تقدیری کی مساہمت (input) سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔اس کی اہمیت کی بہت سی وجوہات میں ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس فقہ کی نشوونما اس دور میں ہوئی جب اصول وقواعد مرتب ہو رہے تھے، اجتہاد و استنباط مسائل کا ملکہ مضبوط تر تھا، اجتہاد کے اس زرّیں دور میں خطا اور غلطی سے نسبتاً دور، استخراج و اجتہاد کے قوی تر استعداد کی مدد سے اس فقہ کی اٹھان ہوئی ہے۔اس سے صاف ظاہر ہے کہ فقہ کا یہ ذخیرہ اصول اجتہاد کو متضمن ہے اور اس میں فقہی استعداد کو مضبوط بنانے کے لیے بیشتر سامان موجود ہے۔راقم الحروف کے ایک مصری استاد کے بقول **مَنْ لا أَصْلَ لَهُ لافَرْعَ لَهُ، وَ مَنْ أَرادَ أَنْ يَتَفَقَّهَ فَعَلَيهِ أَرْبَعَ مِيمَاتِ: مِيمَ الْمَوَطَّا، وَمِيمُ الْمَبْسُوطِ لِلسَّرْخَسِيْ، وَمِيمِ الْمَجْمُوْعِ شَرْحَ الْمُهَذَّبِ، وَمِيمُ الْمُغْنِيْ لِابْنِ قَدَامَةِ** مراد یہ ہے کہ ''اصول'' یعنی اسلاف کی کتابوں کے بغیر صرف ''فروع''، یعنی صرف جدید کتابوں پر اعتماد کر کے فقہی ملکہ کا حصول مشکل ہے۔لہٰذا اساتذہ کرام اپنے طلبہ کو اسلاف کی کتابوں کے مطالعہ کی اہمیت جتائیں کہ فقہی استعداد متقدمین کی کتابوں کے مطالعہ سے مضبوط ہوتا ہے اور انہی میں اجتہادی روح کی غذا ہے۔

تاہم متقدمین کی تمام کتابوں کی تدریس اور مطالعے کے لیے آٹھ یا دس سال کیا شاید انسانی زندگی بھی کم پڑ جائے۔ اس لیے اسلاف کے تمام کتابوں کو پڑھنا یا پڑھانا ممکن نہیں افادیت اور جامعیت کے اصول کے پیش نظر چند کتابوں کا چناؤ کیا جاتا ہے۔مثلاً مبتدی طلبہ کے لیے متون اور پھر

اس کے بعد بعض متون پر دیگر متقدمین ہی کے شروح کو نصاب میں شامل کیا جاتا ہے۔ اس طرح اسلاف کی کتابوں کا وافر ذخیرہ باقی رہ جاتا ہے جن کے ساتھ طالب علمی کے دور میں طلبہ کا تعلق نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ اب اُن کتابوں سے استفادہ کس طرح کیا جائے، اساتذہ طلبہ کی کیسے راہنمائی کریں۔ اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ متقدمین کی کتابیں دقیق اور گہرائی لیے ہوئے ہوتی ہیں جن کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے غیر معمولی استعداد درکار ہے۔ یہ استعداد کافی حد تک نصاب میں رکھی گئی کتابوں کی تدریس کی مدد سے حاصل ہوسکتی ہے۔ اس لیے اساتذہ کرام غیر معمولی اہمیت اور بھرپور محنت کے ساتھ ان کتابوں کو پڑھائیں۔ اس بارے میں متقدمین کی بہت ساری کتابوں پر مختلف پہلوؤں سے دراسات اور تحقیقات ہوئی ہیں۔ مثلاً کسی نے ان کتابوں سے فقہی قواعد کا استخراج کیا، کسی نے اصولی مسائل کو الگ کر کے ان کے فروعی مسائل کی ان اصولوں پر تطبیق کی تحقیقات کی ہیں۔ کسی نے مختلف فقہی ابواب کے متعلق مقاصدِ شریعت کو جمع کیا۔ تو ان دراسات اور تحقیقات کی روشنی میں اگر اُن کتابوں کو پڑھایا جائے۔ نیز تدریس کا عمل تقریر یا خطبے کی شکل میں نہ ہو بلکہ مباحثے اور مکالمے کی صورت میں ہو تو طلبہ مجبوراً پہلے سے تیاری کر کے آئیں گے اس طرح ان کی فکری سوچ اور استعداد بڑھے گی۔ اس سلسلے میں بہتر ہے کہ اُنہیں اردو شروح کے مطالعہ سے باز رہنے کی تلقین کی جائے، کیونکہ اُن شروح کو پڑھ کر طلبہ کو غور و فکر کی مشق کی عادت نہیں پڑتی، بلکہ سب کچھ تیار اور سہل انداز میں ملتا ہے اور طلبہ زبانی یاد کر کے وقتی اور امتحانی ضرورت پورا کر لیتے ہیں۔ چنانچہ فکری استعداد اور صلاحیت کمزور رہ جاتی ہے۔

طالب علمی کے دور کے بعد فقہی کتابوں سے استفادے کی متعلق راہنمائی اور ہدایات میں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ کسی بھی مذہب سے متعلق معتبر کتابیں بتلائی جائیں۔ نیز کتابوں کی خصوصیات اور مؤلفین کے طبقات کو بھی بتایا جائے۔

فقہ تطبیقی: کتب کا تعارف اور ان سے استفادہ کے طریقے

فقہ اسلامی کا دوسرا حصہ فقہ تطبیقی ہے۔ فقہ تطبیقی کو کئی اور ناموں سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ مثلاً

فقہ النوازل، فقہ القضایا المعاصرۃ، الفتاویٰ، الواقعات وغیرہ۔ان الفاظ میں بعض اہل علم ذرا فرق بھی کرتے ہیں لیکن بالعموم ان سب کا مفہوم ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ انسانی زندگی سے متعلق وہ مشکلات اور مسائل جن کا وجود ماضی میں نہیں تھا اور اب سامنے آرہے ہیں تو ایسے مسائل کا حل اسلامی شریعت میں کیا ہے؟ اِن احکام کی معرفت کا نام فقہ تطبیقی یا فقہ النوازل ہے۔اساتذہ کرام اسلاف کی کتابوں کی تدریس کے دوران فقہ کے تطبیقی پہلو بھی اُجاگر کریں اور اس کی اہمیت بتلائیں۔

قدیم فقہی کتابیں ہمارے لیے چراغِ راہ ہیں۔ اُن سے اگر ہم رہنمائی لیں گے تو ہماری اجتہادی صلاحیت کو تقویت ہوگی۔لیکن اس کے ساتھ اصل کرنے کا کام جدید مسائل کا حل پیش کرنا ہے۔کیونکہ انسانی زندگی کا کوئی بھی شعبہ قانونی، سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی وغیرہ یا دوسرے لفظوں میں فقہ اسلامی کا شاید ہی کوئی باب ہو جہاں ایسے جدید مسائل کا سامنا نہ کیا جارہا ہو جن کا حل نہ تو براہِ راست نصوص میں پایا جاتا ہے اور نہ موجود فقہی کتابوں میں۔ایسی صورت میں اسلامی شریعت کے کیا احکامات ہوں گے۔ان کی طرف راہنمائی آج کے اور آنے والے علماء ہی کی ذمہ داری بنتی ہے۔

فقہ کے اس پہلو پر کام کرنے کے لیے ہدایات اور اصول وقواعد کیا ہیں۔اساتذہ کرام کو اس سے متعلق مواد آدابِ افتاء کے موضوع پر لکھی گئی کتابوں میں ملے گا۔ان میں ایک چیز جس کی اہمیت میں شاید ہی کسی کو شک ہو وہ عرف وحالات اور متعلقہ مسئلے کے متعلق واقعہ کی معرفت ہے۔اسلاف ہی کے دور سے اس چیز کو اختصاص کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے۔علامہ ابن القیم نے اپنی مایہ ناز کتاب اعلام الموقعین میں کئی جگہوں پر اس کی اہمیت بتانے کی کوشش کی ہے۔ بلکہ ایک جگہ تو لکھتے ہیں: بَلْ يَنْبَغِي لَهُ أَنْ يَكُونَ فَقِيهاً فِي مَعْرِفَةِ مَكْرِ النَّاسِ وَ خِدَاعِهِمْ وَاحْتِيَالِهِمْ، فَإِنَّ الْفَتْوىٰ تَتَغَيَّرُ بِتَغَيُّرِ الزَّمَانِ وَالْمَكَانِ وَالْعَوَائِدِ وَالْاَحْوَالِ (مفتی لوگوں کے حالات اور کسی شرعی حکم سے جان چھڑانے کے لیے تراشے جانے والے حیلوں کی معرفت بھی ضروری ہے کیونکہ فتویٰ اِن امور سے بھی بدل جاتا ہے)۔اور دوسری جگہ لکھے ہیں: بَلْ يَكُونُ حَذِراً فَطِناً فَقِيهاً بِأَحْوَالِ النَّاسِ وَأُمُورِهِمْ، يُوَازِرُهُ فِقْهُهُ فِي الشَّرْعِ (اس سے مقصود یہ ہے کہ کسی بھی مسئلے کے متعلق تحقیق کے

وقت اس کے اُن تمام پہلوؤں کا مدنظر رکھنا ضروری ہے جو کسی بھی صورت میں اس مسئلے کے شرعی حکم میں تبدیلی کا موجب بن سکتے ہیں۔) عرف اور حالات کی معرفت کے علاوہ دیگر اصول وقواعد بھی ہیں جن کا فقہی تطبیق کے عمل میں لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ لہٰذا اساتذہ کرام تدریس کے دوران میں فقہ النوازل یا فقہ تطبیق کی اہمیت اور ضرورت واضح کرنے کے بعد اس کے اصول وہدایات بھی سامنے رکھیں۔

فقہ النوازل پر لکھی جانے والی کتابیں کئی طرح کی ہوتی ہیں۔ مثلاً بعض کتابیں تو فقہ النوازل ہی کے نام سے ہیں، جیسے **فقه النوازل** از شیخ بکر بن عبداللہ، اور **الجامعة الأمريكية المفتوحة** کی طرف سے شائع ہونے والی کتاب **فقه النوازل** وغیرہ۔ اِن کتابوں میں مختلف فقہی ابواب کے تحت جدید مسائل پر مباحث شامل ہوتے ہیں۔ دوسری قسم کی وہ کتابیں ہیں جن میں کسی بھی ایک مسئلہ یا ایک باب کے متعلق چند جدید مسائل زیر بحث آ جاتے ہیں۔ تیسری قسم کی وہ کتابیں ہیں جو مختلف علمی شخصیات کے متنوع مسائل پر لکھے جانے والے مقالوں کا مجموعہ ہوا کرتی ہیں۔ یا وہ تحقیقی مجلّات ہیں جن میں صرف فقہی مسائل کے متعلق مقالات چھپتے ہیں۔ ایسے رسالوں میں بھی جدید مسائل کے متعلق کافی مواد پایا جاتا ہے۔ اور چوتھی قسم کی کتابیں وہ فتاویٰ ہیں جو مختلف اداروں یا شخصیات کی طرف سے چھپتی ہیں۔ ان میں بھی جدید مسائل پر راہنمائی کا کافی ذخیرہ موجود ہوتا ہے۔ اساتذہ کی جانب سے طلبہ کو ایسے فتاویٰ، کتابوں یا مقالات کے مجموعوں اور رسالوں کی نشاندہی کی جائے جو ثقاہت اور استناد میں معتبر ہوں۔ ۵

عصرِ حاضر میں فقہ کے علمی اداروں کا تعارف

اس میں کوئی شک نہیں کہ فقہی میدان میں مختلف فقہی اکیڈمیوں کا کردار قائدانہ رہا ہے۔ فقہ، اصول فقہ اور قواعدِ فقہ یا فقہیہ کے متعدد پہلوؤں پر جو کام ان اکیڈمیوں نے کیا ہے اس کی اہمیت ساری دنیا پر واضح ہے۔ ان اکیڈمیوں کے اہداف میں جدید مسائل کا حل نکالنے کے ساتھ ساتھ مختلف صورتوں میں اسلاف کی کتابوں کی خدمت بھی ہے اور اس جہت میں معقول حد تک پیشرفت بھی ہوئی

ہے۔ دینی مدارس کے طلبہ عموماً اِن اکیڈمیوں کے کام سے واقف نہیں ہوتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان کے سامنے اِن مجمعات فقہیہ کا تعارف اور ان کا کام اور مستقبل کے لیے ان کے اہداف سامنے لائے جائیں۔ ان مجمعات کے کام سے طلبہ کی دلچسپی بڑھانے کے لیے ان اکیڈمیوں کے قیام میں کردار ادا کرنے والے اسباب وعوامل اور ان کے قیام کے پس منظر نیز ان کے ارکان کا تعارف کرایا جائے، کہ مثلاً عصر جدید کے مسائل ماضی کی بہ نسبت پیچیدہ بھی زیادہ ہیں اور حجم میں بھی شاید زیادہ ہیں۔ دوسری طرف اجتہادی صلاحیت بھی اسلاف کے مقابلے میں کم۔ اب انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے حوالہ سے ماہرین، جن کو شرعی علوم میں بھی دسترس حاصل ہو، وہ اجتماعی سطح پر کسی بھی مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور وفکر کے بعد جس نتیجے پر پہنچیں گے تو بظاہر کسی فرد کے اجتہادی عمل کے مقابلے میں اس اجتماعی غور وفکر میں خطا کا امکان کم ہوگا۔ اس طرح اجتماعی اجتہاد، جس کے لیے ان اداروں کا قیام عمل میں لایا گیا، کی اہمیت بتائی جائے۔ پھر ان اداروں کے طریقہ کار کی وضاحت کی جائے۔ اس کے ساتھ ان اکیڈمیوں میں پاس ہونے والی قراردادوں، کے بارے میں بتایا جائے جو اس اجتماعی اجتہاد کے نتائج ہوتے ہیں۔

ان اداروں کا تعارف اور ان کے کام کی تفصیلات ہر فقہی اکیڈمی کے ویب سائٹ پر موجود ہوتی ہیں۔ نیز اجتہاد، بالخصوص ''اجتماعی اجتہاد'' پر لکھی جانے والی کتابوں میں بھی اس حوالہ سے تفصیلات پائی جاتی ہیں۔

IV۔ ائمہ متبوعین اور اہم فقہی علوم

فقہی علوم کا مفصل تعارف

جب اسلام سرعت کے ساتھ عرب سے عجم میں پھیل رہا تھا، تو ہر نئی قوم اپنے ماضی کے رجحانات کے ساتھ اسلام میں داخل ہو رہی تھی۔ ایک جانب دین میں ان رجحانات کی آمیزش کا خطرہ تھا تو دوسری طرف نئے نئے لوگوں کے ساتھ نئے نئے مسائل بھی اسلام سے اپنا حل طلب کر رہے تھے۔ گویا

اسلام کو یہ دو طرح کے چیلنج درپیش تھے: ایک جو مسائل قرآن وسنت میں صراحت کے ساتھ بیان نہیں ہوئے ہیں ان کے احکام دریافت کرنا ایک اہم مطالبہ تھا، اور ظاہر ہے کہ جدید مسائل کا جواب دینا اور ان کے اسلامی احکام دینا اسلام کی وسعت اور آفاقیت کا مظہر تھا۔ ایسے میں اسلام کی تشریح وتعبیر اور قرآن وسنت کی تفہیم کے لیے ایک واضح اور درست منہاج مقرر کرنا ناگزیر تھا۔ دوسرا چیلنج، جو اسلام کو درپیش تھا، وہ اسلام کو تمام نئی مسلم اقوام کے ماضی کے رجحانات اور روایات کی آمیزش سے محفوظ رکھنا تھا، تاکہ ان کی آمیزش سے اسلامی تعلیمات کی شکل بگڑ نہ جائے۔

انہیں حالات میں فقہا کی ایک جماعت نے چاہا کہ اسلام کے فروعی مسائل کے لیے اصول وضع کیے جائیں اور اس طرح فروعی مسائل کو اصول کے ستون سے ایسی مضبوطی کے ساتھ باندھ دیا جائے جو ہلائے نہ ہلے۔ اصول وقواعد کے مطابق تشریح اسلام کی صحیح ترجمانی کی ضامن ہو اور ان کی خلاف ورزی جادۂ استقامت سے انحراف متصور ہو۔ فقہا کی وہ جماعت جہاں فطری استقامت، سلامت روی، خلوص اور للّٰہیت کے زیور سے آراستہ تھی، وہیں ان کے اندر نصوص فہمی، استنباطِ مسائل اور عربی زبان وادب کا اعلیٰ درجے کا ذوق سلیم موجود تھا۔ وہ قواعد وضوابط کے اس طرح مدون ومرتب شکل میں محتاج نہ تھے۔ وہ اپنے ذوق سلیم سے استفادہ کرکے شریعت کے احکام خود بھی سمجھتے تھے اور لوگوں کو بھی سمجھاتے تھے۔

انہوں نے قرآن وسنت کے معانی تک پہنچنے کے لیے لفظی اور معنوی قواعد وضوابط مرتب کیے۔ اس طرح اسلام غیروں کی دست برد اور باطل کی آمیزش سے محفوظ رہا۔ اِن قواعد وضوابط کی تدوین کے بعد تمام اہلِ علم کے لیے آسانیاں پیدا ہوگئیں، جدید مسائل کے حل میں جو مشکلات پیش آرہی تھیں، ختم ہوگئیں۔ اِن قواعد کی روشنی میں جہاں ائمہ متبوعین کا منہج اور استنباطِ مسائل کا طریقہ کار معلوم ہوتا ہے، وہیں احکام شرعیہ صحیح طور پر سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے، اور فقہی بصیرت اور ملکہ پیدا ہوتا ہے۔

اِن قواعد کی تدوین مختلف شکلوں میں ہوئی اور تقریباً یہ تمام اشکال مستقل علوم اور فنون کی صورت اختیار کرگئیں۔ مثلاً ۱. **علم القواعد الفقهية** ۲. **علم الاشباه والنظائر** ۳. **علم الفروق**

الفقھیہ، ۴. علم تخریج الفروع علی الاصول ۵. علم تخریج الاصول علی الفروع، ٦. علم النظریات الفقھیة وغیرہ۔ اِن علوم وفنون کے درمیان ان کی تعریفات کے پیش نظر اگر چہ فنی فرق پایا جاتا ہے، لیکن ان سب کا مشترکہ مقصد تقریباً ایک ہے اور وہ یہ کہ جدید مسائل کا حل نکالنے کے لیے اور درپیش چیلنجز کا مقابلہ کرنے کے لیے جہاں نصوص کا صحیح فہم ضروری ہے، وہاں ائمہ متبوعین کے ورثے کے فہم کی افادیت میں بھی شک نہیں۔ اس لیے کتاب وسنت کی نصوص کو متن اور فقہی ذخیرے کوشرح کا مقام دے کران کے صحیح، منضبط اور تکمیلی فہم کے حصول کے لیے ان علوم کو مرتب کیا گیا۔ مذکورہ علوم میں سے ایک دو کے علاوہ بقیہ سب کی ترتیب وتدوین اِن فقہا ہی کے ہاتھوں ہوئی ہے اور انہوں نے ہی ان علوم میں کتابیں لکھی ہیں۔٦ ان علوم کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر مدارسِ دینیہ میں ان کی تدریس کامل توجہ کی مستحق ہے اور مزید بحث وتحقیق کے لیے ان فنون میں موجود نظری اور تطبیقی دونوں قسم کی کتابوں کی طرف طلبہ کی راہنمائی ضروری ہے۔

قواعد فقہ کی تدریس

قواعد فقہ اور اس علم کے دیگر ذیلی علوم کی اہمیت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ان علوم کی مدد سے نتائج اخذ کرنے اور استنباطِ مسائل کی طاقت مضبوط ہوتی ہے۔ اور استخراجِ مسائل کی استطاعت کا حصول تدریسِ فقہ کے مقاصد میں ایک اہم مقصد ہے۔ دراصل قواعد فقہ اور دیگر ملحق علوم ذاتی مطالعے اور اپنے طور پر مسلسل غور وفکر کی تمرین کے علوم ہیں۔ لیکن اگر ماضی کے مقابلے میں آج طلبہ میں مطالعے کی کافی کمی محسوس کی جاتی ہے تو عالمِ عرب اور پاکستان کے بعض عصری اداروں کی طرح دینی مدارس میں بھی قواعد فقہ کی تدریس مستقل طور پر ہونی چاہیے۔ اس سلسلے میں اگر چہ بعض مدارس میں **الاشباہ والنظائر** یا قواعد فقہ کی چند کتب کے مخصوص حصے اب بھی پڑھائے جارہے ہیں تاہم قواعد فقہ کے علم کی اہمیت اور اس سے وابستہ مقاصد کو دیکھ کر موجودہ تدریسی مواد بہر صورت ناکافی ہے۔ اس سلسلے میں چند ایک تجاویز پیشِ خدمت ہیں:

۱۔ تخصص فی الفقہ یا افتاء کے سال میں **الاشباہ والنظائر** کی تدریس کا جو طریقہ رائج ہے

اس میں مزید بہتری لائی جائے۔اور دیگر علوم وفنون کی طرح اس علم کی تدریس میں بھی خصوصی اہتمام سے کام لیا جائے۔طلبہ کو مطالعے کا پابند بنایا جائے جس کے لیے آسان طریقہ یہ ہے کہ اس علم کے امتحان کے نظام کو مستحکم کیا جائے۔

مشکل اور اہم مقامات باضابطہ طور پر پڑھائے جائیں اور نسبتاً آسان اور جہاں تفصیل مطلوب نہ ہو وہاں طلبہ سے مطالعہ کرایا جائے اور سب کو امتحانی حصے میں شامل کیا جائے۔اس طریقے سے قواعدِ فقہ کی تدریس ایک مستقل علم کے طور پر ہوگی جس کے مبادیات مثلاً اس علم کا آغاز وارتقا، تاریخِ تدوین، مختلف مذاہب کے اہل علم کی کتابوں کی نشاندہی اور اس علم میں مختلف اہل علم کی تصنیف وتالیف میں مختلف اسالیب اور مناھج کا تعارف وغیرہ امور کے بارے میں سال کے شروع میں تفصیلات فراہم کرنا استاد کی ذمہ داری ہوگی۔

۲۔ تخصص فی الفقہ یا افتاء کی تمرین سے پہلے بھی اس علم کی تدریس ہونی چاہیے۔لیکن اس مرحلے میں مستقل ایک علاحدہ علم کے طور پر ضروری نہیں بلکہ اس کا طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ **شرح الوقایة یاھدایه** کی تدریس کے وقت ہر باب کے آغاز میں اُس کتاب یا باب کے موضوع سے متعلق قواعدِ فقہ طلبہ کے سامنے رکھی جائیں، پھر استاد اپنی ساری تدریس کی بنیاد ان اصولوں پر رکھے اور اس کتاب یا باب کے تمام مسائل کو ان اصول وقواعد سے جوڑا جائے۔**ھدایة** کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ امام مرغینانی تمام اختلافی مسائل میں مختلف فقہا بالخصوص ائمہ اربعہ اور ائمہ احناف کی آراء کا التزام کرتے ہیں۔اس بناء پر ان سب ائمہ کے قواعد اور اصول سامنے لاتے ہیں۔دوسری خصوصیت یہ ہے کہ دلائل کے ضمن میں نصوص کے ساتھ عقلی اور تعلیلی نوعیت کے دلائل کا التزام کرتے ہیں۔اس طرح مختلف قواعد واصول کو متعین کر کے کئی کئی فروعی مسائل کو اُن اصولوں کے نظام میں منضبط کرنے کی عقلی مشق اور کوشش کی جاتی ہے جس کی مدد سے طلبہ کے اندر غور وفکر کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔اور قواعد و اصولوں کی مدد سے غور وفکر کے راستے روشن ہو جاتے ہیں۔

تدریسِ فقہ کے ساتھ قواعدِ فقہیہ کی تدریس کا یہ طریقہ نہ تو اجنبی ہے نہ زیادہ مشکل ہے۔ بلکہ

بعض مدارس میں جب ھدایۃ کی تدریس کسی کہنہ مشق مفتی اور تجربہ کار فقیہ کے ذمے ہوتی ہے تو ان کا طریقۂ تدریس بسا اوقات یہی ہوتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات ان کے ہاں یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی باب کے آغاز میں اصول رکھتے ہیں پھر ان کی روشنی میں باب کے اندر مذکورہ تمام فروعی مسائل کی وضاحت کرتے ہیں پھر اخیر میں اسی باب سے متعلق ایک دو جدید مسائل طلبہ کے سامنے رکھتے ہیں اور پڑھائے گئے قواعد و اصول کی روشنی میں ان مسائل کا حل طلبہ سے نکلوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلاشبہ تدریس کا یہ اعلیٰ طریقہ ہے۔

اس سلسلے میں اساتذہ کسی بھی باب کے قواعد از خود بھی جمع کر سکتے ہیں جس کے لیے قواعد فقہ کی ان کتابوں سے بھی مدد لی جا سکتی ہے جن میں قواعد فقہی ابواب کی ترتیب سے جمع کیے جاتے ہیں۔ اور بعض معاصر اہل علم کی کاوشوں سے بھی اساتذہ مدد لے سکتے ہیں، جنہوں نے قدیم اور طویل فقہی کتابوں کے اصول و قواعد کو جمع کیا۔ ۷

V۔ افتاء

اہمیت و ضرورت

مدارس دینیہ میں فقہ اسلامی کی تعلیم و تعلم کا مرحلہ **تخصص فی الفقہ الاسلامی** یا **تخصص فی الفقہ و الافتاء** پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں طلبہ ایک حد تک براہِ راست معاشرے کے مسائل اور مشکلات کا مشاہدہ کرنے اور پھر اپنے اساتذہ کی نگرانی میں ان کا حل پیش کرنے کی استعداد حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح طلبہ میں مسائل اور مشکلات کو سمجھنے اور پھر ان کے احکامات تلاش کرنے کی صلاحیت ابھاری جاتی ہے۔ مدرسے کی چار دیواری سے نکل کر از خود فریضہ افتاء سنبھالنے کے لیے چند اہم اور ضروری ہدایات دینی چاہییں۔ اس ذیل میں اساتذہ کی خدمت میں کچھ تجاویز پیش کی جاتی ہیں۔

سب سے پہلے تو اِس فریضے کی اہمیت اور ضرورت واضح کرنی ہے کہ اسلامی معاشرہ ہر وقت

ایسے افراد کا محتاج ہوتا ہے جو نئے پیش آمدہ مسائل میں ان کی راہنمائی کریں اور اسلام کے احکامات بتلائیں۔ درحقیقت افتاء کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ کسی بھی مسئلے میں شریعت جو حکم دیتی ہے اُس حکم کی طرف راہنمائی کی جائے۔ اسی کو آسان لفظوں میں "افتـــاء" کہا جاتا ہے۔ اِس لحاظ سے افتاء کا عمل فرض کفایہ بتایا جاتا ہے۔ معاشرے کے تمام افراد کبھی ایسے نہیں ہوتے کہ وہ اپنے تمام مسائل کا حل اور حکم شرعی قرآن وسنت کی نصوص سے از خود معلوم کر سکیں۔ چنانچہ اہل علم کی ایک ایسی جماعت ہونی چاہیے کہ لوگ اُس کی طرف رجوع کریں، اور وہ جماعت اس سلسلے میں لوگوں کی راہنمائی کرے اور اُنہیں اسلام کے احکام بتلائے۔ جس طرح قرآن کریم نے بھی حکم دیا ہے: **فَسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ** (اہل علم سے پوچھو اگر تم خود نہیں جانتے، النحل ۱۶: ۴۳)۔ اگر معاشرے کے عام افراد کو اہل علم سے جا کر مسائل پوچھنے کا حکم دیا جا رہا ہے تو اِس ضمن میں ضرور اہلِ علم کو بھی غور وفکر کر کے احکام کا استنباط کرنے کے لیے محنت اور کوشش اور پھر عوام کو بتانے کا حکم بھی شامل ہوگا۔ اِس طرح افتاء کا عمل معاشرے کی اصلاح کے لیے ایک مضبوط وسیلہ ہے۔

فریضہ افتاء کی اہمیت اور ضرورت کی طرف طلبہ کو متوجہ کرایا جائے کہ فتویٰ کا عمل جتنا اہم اور فضلیت والا ہے اُسی طرح معاشرے کی ضرورت بھی ہے اور اصلاح کا ایک بہترین وسیلہ بھی۔ فریضۂ افتاء کی ضرورت واہمیت پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ آداب افتاء کے موضوع پر لکھی گئی کتابوں کا ابتدائی موضوع تقریباً یہی امور ہوتے ہیں۔

اصول وضوابط

فتویٰ کی اہمیت اور اس کے اصول وقواعد پر بات کی جائے اور طلبہ کو فتویٰ کے اصول وآداب کے اہتمام والتزام کے بارے میں بتایا جائے۔ کیونکہ فتویٰ کا عمل کسی عارضی یا وقتی مسئلے میں محض اپنی رائے کا اظہار نہیں ہوتا اور نہ اپنے عقل وفہم کی مشق ہوتا ہے، بلکہ امت کی رہنمائی اور اُن تک اللہ تعالیٰ کا حکم پہنچانے کا فریضہ ہوتا ہے۔ تبلیغ دین اور احکام شرعیہ کی تعلیم کے فریضے میں مفتی انبیاء کرام کا نائب

ہوتا ہے۔ظاہر ہے کہ یہ عظیم فریضہ سرانجام دینے کے لیے اصول وقواعد ہیں جن کا ہر حال میں اہتمام و التزام ضروری ہوگا۔

اس سلسلے میں صحابہ کرامؓ، تابعین اور تبع تابعین حضرات سلف کے واقعات بیان کیے جائیں کہ اُن سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو کیسے فتاویٰ صادر فرماتے تھے، فتویٰ دینے کے لیے وہ کن امور کی پاسداری کرتے تھے اور کس شدت کے ساتھ وہ فتویٰ کے اصول وقواعد کا التزام کرتے تھے۔

طلبہ کی یہ ذہن سازی کی جائے کہ فتویٰ کا منصب بہت اہم اور نازک ہے، جس کا ایک اہم تقاضا تو مفتی کے لیے اپنی ذاتی زندگی میں متقی، پرہیزگار اور شریعت کا پابند ہونا ہے۔اس کے بعد فتویٰ صادر کرنے میں حد درجے کی احتیاط کرنا لازمی ہے۔اس ضمن میں اسلاف فتویٰ صادر کرنے میں احتیاط برتنے کے بہت سے واقعات معروف ومشہور ہیں، جن کی تدریس کے دوران وقتاً فوقتاً ذکر کرتے رہنا چاہیے۔

قدیم وجدید کتب فتاویٰ کا تعارف

فقہ علومِ اسلامیہ میں سب سے زیادہ وسیع اور دقیق علم ہے۔لیکن فتاویٰ کا میدان فقہ سے زیادہ وسیع ہے؛ اس لیے کہ فتاویٰ میں ایمانیات وعقائد، فرق وملل، تاریخ وسیرت، تصوف وسلوک، اخلاق، آداب، عبادات ومعاملات، معاشرت وسیاسیات کے ساتھ قدیم وجدید مسائل کا حل، اصولی وفروعی مسائل کی تشریح وتطبیق وغیرہ جیسے امور، جو عام فقہی کتابوں کا موضوع نہیں ہوتے، بھی شامل ہوتے ہیں۔اس گہرائی اور وسعت کے پیشِ نظر اسلاف کا ذخیرۂ فقہ ہمارے لیے یقیناً ایک بڑی نعمت ہے۔ چونکہ فتویٰ کا عمل عہدِ رسالتؐ سے لے کر تا حال جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا اس لیے آپؐ کے فتاویٰ (احادیث) شریعتِ اسلامیہ کا دوسرا ماخذ ہے۔آپؐ کے بعد فتویٰ کی ذمہ داری صحابہ کرامؓ نے سنبھالی اور ان کے فتاویٰ ''آثار'' کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہیں۔ان کے بعد تابعین کو اور اگلے مرحلہ میں تبع تابعین کو یہ فریضہ منتقل ہوتا رہا۔جب کہ تقریباً ہر دور میں فقہ وفتاویٰ کے مجموعے

مرتب ہوتے رہے۔فتاویٰ کے اِن مجموعہ جات کی اہمیت میں کوئی شک نہیں۔اُن سے بے اعتنائی کرتے ہوئے براہِ راست کتاب وسنت کے نصوص سے احکامِ شرعیہ اور استخراج کی کاوش پہیے کو دوبارہ ایجاد کرنے کے مترادف ہوگی۔ اس لیے طلبہ کو فتویٰ کی تحقیق اور بحث کے دوران ان مجموعوں کی ضرورت ہوگی اور انہی کی روشنی میں وہ یہ فریضہ احسن طریقہ سے سرانجام دیں گے۔لہٰذا اساتذہ کا فرض ہے کہ ہر مذہب کی معتبر فقہی کتابوں کی نشاندہی کے ساتھ فتاویٰ کی کتابوں کی طرف بھی راہنمائی کریں۔

ادبیات فتویٰ سے مسلسل اپنا تعلق قائم رکھنے کا ایک بڑا فائدہ کسی مسئلے پر غور وفکر کے راستوں کی نشاندہی ہے کہ طلبہ کتب فتاویٰ کی مدد سے مسائل کے تمام پہلوؤں کو نشان زد کرسکیں گے۔ نیز متعلقہ مسئلے کے بارے میں شریعت کے عام اصول اور مقاصد بھی سامنے آئیں گے۔ بیشتر مسائل میں کتب فتاویٰ کی طرف مراجعت کے بعد صرف ایک کام رہ جائے گا کہ کیا عرف اور لوگوں کے احوال وغیرہ امور، جو فتویٰ کی تبدیلی میں مؤثر ہوتے ہیں، کی وجہ سے یہی مذکورہ حکم قابلِ عمل ہے یا تغیر طلب ہے۔

تحریرِ فتاویٰ کی مشق اور جدید مقالات سے آگاہی

اس میں کوئی شک نہیں کہ افتاء کی مشق اور تربیت فقہی بصیرت پر مبنی ہے۔دینی مدارس میں ایسے حضرات زیادہ موجودہ ہوتے ہیں جن میں اسلامی علوم کے اصل مصادر ومراجع تک رسائی کی بنیادی صلاحیت ہوتی ہے، اس سلسلے میں وہ ماضی کے علمی ورثہ کے بہتر فہم اور اس سے استفادہ کے حوالے سے اپنے طلبہ کو بہتر تربیت کا انتظام کرسکتے ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ افتاء کا معاملہ فقہی علمی ورثہ کے ساتھ ساتھ آج کے مسائل وواقعات کی بھرپور معرفت اور مسئلے کی مکمل تصویر کے ادراک کا بھی محتاج ہوتا ہے۔اس لیے دینی مدارس کے جوہرِ قابل کو بہت زیادہ فائدہ مند بنانے اور اُنہیں ایک وسیع تر دائرے میں استعمال کرنے کے لیے ضروری ہے کہ فقہی تحقیق اور عصرِ حاضر کے علمی تقاضوں اور واقعات کی دنیا کو بہتر طور پر جاننے کے لیے حوصلہ افزائی کا ماحول پیدا کیا جائے، جدید حالات اور

اُنہیں جاننے کے ذرائع اور جدید اسالیبِ تحقیق سے واقف کرایا جائے۔ اس سلسلے میں عالمِ عرب کی جامعات سے بالخصوص اور پاکستان کے سرکاری اداروں یا متعلقہ مہارتیں رکھنے والے باوسائل اداروں اور شخصیات کے کام سے استفادہ ضروری ہے۔ کیونکہ وہاں پر بیشتر نئے موضوعات اور مسائل پر تحقیق کروائی جاتی ہے اور ایک ایک مسئلے پر کئی کئی مقالے دستیاب ہیں۔ اگر طلبہ ماضی کے علمی ورثہ کے فہم کی بہتر صلاحیت اور استعداد اپنے اساتذہ سے حاصل کریں اور موجودہ عملی دنیا کی معرفت اور مسئلے کی مکمل تصویر معلوم کرنے میں عصری اداروں کی کاوشوں سے استفادہ کریں گے تو مخصوص حالات کی روشنی میں حکمِ شرعی تک رسائی اور شارع کا منشا معلوم کرنے میں بڑی حد تک مدد ملے گی۔

......حواشی ......

۱۔ مثلاً شیخ مناع القطان، شیخ مصطفیٰ احمد الزرقاء، سلیمان الاشقر، شیخ علی السائس وغیرہ۔

۲۔ فقہی اختلاف کے آداب واصول پر بہت سے اہلِ علم نے لکھا ہے۔ مثلاً **اسباب اختلاف الفقهاء** از شیخ علی الخفیف، **مسائل في الفقه المقارن** ترتیب وتدوین ڈاکٹر عمر سلیمان الاشقر، **أثر الحديث الشريف في اختلاف الفقهاء** اور **أدب الاختلاف** از شیخ محمد عوامہؒ، **محاضرات في الفقه المقارن** از ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی، **الاختلاف الفقهي و أسبابه** از ڈاکٹر وجیہ محمود۔ اِن کے علاوہ اور بھی بہت سے حضرات نے لکھا ہے۔

۳۔ اِس پہلو پر شیخ محمود شلتوت اور شیخ محمد علی السائس کی مشترکہ کتاب **مقارنة المذاهب في الفقه**، ڈاکٹر محمد فتحی الدرینی کی **الفقه الإسلامي المقارن** اور ان کے مقالات کا مجموعہ دو جلدوں میں **بحوث مقارنة في الفقه الإسلامي و أصوله**. اِن کے علاوہ اور بھی اہل علم کی گراں قدر تصانیف ہیں۔

۴۔ مثلاً حنفی اور مالکی مذہب کے تقابلی مطالعہ کے لیے کتاب **الحجة علي أهل المدينة** از امام محمد، اور فقہ شافعی اور فقہ حنفی کے تقابل کے لیے **التجريد** از امام قدوری۔ چاروں فقہی مذاہب کے تقابل کے لیے **المغني** از ابن قدامہ، **المجموع شرح المهذب** از امام نووی، **الاستذكار لمذاهب علماء الأمصار** از ابن عبدالبر، **المحلی** از ابن حزم، **طريقة الخلاف في الفقه بين الائمة الأسلاف** از محمد بن عبدالحمید الأسمندی، **مختصر اختلاف**

العلماء از امام طحاوی۔ اِن کے علاوہ دو اہم اور قیمتی کتابیں ہیں جن کی قدر ہر دور میں کی جاتی رہی ہے۔ایک علامہ ابوزید عبیداللہ بن عمر الدبوسی کی **تاسیس النظر** ہے جس میں مصنف اختلاف کے ساتھ ساتھ اصول اختلاف کا ذکر بھی کرتا ہے۔ یہ کتاب فقہی مذاہب کے تقابل کے قواعد واصول پر اولین کتاب بتائی جاتی ہے جو مخصوص فقہی مسائل میں مختلف فقہا کی آراء کا تقابل کرتی ہے اور اس میں کسی ایک رائے کو ترجیح دینے کا التزام نہیں کیا جاتا۔ دوسری کتاب ابن رشد کی **بداية المجتهد** ہے، جس میں مصنف فقہی اختلافات کے ساتھ ہر مسئلے کے ساتھ اُس اختلاف کے اسباب ذکر کرتا ہے اور تمام مسائل کے تحت ہر فقہی رائے کے اصول وقواعد بتاتا ہے۔ سببِ اختلاف کا تذکرہ ایسی خصوصیت ہے جو طلبہ میں نصوص سے کثیر الجہت استدلال واستنباط کا ملکہ پیدا کرتی ہے، اگرچہ بعض جگہ یہ سبب ابن رشد کی اپنی اختراع ہوتا ہے۔ بیشتر عصری جامعات میں اس کتاب کو نصاب میں بھی شامل کیا گیا ہے۔ دینی مدارس میں بھی اس کا کچھ حصہ ہی سہی، شامل کرنا مفید ہوگا۔ ان دو حضرات کے علاوہ ابن المنذر کی کتاب **الإشراف على مذاهب العلماء** کو بھی خاصی اہمیت حاصل ہے۔ ابن المنذر نقلِ مذاہب میں زیادہ محتاط سمجھے جاتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ وہ ہر مسئلے میں کسی خاص فقہی مذہب کو ترجیح دینے کا التزام نہیں کرتے بلکہ جہاں جن کے دلائل قوی محسوس ہوں اُن کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ موصوف کی ایک اور بھی کتاب ہے جس کا نام ہے: **الأوسط فی السنن والإجماع والاختلاف**۔

اس جگہ دین میں توسّع اور اجتہادی امکانات کے بارے میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی کتاب **رفع الملام عن الآئمه الاعلام** اور شاہ ولی اللہ دہلوی کی کتاب **الانصاف** کا تذکرہ نامناسب نہ ہوگا۔

۵۔ "**فقه النوازل**" کے متعلق مزید جاننے کے لیے شارجہ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر عبدالحق بن احمد حمیش کا مبسوط تحقیقی مقالہ **مدخل إلي فقه النوازل** ملاحظہ کیجیے، جو (www.islamfeqh.com) پر بھی موجود ہے۔

۶۔ ان علوم کے تعارف اور تاریخ تدوین وارتقا اور ان میں نمایاں کتب کے معلومات کے لیے مندرجہ ذیل کتابوں کی طرف مراجعت کی جاسکتی ہے:

۱۔**القواعد الفقهية**، علی احمد الندوی، ۲۔**القواعد الفقهيه**، یعقوب بن عبدالوہاب الباحسین، ۳۔**تخريج الفروع على الاصول**، عثمان بن محمد الاخضر شوشان، ۴۔ **تخريج الفروع على الاصول عند الاصوليين والفقهاء**، جبریل بن المہدی بن علی میغا، ۵۔**المدخل الفقهي العام**، ۶۔ شیخ مصطفیٰ احمد الزرقاء۔

۷۔ مثلاً **المغنی، المبسوط، كتاب الأمّ للشافعي** وغیرہ کتابیں ایسی ہیں جن کو بعض حضرات نے اپنی محنت کا میدان بنایا اور ان سے فقہی اصول وقواعد کا استخراج کیا ہے۔ انہی کاوشوں کی روشنی میں **هدايه** یا کسی بھی نصابی کتاب کے قواعد جمع کیے جاسکتے ہیں۔

تدریس اصولِ فقہ

مولانا محمد رفیق شنواری

I۔ تاریخ، ضرورت واہمیت اور تقابلی مطالعہ

تاریخ تدوین اصولِ فقہ

علم کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ایک علوم عالیہ یعنی وہ علوم جو مقصود بالذات ہوتے ہیں۔ تدریس اور تعلیم کا ہدف انہی علوم کا حصول ہوتا ہے۔ دوسری قسم علوم آلیہ، یعنی وہ علوم جو بذاتِ خود تو مقصود نہیں ہوتے لیکن ان کا حصول اس لیے ہوتا ہے کہ انہی کے ذریعے مقصود علوم تک رسائی ممکن ہوتی ہے۔ اِن علوم کا استعمال ذرائع، وسائل اور آلیات کے طور پر ہوتا ہے۔اس بات میں کبھی دو آرا نہیں رہیں کہ اصولِ فقہ کا شمار دوسری قسم کے علوم میں ہوتا ہے یعنی اصولِ فقہ کا علم عظیم الشان اور رفیع المقام ہونے کے باوجود ایک ذریعے اور وسیلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ تمام اسلامی علوم کا لب لباب اور نچوڑ کتاب وسنت کی نصوص کا صحیح فہم ہے۔ جسے فقہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔کوئی بھی استاد طلبہ کو فقہ کی تعلیم، یعنی کتاب وسنت کا درست فہم اور مسائل کا حل ڈھونڈ نکالنے کی صلاحیت، اسی صورت میں بہتر طور پر دے سکتا ہے، جب فہم اور استخراج کے اصول اور قواعد سے اُنہیں اچھی طرح آشنا کیا گیا ہو۔

اِس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ فقہ کا موجودہ ذخیرہ مختلف ادوار اور مختلف حالات میں تشکیل پایا ہے۔ اوراس کے بعد بھی اسے مسلسل ترتیب وتدوین کے مراحل سے گزرنا ہے۔اِس کا بنیادی سبب انسانی معاشرے میں پیش آنے والے نت نئے حالات، مسلسل تغیرات، مسائل اور مشکلات ہیں۔

اسلامی تعلیمات جامد نہیں بلکہ ''حرکی'' صلاحیت کی حامل ہیں اور ہر نوعیت کے حالات میں بھرپور طریقے سے انطباق کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ یہ تمام مسائل اور مشکلات کا حل دینے کی ضامن ہیں، مختلف ادوار میں جیسے جیسے حالات اور چیلنجز بدلتے رہے ہیں، ان کے ساتھ ساتھ فقہ بھی اپنے طبعی لچک کی وجہ سے مختلف صورتوں میں مرتب ہوتا رہا۔

جب فقہ ترتیب و تدوین کے مختلف مراحل سے گزرتا رہا ہے تو اس کے اصول و قواعد (جسے اصول فقہ کہتے ہیں) بھی لامحالہ مختلف طریقوں سے مرتب و مدون ہوتے رہے ہوں گے۔ فقہ کے استاد کا کام ہے کہ وہ اپنے طلبہ کو ان حوالوں سے اصولِ فقہ کی آ گہی دے۔

بہتر ہوگا کہ استاد کلاس میں تفصیل کے ساتھ ان حالات و واقعات اور اصولِ فقہ کی مختلف اشکال اور صورتیں، جن میں وہ مختلف ادوار میں مرتب ہوتا رہا، اور ان کے اسباب اور وجوہات بھی طلبہ کے سامنے رکھیں۔ استاد طلبہ کو یہ ذہن نشین کرائیں کہ کس طرح سلف صالحین نے اولاً مشکلات کو سمجھا، پھر ان مشکلات و مسائل کا جواب دینے کے لیے انہوں نے کس طرح اصول وضع کیے، اور کس طرح ان اصولوں کو مخصوص شکل میں ایک دوسرے سے جوڑ کر ایک نیا نظام قائم کیا۔ پھر سلف کے دور کے بعد جب حالات اور مسائل تبدیل ہو گئے تو کس طرح ان کے بعد آنے والے فقہا نے اِن مسائل کو دیکھا اور ضرورت محسوس کرنے پر کس طریقے سے پہلے سے موجود اصول وقواعد کے نظام یا ترتیب و تدوین میں تبدیلی کی گئی۔ اس نوعیت کی تعلیم سے ہمارے خیال میں طلبہ کے اندر جہاں تحقیق کا رجحان پروان چڑھے گا وہاں اصول فقہ کا علم ایک فلسفہ نہیں رہے گا بلکہ اپنا ثمر، جو استنباط و استخراج کا ملکہ ہے، طلبہ کو منتقل کرے گا اور طلبہ اس قابل ہو جائیں گے کہ نصوص میں غور و فکر کریں اور اسلام کو ایک زندہ مذہب، ہر دور، ہر قوم اور ہر معاشرے میں انطباق کی صلاحیت رکھنے والے مذہب کے طور پر متعارف کرائیں۔

علم اصولِ فقہ مختلف ادوار میں کس طرح مدون ہوتا رہا، کیسے اور کتنے مناہج اختیار کیے جاتے رہے؟ ہر دور کی بہ نسبت پچھلے منہج میں تبدیلی یا اس سے مختلف منہج اختیار کرنے کی کون سی ضرورتیں پیش

آتی رہیں، نیا منہج اختیار کرنے کے لیے کیا قواعد اور شرائط رکھی گئیں؟ اِن سب سوالات کا جواب دینا استاد کی ذمہ داری ہوگی۔ا

اصولِ فقہ کی تدریس کی ذمہ داری اٹھانے والے حضرات اساتذہ کرام اِن مآخذ کو ملاحظہ کریں تو اُن پر واضح ہوگا کہ طلبہ کے سامنے اصولِ فقہ کی تدوین وترتیب کے مراحل پر گفتگو کی کیا اہمیت اور ضرورت ہے۔اس پہلو کو تفصیلاً طلبہ کے سامنے رکھے جانے کے بعد طلبہ کو احساس ہوگا کہ اصول فقہ کی تدوین کس غرض کے لیے ہوئی اور کتاب وسنت کا صحیح فہم حاصل کرنے کے لیے اُسے ہمارے اسلاف کس طرح استعمال کرنے لگے،اوران اصولوں سے کس طرح استخراج واستنباط کا ملکہ پیدا ہوتا ہے۔

اصولِ فقہ کی ضرورت واہمیت

کسی بھی علم کی تعلیم دینے یا کوئی بھی کتاب پڑھانے کے لیےاولاً استاد کی ذمہ داریوں میں طلبہ کے سامنےاس علم کی ضرورت واہمیت رکھنا ہوتا ہے۔اس ضمن میں بہترین حکمتِ عملی یہ ہے یہ بطور نمونہ طلبہ کے سامنے عملی زندگی کے چند مسائل اور پہلو رکھے جائیں اور پھر یہ بتایا جائے کہ متعلقہ علم سے ان مذکورہ مسائل کا حل کس طرح نکلتا ہے۔

اصولِ فقہ کے علم سے آشنائی کے نتیجہ میں طلبہ کو متقدمین فقہا کے کام کا اندازہ ہوتا ہے،ان پر واضح ہوتا ہے کہ ایک قرآن اور ایک پیغمبر کے پیروکار ہونے کے باوجود وہ کیوں فروعی مسائل میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔اس اختلاف کے کیا اسباب اور وجوہات ہیں؟ پھر ایک امام کے مقلدین کے درمیان بعض مسائل میں کیوں متعدد اقوال پائے جاتے ہیں؟ ہر ایک فقہی مذہب اپنے اندر کس طرح منظّم اور متکامل ہے؟ ایک مسئلے کے متعلق مختلف اقوال کی صورت میں کیا کیا جائے؟ بسا اوقات بظاہر دو متعارض حدیثیں سامنے آتی ہیں یا قرآنی آیت اور حدیث کا آپس میں تعارض ہوتا ہے۔یا اجماع اور حدیث کا آپس میں تعارض ہوتا ہے۔یا بالعموم دو دلیلیں آپس میں متعارض ہوتی ہیں،تو پھر اس صورت میں کیا کیا جائے؟ جدید مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے کیا طریقہ کار رہے؟اس کے کیا

اصول ہیں؟ افتاء کے کیا اصول ہیں؟ افتاء کے کیا شرائط وقواعد ہیں؟ درحقیقت شریعت کا جامد نہ ہونا اور ہر وقت ہر جگہ اپنی تعلیمات کی تطبیق کی صلاحیت رکھنے کا اثبات اصولِ فقہ کی تعلیم کے نتیجہ میں بہت واضح ہوکر طلبہ کے سامنے آجاتا ہے۔

اصولِ فقہ کا تقابلی مطالعہ

ایک مشہور مستشرق جوزف شاخت نے اپنی کتاب (An introduction to Islamic law) میں تقریباً انہی مضامین سے بحث کی ہے جو مسلمان فقہا کی **المدخل لدراسة علم الفقه** وغیرہ ناموں سے کتابوں میں شامل ہیں۔ بنیادی طور پر اس کتاب کا موضوع فقہ اسلامی اور اجتہاد و استنباط کی تاریخ ہے۔ جس کی روشنی میں اس نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ فقہی اصول وقواعد کب، کس اسلوب پر اور کس طرح مدون ہوئے۔ مستشرق ہوکر اس نے اپنی اس معروف کتاب میں کس حد تک فقہ اسلامی، فقہی مذاہب اور استنباط واستخراج کی تاریخ کی صحیح ترجمانی کی ہوگی، اس پر کچھ کہنا اس وقت ہمارا موضوع نہیں ہے۔ بنیادی طور پر اس نے اپنی کتاب میں یہ اعتراض اٹھایا ہے کہ تمام مسلمان فقہا اس پر متفق ہیں کہ امام شافعیؒ ہی نے اصولِ فقہ کا علم وضع کیا اور اُن سے پہلے اصولِ فقہ کا علم موجود نہیں تھا۔ اور دوسری طرف مسلمان فقہا اس پر بھی متفق ہیں کہ فقہ کا مطلب کتاب وسنت کا عمیق فہم ہے جو عہد رسالت ہی سے چلا آیا ہے اور امام شافعیؒ فقہ اسلامی کے واضع نہیں بلکہ فقہا کے تسلسل کی ایک کڑی ہیں۔ تیسری طرف مسلمان فقہا کا اس باب میں بھی کوئی اختلاف نہیں کہ فقہ کے لیے بنیاد اصولِ فقہ ہے۔ تو اب سوال یہ ہے کہ فقہ تو عہدِ رسالت سے موجود ہے، جبکہ اصولِ فقہ کا واضع امام شافعی کو سمجھا جاتا ہے۔ تو کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ فقہ امام شافعی کے دور تک بغیر بنیادوں کے اور بغیر کسی اصولوں کے مرتب ہوتا رہا؟ جب اصولِ اجتہاد نہیں تھے تو بنیادوں کے بغیر فقہ کس طرح وجود میں آیا؟ ایسے میں فقہ کے بعد اصولِ فقہ کو وضع کرنے سے کیا مطلب؟ نیز جب اجتہاد کے اصول وقواعد مرتب نہیں تھے تو کیا اجتہاد ایک آزاد اور صوابدیدی عمل رہا جو خواہشِ نفسانی کے اثرات سے کبھی خالی نہیں ہوسکتا؟

مذکورہ کتاب سے ہم نے صرف ایک ہی اعتراض ذکر کیا ہے۔اب ہمارے غور کرنے کا پہلو یہ ہے کہ کیا ہماری اولین ذمہ داری صرف کسی خاص مسلک کا دفاع ہے یا مجموعی طور پر فقہ اسلامی اور تمام فقہا اور متقدمین علماء کے تمام علمی کام کی مساعی جمیلہ کی حفاظت ہے؟ اس طرح کے شکوک وشبہات کا ازالہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اصولِ فقہ کا تقابلی مطالعہ بھی طلبہ کو کرایا جائے تا کہ وہ یہ جان لیں کہ حنفی یا شافعی اجتہاد سے بڑھ کر فی نفسہٖ فقہی اجتہاد کیا ہے اور مختلف ائمہ اور فقہا کے وہ کیا اصول ہیں جن کی بنیاد پر فروعی مسائل میں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مثلاً دورانِ تدریس کوئی بھی اصولی مسئلہ ہو تو اس کے متعلق مختلف فقہا کی آراء کا ذکر یں،ان کے دلائل بتائیں اور فروعی مسائل پر اس اختلاف کے اثرات اور نتائج بتائیں کہ اس اصولی مسئلہ میں اختلاف کی بنیاد پر فلاں فقہی مذہب کا اس فرعی مسئلے میں یہ موقف ہے اور فلاں مذہب کا یہ موقف۔اس طریقہ کار کو **اصول الفقه المقارن** یا اصولی فقہ کا تقابلی مطالعہ کہا جاتا ہے۔اس پر متعدد اہل علم نے لکھا ہے۔معاصرین یا ماضی قریب میں اصولِ فقہ پر لکھنے والے حضرات علماء اصولی مسائل کا ذکر کرتے وقت متعدد فقہا کی آراء کا ذکر کرتے ہیں۔اور پھر دلائل کا محاکمہ بھی کرتے ہیں اور ہر مؤلف اپنے فقہی ذوق کے مطابق کسی خاص رائے کو ترجیح بھی دیتا ہے۔ایک اچھی اور جامع کتاب اس موضوع پر ڈاکٹر عبدالکریم نملہ کی کتاب **المهذب في اصول الفقه المقارن** ہے۔

اصول فقہ کا اس طرح تقابلی مطالعہ کرانے سے طلبہ پر یہ حقیقت واضح ہوگی کہ ہر فقہی مذہب کے کیا اصولِ اجتہاد ہیں، ہر فقیہ کا فقہی ذخیرہ کس طرح متکامل اور منظّم ہے۔اس طریقے سے ہم اپنے تمام سلف کی کاوشوں کی حفاظت کرنے اور اُن سے مستفید ہونے کے قابل ہوں گے۔

اجتہاد کی صلاحیت کا حصول

سطور بالا میں ذکر کردہ جوزف شاخت کے اعتراض کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ اصولِ فقہ، جو فقہ کے لیے بنیاد بتائی جاتی ہے، کا بعد میں مدون ہونا اور فقہ کا اس سے پہلے معرضِ وجود میں آنے کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ قرونِ اولیٰ میں اجتہاد اور کتاب وسنت کی نصوص کی تعبیر ایک آزاد، انفرادی

اور صوابدیدی قسم کا عمل تھا۔ جس کے اصول تھے نہ قواعد، نہ یہ فریضہ سرانجام دینے والے کے لیے کوئی شرائط اور معیار۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فقہ اسلامی نہ تو کتاب وسنت سے ہم آہنگ ہے نہ خواہشات نفسانی اور حکمرانوں کی دخل اندازی سے بالاتر ہے۔ اور نہ اس کے لیے کوئی بنیاد ہے۔ بعد میں امام شافعی نے جو اصول فقہ مرتب کیا اور اُسے فقہ کے لیے بنیاد قرار دیا گیا تو اس میں کوئی معقولیت نہیں۔

غور کیجیے کہ اس سلسلے میں اصولِ فقہ کے استاد کی ذمہ داری کتنی اہمیت رکھتی ہے اور کتنی ضرورت ہے کہ آج کے طلبہ کا متقدمین فقہاء کرام کے ساتھ اعتماد کا رشتہ جوڑا جائے۔ فقہ کی بنیاد کس طرح اصولِ فقہ ہی پر ہے ان تمام امور پر سیر حاصل گفتگو کرنا اور اس سلسلے میں تمام شکوک وشبہات کا ازالہ اساتذہ کا فرض بنتا ہے۔

اس پہلو پر کیا جانے والا کام **مناھج الاصولیین** کے نام سے جانا جاتا ہے جو تاریخ تدوین اصولِ فقہ کا حصہ ہوتا ہے اور اس پر خاصا کام ہوا ہے، جس کی طرف اساتذہ کرام مراجعت کر کے بھرپور تیاری کر سکتے ہیں۔ اس موضوع پر کام کرتے ہوئے اصولِ فقہ کی تاریخ تدوین کے مختلف مراحل میں ان مقامات کو متعین کیا جاتا ہے جن میں کوئی خاص اور مختلف نوع کا منہج اختیار کیا گیا ہو۔

اس سلسلے میں ابتدا امام شافعی کے کام سے نہیں بلکہ عصرِ صحابہؓ ہی سے کی جاتی ہے۔ پھر تابعین اور تبع تابعین کے ادوار کی طرف آیا جاتا ہے۔ اور یہ واضح کرنے کی کوشش ہوتی ہے کہ امام شافعی سے پہلے فقہاء کرام اجتہاد کیا کرتے تھے۔ اور اجتہاد کے اصول ان کے دور میں بھی موجود تھے۔ وہ جلیل القدر ائمہ فقہا اجتہاد کے اصولوں کی پاسداری کسی صورت میں کرتے تھے، اور کس طرح اپنے تلامذہ کو اجتہادی عمل کی تمرین انہی اصولوں اور قواعد کے حدود کے اندر کرواتے تھے۔ بعد ازاں امام شافعیؒ کے دور میں کس طرح اصولِ فقہ ایک مستقل علم کی شکل میں مدون ہوا اور آئندہ مراحل میں کس طرح اصولیین کی مختلف مناہج کے ذریعے تدوین وترتیب کے مختلف مراحل سے ہوتا ہوا آج ہمارے پاس سیکڑوں کتابوں کی صورت میں محفوظ ہے۔ **مناھج الاصولیین** کے عنوان کے تحت یہ تمام تفصیلات

فراہم کی گئی ہیں۔

مناھج الاصولیین کا دوسرا بڑا فائدہ اجتہاد کی تاریخ اور استنباطِ مسائل کی سرگرمیوں سے آگاہ کرانا ہے۔ اس آگہی سے فقہی ملکہ مضبوط ہوتا ہے اور کتاب وسنت سے مسائل کے استخراج کی ذہنیت اور صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ اس موضوع پر گفتگو کے دوران طلبہ کے سامنے مختلف فقہی مذاہب اور فقہاء کرام کے اصولِ اجتہاد سامنے آجاتے ہیں۔ اور پھر ان کی مزید وضاحت کے لیے نئی نئی مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ جس سے اجتہاد جیسے عظیم المرتبہ علم اور نازک عمل سے وابستگی پیدا ہوتی ہے۔[۲]

تدریس اصول فقہ کے لیے نصابی کتب کا تعین

مدارس میں تدریس اصولِ فقہ کے لیے جن کتابوں کا تعین کیا جاتا ہے ان کی اہمیت اور افادیت میں کوئی شک نہیں۔ ذاتی مشاہدہ اور طالب علم کی حیثیت سے عملی تجربہ کے پیشِ نظر مثال کے طور پر یہاں وفاق المدارس العربیہ کا ذکر ہوگا۔ وفاق المدارس العربیہ کے تحت اولاً اصول الشاشی پھر نورالانوار (بیشتر مدارس میں قیاس کا حصہ نہیں پڑھایا جاتا) اور پھر اس کے بعد **حسامی** اور پھر آخیر میں **التوضیح شرح التنقیح مع شرح التلویح** پڑھائی جاتی ہیں۔

یہ کتابیں جس ماحول میں، جس دور میں اور جن مسائل کا جواب دینے کے لیے لکھی گئی تھیں، وہ جدید دور، ماحول، اور مسائل کی نوعیت سے بہت مختلف تھا۔ اِن کتابوں میں درج علمی مباحث اور احکامات اور ان کی استناد وثقاہت میں کلام نہیں۔ اسی طرح ان کی طرف ہماری احتیاج میں بھی کوئی شک نہیں۔ لیکن اگر انہی کاوشوں کو اور انہی عالی شان دماغوں کے حاصل کردہ نتائج کو جدید ترتیب اور جدید اسلوبِ بیان کے مطابق تیار کر دیا جائے، نیز اس میں ان ذیلی مسائل کو بھی شامل کر دیا جائے جو دور جدید کے مسائل اور مشکلات کا جواب دینے میں مدد ومعاون ہو سکتے ہیں اور جو اپنے دور کی معتبر ترین علمی شخصیات کے غور وفکر کے نتائج ہیں تو ان کی افادیت میں بھی کوئی شک نہیں ہونا چاہیے۔

اس سلسلے میں ہماری تجویز ہرگز یہ نہیں کہ اِن کتابوں کے بجائے نئی رسالہ نما کتابیں نصاب میں رکھی جائیں۔ اس لیے کہ متقدمین اسلاف ہی کے مستند اور ٹھوس علوم اور طریقہ کار کو جو انہوں نے کتاب وسنت کی علوم کے لیے بطور خاص وضع کیا ہے ہم نے لے کر آگے جانا ہے۔ ہماری تجویز کا حاصل یہ ہے کہ یا تو انہی کتابوں کو اس طریقے پر پڑھایا جائے کہ اولاً سال کے ایک حصے میں ایک کتاب میں سے **الحکم الشرعی** کے مباحث پڑھائے جائیں۔ پھر سال کے اگلے حصے میں **الادلة الشرعية** اور تیسرے حصے میں **تفسير النصوص** اور پھر سال کے آخر میں اس کتاب سے اجتہاد کے مباحث پڑھائے جائیں۔ یہی طریقہ اگلے سالوں میں بھی اختیار کیا جائے۔ یا اس سے بھی بہتر طریقہ یہ ہوگا کہ سالِ اول میں **اصول الشاشی** سے پہلے تدریسِ اصول فقہ کے لیے ایسی کتاب کا تعین کیا جائے جو ترتیب میں جدید کتب کے ہم آہنگ ہو، اور اس کی معلومات مستند ہونے کے ساتھ زبان اور اسلوب سہل ہو۔ اس کے لیے ڈاکٹر وہبۃ الزحیلی یا ڈاکٹر عبدالکریم زیدان کی کتاب **الوجيز في اصول الفقه** زیادہ مناسب ہے۔ پھر اگلے سال معیار کے لحاظ سے نسبتاً بلند پائے کی کتاب کا تعین کیا جائے جس کے لیے **اصول الفقه** ڈاکٹر حسین حامد حسان کی کتاب زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہے۔ پھر اس سے بھی اگلے سال **حسامی** کے ساتھ اس سے نسبتاً بلند معیار کی کتاب مطالعہ کرانے کے لیے رکھی جائے جس کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا ہو اور پندرہ یا بیس روز کے بعد جائزہ لیا جائے۔

اصولِ فقہ کی تدریس کے ضمن میں ایک معاصر عالم ڈاکٹر مصطفیٰ الخن کی کتاب **اثر الاختلاف في القواعد الاصولية في اختلاف فقها** سے واقفیت بھی اساتذہ وطلبہ کے لیے افادے کا باعث ہوگی۔ یہ ایک عمدہ کتاب ہے۔

تدریسِ اصولِ فقہ کا مؤثر طریقہ

دیکھنا چاہیے کہ اصول فقہ کی تدریس سے کیا غرض ومقصد ہے؟ اس علم کی تدریس وتعلیم سے کن اہداف تک رسائی مقصود ہے؟ تو سادہ لفظوں میں تدریسِ اصولِ فقہ سے غرض دو طرح کی چیزیں ہونی چاہییں:

اولاً: متقدمین فقہا اور علماء کے فقہی مدارک کی فہم، یعنی انہوں نے جس طرح مسائل کا قرآن کریم اور سنتِ نبویہ ﷺ سے استخراج کیا ہے، ہمیں صرف ان مسائل اور ان حوالوں سے اصولوں کو حفظ کرانا نہیں بلکہ اجتہاد کے اصول وقواعد کی روشنی میں اس پر علمی اور تحقیقی درجہ کے اعتماد کا حصول ہے تاکہ طلبہ اس علمی استدلال کو سمجھیں جس کی بنیاد پر ان کا نصوص سے استنباط کیا گیا ہے۔

ثانیاً: اس عظیم فقہی ذخیرے سے استفادے اور بہ تکرار اس میں غور وفکر کی تمرین کی مدد سے اصولوں کو سمجھنے کے بعد جدید مسائل پر استنباط کے لیے ملکہ اور استعداد کا حصول ہے، یعنی اصولِ فقہ پڑھ کر طلبہ اس فقہی ذخیرے سے مستفید ہوں، اس میں مسلسل غور وفکر کر کے انہیں اس قابل بنایا جائے کہ جدید مسائل کا حل فقہی اصولوں کی روشنی میں نکالنے پر قادر ہوں۔

اِن اغراض ومقاصد کو سامنے رکھ کر دیکھنا ہوگا کہ ہم اپنے اس دور میں کس نوعیت کے مسائل کا سامنا کر رہے ہیں اور جدید وضعی قوانین اور استشراق وغیرہ کی طرف سے ہماری اس فقہی تراث پر کس نوع کے حملے ہو رہے ہیں۔ اس تناظر میں اگر دیکھا جائے تو یہ بات سمجھنے میں کوئی دقت نہیں کہ سیکڑوں سال پہلے لکھی گئی کتبِ اصولِ فقہ کی تدریس کا موجودہ طریقہ کار کافی نہیں کہ بسم اللہ سے شروع کر کے اخیر تک مختصر تشریح کے ساتھ یہ پڑھا دی جائیں۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ مسلمانوں کے فقہ اور اصول فقہ کے متبادل غیر مسلموں کے مختلف وضع کردہ نظامہائے قانون اور اصولِ قانون اپنے لیے کن خصائص کا دعویٰ کرتے ہیں اور اصولِ فقہ کو کن غلط فہمیوں اور اعتراضات کی بنیاد پر جامد اور فرسودہ قرار دیتے ہیں۔ اس کے لیے بقدرِ ضرورت ہمیں آج کی قانونی دنیا کے رسم ورواج اور ترتیب وطریقہ کار کو سمجھنا ہوگا۔

اساتذہ کرام غور کریں کہ جدید وضعی قوانین کے علمبردار اولاً کن تصورات اور نظریات کا ذکر کرتے ہیں جن پر بعد میں اپنے قانونی نظام کی عمارت کھڑی کرتے ہیں۔ اور پھر ان تصورات اور نظریات کی افادیت، تاثیر اور جامعیت پر اور اسی طرح ان کے ساتھ پورے قانونی نظام کی ہم آہنگی پر فخر کرتے ہیں۔ دوسری طرف اصول فقہ کی جامعیت اور فقہ واصول فقہ کے درمیان ایک فرضی خلیج نظر

آنے پر اسلامی قانون پر تنقید کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں ہم ہرگز یہ نہیں کہتے کہ دینی مدارس کے اساتذہ کرام اس وقت تک اصولِ فقہ کی تدریس نہ کریں جب تک خود قانون کا علم حاصل نہ کریں اور نہ ہم کبھی متقدمین کی کتابوں کے استناد اور اہمیت میں کوئی شک کرتے ہیں، کیونکہ یہی ہمارا سرمایہ ہے جس پر ہم جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔ اصول فقہ کا علم جتنا بھی پھیل جائے اور آئندہ تدوین وترتیب کے جن مراحل سے بھی گزرے، اس عظیم ذخیرے کے بغیر آگے چلنا مشکل ہوگا۔ ہماری مراد اس مقام پر صرف یہ ہے کہ ماضی قریب میں اور بعض معاصر اہلِ علم نے اصول فقہ پر ایسی کتابیں لکھی ہیں جو مطلوبہ غرض ومقصد تک پہنچنے میں معاون و مفید ثابت ہوسکتی ہیں۔ انہوں نے اولاً بصیرت کے ساتھ عصر حاضر کے تقاضوں کو سمجھا، قانونِ وضعی کے مزاج اور اس کی بنیادوں سے واقفیت حاصل کی اور اصولِ فقہ کے اس عظیم ذخیرے کو کھنگال کر اِن نظریات کے متبادل بلکہ ان سے بدرجہا بہتر نظریات کا استخراج کیا، اور جس طریقے پر قانونِ وضعی کی تعمیر ہوئی ہے اُسی طریقے پر اور ان ہی کے اسلوبِ بیان کے مطابق اصولِ فقہ مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ تدریسِ اصولِ فقہ کے دوران اگر انہی کتابوں سے استفادہ کیا جائے اور طلبہ کو یہ قیمتی اثاثہ جدید منہج کے مطابق پڑھایا جائے تو یہ اس علم کی افادیت میں اضافے اور اس علم کی تدریس کے لیے طے شدہ غرض وغایت تک رسائی میں مفید ومعاون ثابت ہوگا۔

وضعی قانون کے لیے بطورِ بنیاد ایک نسبتاً نیا علم (Jurisprudence) یعنی اصولِ قانون کے نام سے وضع کیا گیا ہے۔ اس علم میں بنیادی طور پر قانون کی حقیقت سے بحث کی جاتی ہے کہ ''قانون'' کیا چیز ہے؟ قانون کون بناتا ہے اور یہ کیسے بنتا ہے؟ قوانین کی مختلف اقسام، ان کی درجہ بندی اور پھر ہر ایک سے متعلق الگ الگ اصول وضع اور بیان کیے جاتے ہیں۔ اس کے بالمقابل اصولِ فقہ میں اسلامی قانون (فقہ اسلامی) کی حقیقت احسن اسلوب میں اور جامع تفصیلات کے ساتھ واضح کی گئی ہے، اور انہی تمام سوالات کے جوابات دیے گئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اسلامی احکام نہ تو سارے کے سارے لازمی اور جبری (Compulsory) ہیں اور نہ تمام کے تمام صوابدیدی اور اختیاری ہیں، بلکہ اولاً تمام

اعمال فرض، واجب، سنت اور مباح، اور حرام، مکروہ (تحریمی وتنزیہی) میں تقسیم کیے گئے ہیں، پھر ان میں سے لازمی احکام کو بھی انسانی احوال کے پیشِ نظر واجب عینی، واجب کفائی، واجب موسّع اور واجب مضیّق وغیرہ میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس پہلو کے اعتبار سے بھی احکام مختلف ہیں کہ معاشرے کے تمام افراد نہ تو ایک جیسے ہوتے ہیں اور نہ ہی فرد کی کیفیت ہمیشہ یکساں رہتی ہے۔ اس طرح جوانی و بڑھاپا، قوت وضعف، صحت و بیماری وغیرہ کے اعتبار سے احکام ''**المحکوم علیہ**'' کے باب میں جمع کیے گئے ہیں۔ اسی طرح فقہ اسلامی، یا اسلامی احکامات کی حقیقت (Nature) جاننے کے لیے یہ تمام تفصیلات اسلاف کی کتب سے لے کر ایک نئی ترتیب کے ساتھ ''**الحکم الشرعی**'' کے تحت جمع کی گئی ہیں۔

قانون سازی، قوانین کی درجہ بندی، عدالتی سطح پر قانون کی تعبیر وتشریح، اور ملک کے طول و عرض میں کام کرنے والی عدالتوں کے فیصلوں میں ترتیب وتسلسل کو قائم رکھنے کے مراحل وقت، مہارت، لیاقت اور ادارہ جاتی استحکام کے متقاضی ہیں۔ چنانچہ ان تمام امور کو بسہولت انجام دینے اور کسی ناہمواری سے بچنے کے لیے ماہرینِ قانون نے کچھ ''قانونی نظریات'' (Legal Theories) منضبط کیے ہیں۔ چنانچہ اب ''قانون'' کے اصول جاننے کے لیے ان قانونی نظریات سے مدد لی جاتی ہے اور قانون سے متعلق مذکورہ تفصیلات طلبہ کو سمجھانے اور پڑھانے کا عمل انہی قانونی نظریات کی تعلیم کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ فقہ اسلامی کے اس مفہوم کی متبادل اصطلاح ''فقہی مذہب'' ہے، جو فقہ اسلامی سے متعلق مذکورہ تمام تفصیلات طے کرنے کے لیے الگ اصول وقواعد کا نظام فراہم کرتا ہے۔ فقہی مذہب کیا اور اب تک کتنے اور کون سے فقہی مذاہب پائے جاتے ہیں؟ کیا ان متبوعہ مذاہب کے علاوہ کسی نئے مذہب کا بنانے کا اختیار اب کسی کے پاس ہے؟ اگر ہے تو درکار شرائط کیا ہیں؟ یہ موضوعات تو براہِ راست اصولِ فقہ کے طلبہ کو نہیں پڑھائے جاتے۔ لیکن ''اجتہاد''، جس کی بنیاد پر ایک مذہب وجود میں آتا ہے، اور ''تقلید''، جس کی بدولت ایک متبوع مذہب باقی رہتا ہے، ان دو بنیادی تصورات سے کافی تفصیل کے ساتھ بحث کی جاتی ہے۔ ان تمام تفصیلات کو متقدمین ہی کی کتابوں سے عصرِ حاضر

کے حل طلب مسائل کے اضافوں کے ساتھ جمع کر کے اصول فقہ میں ''**النظریات الاصولیة**'' کے عنوان کے تحت جمع کیا گیا ہے۔

قانون کی ماہیت یا حقیقت واضح کرنے کے بعد اصولِ قانون (Jurisprudence) کا دوسرا حصہ قانون کے مصادر (Sources of Law) سے بحث کرتا ہے۔ یعنی وہ کون سے منابع اور سرچشمے ہیں، جہاں سے قوانین پھوٹتے ہیں اور کوئی بھی قانون اپنی قانونی استناد کے لیے ان کی طرف لوٹتا ہے۔ اصولِ قانون کے اس حصے کے حوالہ سے بھی مسلم فقہا، اور اصولیین نے فقہ اسلامی کے مصادر و مآخذ سے متعلق مباحث علاحدہ سے جمع کر لیے اور ان کو **الادلة الشرعية** کا نام دیا گیا۔

البتہ یہاں اصولِ فقہ اسلامی اور اصولِ قانون (Jurisprudence) کے درمیان کچھ فرق ہے، جس کی وضاحت کے بعد طلبہ بآسانی قوانین اور مصادرِ قوانین کے بارے میں دین اسلام کی فوقیت کو سمجھ سکیں گے۔ وہ یہ کہ فقہ اسلامی کے مصادر (مثلاً قران، حدیث، اجماع، قیاس، مصالح مرسلہ، عرف، سد ذریعہ وغیرہ) کے بارے میں جتنی تفصیلات اور پھر ہر مصدر کی تحقیق کے بعد اس کی استنادی حیثیت اسی طرح اِن تمام مصادر کے درمیان مصدریت و ماخذیت کے بارے میں لطیف ترتیب وتوازن، الغرض یہ تمام تفصیلات جس قدر وسعت اور تحقیق کے ساتھ اصولِ فقہ میں بیان کیے گئے ہیں اصولِ قانون (Jurisprudence) کی دنیا اس سے کافی چھوٹی معلوم ہوتی ہے۔

قانون کے مصادر کے بعد علم قانون کے ان گنت مسائل و جزئیات کو منضبط کرنے کے لیے قانونی تصورات (Legal Concepts)، کو مثلاً ملکیت (Ownership)، حق (Right)، عدل (Justice) اور قانونی نظیر (Precedence) وغیرہ میں پرویا گیا ہے۔ اس کے بالمقابل جدید مسلم فقہانے فقہ اسلامی کی وسعت اور مباحث کی ضخامت کے پیشِ نظر فقہ اسلامی کی وسعتوں میں جا کر اِن مباحث کو **النظريات الفقهية** کے نام سے جمع کر کے تقریباً ایک نیا علم متعارف کروایا ہے۔ یہ علم گزشتہ دور میں اگرچہ رائج اصولِ فقہ کا حصہ نہیں تھا لیکن جس طرح اجتہادی بصیرت اور فقہی دقیقہ رسی کی صلاحیت کے حصول کے لیے فقہ کا علم پڑھایا جاتا ہے، یہی چیز اس نئے فن کا بھی وظیفہ ہے۔

اصولِ فقہ اسلامی کا تیسرا حصہ یعنی **تفسیر النصوص** ان ادلہ شرعیہ کی احکامِ شرعیہ پر دلالت کی کیفیت کے بارے میں ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اُن مصادر سے احکامِ شرعیہ کا استنباط واستخراج کیسے کیا جائے، یہ **تفسیر النصوص** کا وظیفہ ہے۔ اس نوعیت کے مباحث Law اور Jurisprudence کا براہِ راست حصہ نہیں ہیں، بلکہ (Statutes and Legal Ethics) کے عنوان کے تحت ایک الگ موضوع کے طور پر پڑھائے جاتے ہیں۔

اصولِ فقہ کا چوتھا حصہ **النظریات الاصولیہ** ہے جس میں دو قسم کے مباحث شامل ہیں۔ ایک یہ کہ نئے مسائل کے لیے شرعی احکام کو کیسے دریافت کیا جائے؟ کیا طریقہ کار اختیار کیا جائے؟ یہ مباحث **اجتہاد** و **تقلید** کے زیرِ عنوان جمع کیے گئے ہیں۔ دوسرے وہ مباحث ہیں جن کا تعلق مختلف قوانین کے آپس میں بظاہر تضاد اور تعارض سے ہے۔ یعنی ایسی صورت میں اسلام کی کیا ہدایات ہیں؟ مختلف مذاہب کے یہاں اس کی کیا تفصیلات اور کیا طریقہ کار ہے؟ یہ مباحث ''تعارض''، ''ترجیح'' اور ''نسخ''، وغیرہ کے عنوانات کے ذیل میں جمع کیے گئے ہیں۔

اس نوعیت کے مباحث قانون کی دنیا میں ''قوانین کا تعارض (Conflict of Laws)'' کے نام سے معروف ہیں اور یہ باقاعدہ (Jurisprudence) کا حصہ نہیں۔ قانون دان حضرات (Jurists) نے اس موضوع پر علیحدہ لکھا ہے۔ تاہم اصول فقہ کے **النظریات الاصولیہ** اور اس فن کے تقابل سے بآسانی یہ واضح ہوتا ہے کہ حجم، جامعیت، مباحث کی باریکیوں، معقولیت اور اطلاق وعمل سے قریب تر ہونے کے لحاظ سے بھی اصولِ فقہ اصولِ قانون (Jurisprudence) پر کسی قدر فوقیت رکھتا ہے۔

اصولِ قانون کے علم کی ترتیب کو دیکھ کر ماضی قریب میں مسلمان اہلِ علم نے اپنے اسلاف ہی کی اصول فقہ پر لکھی گئی کتابوں سے مواد کو جدید ترتیب اور انتظامی ساخت کے مطابق مرتب کیا ہے جن سے ان کا مقصود یہ تھا کہ ضروریات اور چیلنجز کو کم وقت میں آسانی کے ساتھ سمجھا جا سکے تا کہ اسلامی علوم میں ان کا متبادل تلاش کرنے میں سہولت ہو۔

بحث وتحقیق کے اسی منہج پر طلبہ کی تربیت کرنا ضروری ہے۔تا کہ وہ وضعی قانون اور اصول قانون کے ایک ایک حصے کو فقہ اسلامی اور اصول فقہ اسلامی کے متبادل کے ساتھ سمجھیں، اس طرح وہ وضعی قانون کی حقیقت سے آگاہ ہو کر اس کا تنقیدی تجزیہ کرنے کے قابل ہوں گے اور اسلامی فقہ واصول فقہ پر ہونے والے اعتراضات کا جواب دینے کے بھی قابل ہوں گے۔

II۔ مقاصد شریعت

اصولِ فقہ کا ایک اہم عنوان مقاصد شریعت ہے۔ یہ کوئی نیا علم نہیں بلکہ اصولِ فقہ کا وہ حصہ ہے جس پر ماضی بعید میں بھی اصولیین نے اپنی کتابوں میں بہت کچھ لکھا ہے۔ زیادہ تر متقدمین مصنفین مقاصد شریعت سے متعلق مباحث المصلحة کے باب میں ذکر کرتے ہیں۔ جدید دور میں انسانی فہم وفکر کے نکھار کے پیش نظر اس کو مستقل علم کی شکل دی گئی اور اصولِ فقہ کے عام مباحث سے علاحدہ اس پر مستقل کتابیں لکھی گئیں۔ اساتذہ کرام کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اس باب میں ضروری اور بنیادی معلومات اپنے طلبہ کو فراہم کریں۔ مقاصد شریعت کا تعارف اس کا پہلا مرحلہ ہے۔ اس تعارف کے دوران درج ذیل دو امور کو مدِ نظر رکھنا خصوصیت کے ساتھ افادیت کا حامل ہوگا۔

اولاً علم مقاصدِ شریعت کی ضرورت واہمیت پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جائے۔ مقاصد شریعت کی افادیت طلبہ کے سامنے رکھی جائے۔ اجتہادی صلاحیت میں مقاصد شریعت کا علم اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔ مقاصد شریعت کی بھرپور تفہیم کی صورت میں مختلف اقوال میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ نئے مسائل کے بارے میں تنظیم اور تحلیل کا ملکہ حاصل ہوتا ہے۔ الغرض مقاصدِ شریعت سے طلبہ واقف ہوں تو تشریع اور احکام دینے میں اسلام کے منشا اور مزاج سے انہیں آگاہی ہوتی ہے۔

اہمیت اور ضرورت بتانے کے بعد علم مقاصدِ شریعت پر اب تک ہونے والے علمی کام سے انہیں متعارف کروایا جائے۔ یعنی یہ علم جن تاریخی مراحل سے گزر کر آیا ہے، اس تاریخی تسلسل کے ساتھ اب

تک کچھ کام ہوا ہے؟ ان امور سے انہیں واقفیت ہو۔ مثلاً اس علم کی اٹھان کس طرح ہوئی؟ خیـــــر القــرون اوراس کے بعد والے ادوار میں متقدمین ائمہ فقہا شریعت کے احکام بتانے میں کس طرح مقاصد شریعت کوملحوظ رکھتے تھے؟ تاریخی تسلسل کے ساتھ اس علم کے حوالہ سے لکھی گئی کتابوں کے تعارف سے ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ ہر شخصیت کے علمی کام کی خصوصیات کا بھی اندازہ ہوجائے گا۔ مثلاً مقاصدِ شریعت سے متعلق جملہ مباحث اصولِ فقہ پر لکھی گئی متقدمین کی اکثر کتابوں میں المصلحة کے باب کے تحت پائے جاتے ہیں۔ لیکن امام شاطبی نے مقاصد شریعت کے مباحث کا ایک اور طرح سے ذکر کیا ہے، علامہ عز بن عبدالسلام کا طریقہ کار اس سے بھی مختلف ہے۔ ان مختلف مناہج کا تعارف ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بھی پتہ چلے گا کہ سابقہ منہج سے ہٹ کر ایک نئے منہج پر چلنے کے کیا اسباب تھے؟ تاریخی تسلسل کے ساتھ اس علم کے تعارف کا دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ مختلف مناہج ومدارک اور خصوصیات سامنے آنے کے بعد طلبہ کی سوچ اور غور وفکر کی صلاحیت مضبوط ہوگی۔ مثلا علامہ عز بن عبدالسلام نے کن اہداف کے حصول کے لیے ایک خاص منہج پر اس علم کو آگے بڑھایا اور کن ضروریات واسباب کے تحت علامہ نے ایک الگ منہج کا اختراع کیا۔ مختلف اہداف و اسباب کے پیش نظر اس علم کو آگے بڑھانے کے لیے مختلف مناہج کا مطالعہ سامنے آنے کے بعد طلبہ اس قابل ہوں گے کہ وہ بھی اپنے دور کے اہداف اور تقاضوں کے پیش نظر اس علم کو آگے بڑھائیں۔

مقاصد شریعت اور انسانی حقوق

علمی اور تہذیبی محاذ پر علماء کرام کو، جو امتِ مسلمہ کا قائدانہ طبقہ ہے، ایک اور چیلنج کا سامنا بھی ہو رہا ہے۔ جس سے نمٹنے کے لیے خود علماء کرام کو آگے بڑھ کر قیادت کرنی پڑے گی اور مستقبل کی تمام ذمہ داریاں اٹھانے والے طلبہ کو بھی ضروری علمی ہتھیاروں سے لیس کرنا ہوگا۔ وہ چیلنج یہ ہے کہ مغربی دنیا پیغمبر اسلام کی تعلیمات اور امتِ مسلمہ کے کارناموں سے آنکھ بند کر کے یہ دعویٰ کرتی ہے کہ انہوں نے ہی تمام دنیا کو انسانی حقوق کے تصور سے متعارف کرایا، اور مغرب ہی تمام امتیازات سے بالاتر ہو کر تمام انسانوں کا حقوق کا علمبردار ہے۔ چنانچہ اہلِ مغرب ہی تمام انسانوں کے انفرادی اور اجتماعی ہر

نوع کے حقوق کی وکالت کررہے ہیں۔ان کے اس دعویٰ میں کتنی حقیقت ہے؟ تاریخ سے انصاف ہو رہا ہے یا اسے اِس سلسلے میں درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جارہا؟ ایسے میں اسلام اور مسلمانوں کا کیا کردار رہا ہے؟ انسانی حقوق سے متعلق اسلام کا کیا موقف ہے؟ الغرض اس باب سے وابستہ کئی پہلو ہیں جن پر بحث وتحقیق کے لیے امت اسلامیہ علماء کرام کی منتظر ہے۔

اس باب میں طلبہ کو بقدرِ ضرورت تفصیل کے ساتھ انسانی حقوق کے متعلق مغربی تصور کی وضاحت کی جائے، پھر اس کے مضامین اور مندرجات بتائے جائیں۔اس کے علاوہ نظریات اور تحقیقات سے ہٹ کر انسانی حقوق کے بارے میں مغرب کا رویہ کیا ہے؟ وہ خود اپنے پیش کردہ نظریات پر کس حد تک دیانت کے ساتھ عمل کررہے ہیں؟ بلکہ یوں کہا جائے تو درست ہوگا کہ اس پر فریب دعوے کی آڑ میں ان کا اصل کردار اور روپ بہت منفی ہے۔اس بارے میں مآخذ ومصادر کی طرف طلبہ کی راہ نمائی ضروری ہے تا کہ طلبہ ذاتی طور پر اس سے استفادہ کرسکیں۔

مغربی تصور پر نقد وجرح کے ساتھ اسلام کے موقف کی وضاحت کی طرف متوجہ کیا جائے۔ اسلامی علوم میں سے متعلقہ مواد کا ایک بہترین مصدر ومآخذ مقاصدِ شریعت ہے۔احکامِ شریعت اور فقہی مباحث میں مقاصد اور مصالح کا تعین کیا جائے تا کہ طلبہ انہیں انسانی عقل اور طبیعت ومزاج کے قریب پا کر آسانی ذہن نشین کرسکیں۔اس کے ساتھ اساتذہ کرام طلبہ پر واضح کریں کہ انسانی حقوق سے متعلق اسلام کی تعلیمات کتنی وسیع ہیں اور شریعت کے احکامات یوں ہی نہیں دے دیے گئے بلکہ ایک ایک حکم کے اندر کتنی مصلحتیں پنہاں ہیں۔انسانوں کے تمام طبقات کا انفرادی اور اجتماعی پہلوؤں سے کس خوبی کے ساتھ دفاع کیا گیا ہے۔یہ اُس دور کی تعلیمات ہیں جس کے کئی صدیاں بیت جانے کے بعد مغربی دنیا انسانی حقوق کے تصور سے متعارف ہوئی۔

غرض یہ کہ انسانی حقوق کے باب میں چند چیزیں، خواہ اختصار کے ساتھ ہی ہوں، طلبہ کے سامنے واضح کرنی ہوں گی: ۱۔انسانی حقوق کی تعریف ۲۔اس تصور کی ضروری تفصیلات ۳۔پھر اس کا

تنقیدی جائزہ جس میں عملی دنیا میں مغرب کا اس تصور سے متضاد رویہ، نیز ان پہلوؤں کی نشان دہی جس سے واضح ہوتا ہے کہ مغربی دنیا کا دیا ہوا نظامِ حقوق ناقص اور ناکام ہے۔۴۔ مقاصدِ شریعت کی روشنی میں حقوق انسانی سے متعلق اسلامی تعلیمات۔۵۔اور پھر ان دونوں نظاموں کا تقابل۔

مقاصدِ شریعت کی وسعت اور انسانی زندگی میں اطلاق

یہاں ہم ماقبل میں مذکور ایک نکتہ کی مزید وضاحت اور تشریح کرتے ہوئے اس کی ضرورت اور افادیت کے پیش نظر اس کے کئی پہلوؤں پر متوجہ کریں گے۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ اساتذہ کرام طلبہ کی توجہ مقاصدِ شریعت اور مغربی دنیا کے دیے ہوئے انسانی حقوق کے تصور و نظام کے درمیان تقابلی مطالعہ اور تحقیق کی طرف مبذول کرائیں۔ اس ضمن میں انسانی حقوق کے وضعی نظام کی محدودیت، نقص اور جمود واضح کریں، اور اس کے بالمقابل مقاصدِ شریعت کی وسعت، کمال، اور تطبیق کی صلاحیت واضح کریں۔ چنانچہ مغرب میں اس تصور اور نظام کو وضع کرتے وقت جہاں مذہب سے لاتعلقی اور یکسر آزادی برتی گئی وہاں تھوڑے عرصے کے بعد کن تباہ کن برے نتائج کا سامنا کرنا پڑا۔[۳] مقاصد شریعت کی تعلیم دیتے وقت اساتذہ کرام شریعت کی آفاقی وسعت اور انسانی عقل و مزاجِ سے ہم آہنگی پر بھی خصوصیت کے ساتھ توجہ دیں۔

مقاصد شریعت کا اطلاق کیسے ہو؟ اس کے لیے کیا طریقے اپنائے جائیں؟ یہ پہلو بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ ایک طرف تو مقاصدِ شریعت کی وسعت ہے؟ اور دوسری طرف معاشرہ میں عمومی اخلاقیات کی تنزلی اور وقت کے تقاضوں کی پیچیدگی ہے، اس صورت میں طلبہ اساتذہ کرام کی رہنمائی کے نہایت محتاج ہوں گے۔ مقاصد شریعت کے کئی پہلو ہیں۔ مثلاً اخلاقیات کے حوالے سے جب عمومی اخلاقی اقدار (Norms) کی بات کی جائے تو دیکھا جائے کہ اسلام بلند اخلاق کے لیے کیا معیار دیتا ہے اور اس کی نظر میں اقدار کیا ہیں؟ ایک انسان کب اور کیسے اچھا انسان بن سکتا ہے؟ ایک خاندان کس طرح اچھا خاندان قرار دیا جاسکتا ہے؟ اور اسی طرح کونسا معاشرہ مثالی معاشرہ کہلائے

جانے کا مستحق ہے؟

یا دوسرا پہلو مثلاً اجتہاد کا فریضہ ہے کہ شریعت کا ہر حکم مصلحت پر مبنی ہے، خواہ اس تک انسانی عقل کی رسائی ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ اسی طرح جملہ منصوص احکام بھی علتوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ اب نئے مسئلے کے لیے منصوص جزئیات میں سے ایک نظیر تلاش کرنا کہ دونوں علت میں بھی مشترک ہوں اور اس سے کسی شرعی مقصد کا حصول بھی ہو رہا ہو۔ اجتہادی عمل میں مقاصدِ شریعت کے اعتبار سے کیا اصول ہیں، مقاصدِ شریعت کے تعین کے کیا قواعد ہیں، اس پہلو کو بھی طلبہ کے سامنے واضح کرنا استاد کی ذمہ داری ہے۔ الغرض مقاصدِ شریعت کے اطلاق کے مختلف پہلو ہیں۔ ہر ایک کی وضاحت، متعلقہ اصولوں کی تفہیم وتشریح اور مزید بحث وتحقیق کے لیے متعلقہ مصادر کی راہنمائی، مقاصد شریعت کی تدریس کے اہداف میں شامل ہونا ضروری ہے۔

مقاصد شریعت کی تدریس کا مؤثر طریقہ

وہ کون سے طریقے ہیں جنہیں مقاصدِ شریعت کی تدریس کے دوران اختیار کر کے مذکورہ اہداف واغراض سہولت کے ساتھ کم وقت میں حاصل ہوں۔ اس سلسلے میں کلیدی کردار استاد کے علمی تشخص، تدریس کے لیے تیاری، بصیرت اور تدریسی تجربے کا ہے۔ تاہم چند تجاویز ذیل میں بھی پیش کی جا رہی ہیں۔

مدارس کے اندر عموماً کسی بھی کتاب کی تدریس کے لیے محدود ایام مختص نہیں کیے جاتے بلکہ کتاب جب شروع کی جائے تو ہفتہ بھر اس کی تدریس جاری رہتی ہے۔ ''مقاصد شریعت'' کا مضمون اپنی جامعیت کے لحاظ سے بہت وسعت رکھتا ہے، اور اس حوالہ سے جامعیت کے ساتھ لوازمہ کی تیاری کی ضرورت ہے۔ اس دوران محاضرات کی مدد سے اس موضوع پر تدریس کا عمل آگے بڑھانا مفید ہوگا۔ محاضرات کی تیاری کے لیے استاد کے پاس وقت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اس لیے مقاصدِ شریعت کی تدریس کے لیے ہفتہ میں دو دن مختص کرنا زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔

محاضرات یا لیکچرز کے لیے استاد کوئی جامع خاکہ (Outline) بنائیں اور اپنا تدریسی عمل اس کے مطابق رکھیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس طرح کچھ ہی عرصے کے تجربے کے بعد کسی وفاق ہی کی نگرانی میں کوئی ایسی کتاب تیار ہو جائے جو تدریس کے حوالہ سے مقاصدِ شریعت کے مطلوبہ موضوعات پر محیط ہو اور نصاب میں شامل کی جائے۔

مقاصدِ شریعت کی تدریس کے لیے کون سا وقت موزوں ہے؟ ہماری ناقص رائے میں یہ آخری سال میں التوضیح و التلویح کے ساتھ ہو تو بہتر ہے۔ مقاصدِ شریعت کی تدریس اصول فقہ کے ایک ذیلی مضمون کے طور پر بھی ہوسکتی ہے۔ چنانچہ اصولِ فقہ کی کتاب کے ساتھ ساتھ مقاصدِ شریعت کی تدریس کے لیے ہر تیسرا دن مختص کر دیا جائے۔ اس طرح ایک ہفتے میں دو کلاسیں مقاصدِ شریعت ہی کے لیے مخصوص ہوں۔

استاد مقاصدِ شریعت کا تدریسی خاکہ کس طرح بنائیں، اور مختلف موضوعات کے لیے کن مصادر کی طرف مراجعت کریں، اس سلسلے میں چند معلومات اور تجاویز پیشِ خدمت ہیں۔

مقاصدِ شریعت کے مواد کو تین حصوں میں تقسیم کیا جائے:

۱۔ پہلے حصہ میں انسانی حقوق سے متعلق مغربی تصور کا تعارف اور اس کے لیے بنیادی امور، پھر اس کا مختلف پہلوؤں سے تنقیدی جائزہ۔ نیز انسانی حقوق کے بارے میں اسلامی تعلیمات کیا ہیں، مغربی اور اسلامی دونوں تصورات کا تقابلی مطالعہ۔ اور اس ضمن میں مقاصدِ شریعت کی اہمیت اور ضرورت وغیرہ زیرِ بحث لائے جائیں۔ اِن تمام امور پر اردو عربی اور انگریزی زبانوں میں مواد پایا جاتا ہے۔[۴]

مقاصدِ شریعت کے مباحث میں تدریجی اور تاریخی مراحل سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ اس ضمن میں خصوصیت کے ساتھ متقدمین ائمہ فقہ واجتہاد کی کاوشیں ضرور زیرِ بحث لانی چاہییں۔[۵]

۲۔ دوسرے حصے میں مقاصد شریعت کے گہرے فہم اور اس کے عملی اطلاق کے متعلق بتایا

جائے۔ مقاصدِ شریعت کا ایک حصہ تو فقہی احکام تک محدود ہے اوراس پر بڑا کام ہوا ہے۔ دوسرا حصہ فقہی احکام سے وسیع تر ایک عام مفہوم میں اسلامی تعلیمات کے اندر پوشیدہ حکمتیں ہیں۔ دونوں پہلو زیرِ بحث لانا ضروری ہے۔ دوسری نوع کے مقاصد پر بیشتر اہل علم نے لکھا ہے۔ خاص طور پر علامہ عز بن عبدالسلام کی کتاب **قواعد الاحکام فی مصالح الانام** اور معاصرین میں سے ڈاکٹر عبدالمجید النجار کی کتاب **مقاصد الشریعة بأبعاد جدیدة** وغیرہ۔ نیز ڈاکٹر محمود احمد غازی کے محاضرات بھی ''اسلامی شریعت: مقاصد وحکمت'' کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔

اس مرحلے میں استاد اگر چاہے تو **قواعد الاحکام** یا **الموافقات** کا یا علامہ محمد طاہر بن عاشور کی کتاب کا کچھ حصہ تدریس کے لیے متعین کر سکتا ہے۔

فقہی احکام سے متعلق مقاصد کی تدریس کا مؤثر طریقہ یہ ہوگا کہ فقہی ابواب کے طور پر مقاصد کی تعلیم دی جائے۔ مثلاً مالیات کے نظام سے متعلق اسلام نے جو احکام دیے ہیں ان کی حکمتیں کیا ہیں؟ نکاح و طلاق کے اسلامی نظام کے اسرار کیا ہیں؟ وغیرہ۔ ہماری ناقص رائے کے مطابق اس طرح طلبہ بصیرت کے ساتھ احکام اور ان کے مقاصد کو سمجھیں گے اور یہ فقہی مزاج و ذوق میں اضافے کا باعث ہوگا۔[۶]

۳۔ تیسرا اہم پہلو مقاصد شریعت کی تطبیق کا ہے۔ موجود اور معلوم احکامِ اسلام میں مقاصدِ شرعیہ کے فہم کا مسئلہ یقیناً اہم کام ہے، لیکن اس سے زیادہ اہمیت اس کی ہے کہ نئے پیش آمدہ مسائل میں حکم شرعی کی تلاش میں ان مقاصد اور حکمتوں سے استفادے کے طریقے اور اصول بتائے جائیں۔ اس پہلو کو مقاصدِ شریعت کی تطبیق کے لیے بطورِ تمہید اور بنیاد لایا جائے۔ کیونکہ تطبیق سے پہلے تو اِن اصولوں کا جاننا ضروری ہے۔ جن کی مدد سے احکام دینے میں شارع کا منشا اور اسلام کی نظر میں مطلوب حکمت و ہدف کا علم حاصل ہوتا ہے۔ اِن اصولوں اور قواعد پر بھی قدیم و جدید کئی حضرات نے لکھا ہے۔ علامہ شاطبی نے بھی **الموافقات** میں اس پر بحث کی ہے۔ علامہ طاہر بن عاشور نے بھی گفتگو کی ہے

اور مستقل اِسی موضوع پر تحقیقی مقالے بھی لکھے گئے ہیں۔ ۷

فقہی احکام کے علاوہ انسانی زندگی کے اور بھی کئی معاملات ہیں جہاں پس منظر میں مقاصد شریعت کی تعلیمات موجود ہیں۔ جس اہمیت کے ساتھ فقہی احکام سے متعلق مقاصدِ شریعت کے فہم اور اس کی تطبیق کے مباحث زیرِ غور لانا ضروری ہے، اسی اہمیت کے ساتھ دعوت وارشاد، اصلاحِ معاشرہ، تربیت وتزکیہ وغیرہ دیگر اہم امور سے متعلق بھی مقاصدِ شریعت کا فہم وتطبیق اور اس کا اطلاق ضروری ہے۔ فقہی احکام کی طرح اِن امور میں بھی مقاصدِ شریعت سے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے اور کی جانی چاہیے۔ طلبہ میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے اور اس رخ پر ہونے والے کام میں حصہ لینے کے لیے انہیں متوجہ کیا جائے۔ انہیں انسانیت کو درپیش چند ایسے مسائل کی اہمیت بتائی جائے جن کے حل میں علماء کرام کو حصہ لینا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں ماضی میں بھی فکری اور عملی کوششیں کی گئی ہیں ان کو سامنے رکھنا اور پھر ان سے راہنمائی حاصل کرنا ضروری ہے۔ ۸

III۔ اجتہاد

اجتہاد اصولِ فقہ کے مباحث کا وہ اہم ترین حصہ ہے جس کے حصول کے لیے ہی دراصل اصولِ فقہ کا علم پڑھایا جاتا ہے۔ یہ علم تدریس کے دوران نصوص کا ایسا فہم دیتا ہے جس کے بعد طلبہ خود بھی متعلقہ قواعد اور اصولوں کی پابندی کے ساتھ نصوص سے جدید مسائل کا حل تلاش کرنے پر قادر ہوسکتے ہیں اور اسی کا نام اجتہاد ہے۔ اصولِ فقہ کا علم اس اجتہادی عمل کے لیے راہ ہموار کرنے کا کام دیتا ہے۔ اجتہاد کے اصول وقواعد کی تعلیم کے ساتھ ساتھ نفسِ اجتہاد کے متعلق بھی کچھ امور کی طرف طلبہ کی راہنمائی ضروری ہے۔ اصول فقہ کے ساتھ اجتہاد کے مباحث بھی قدیم دور سے زیر تدریس آرہے ہیں۔ اجتہاد کے تصور کے ساتھ ملحق تقلید کے مباحث بھی اصولیین کے میدانِ فکر کا حصہ رہے ہیں۔ اصولِ فقہ پر لکھی گئی تقریباً تمام کتابوں میں اجتہاد وتقلید پر گفتگو کی گئی ہے۔ اور اس کے علاوہ بھی مستقل کتابیں لکھی جاتی رہی ہیں۔

چونکہ ہماری گفتگو اس مقام پر دینی مدارس کے اساتذہ کرام سے ہو رہی ہے، اس لیے ہم تقلید کے مباحث چھوڑ کر اجتہاد کے تصور سے متعلق مباحث پر زور دیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تدریس کا مقصد تفقہ اور پھر استخراج مسائل کی استعداد کا حصول ہے۔ ہر استاد چاہتا ہے کہ اس کا طالب علم کتاب وسنت کا فہم حاصل کرے اور فقہا کے اجتہادات اور کوششوں کی روشنی میں نئے پیش آمدہ مسائل کا حل تلاش کرنے پر قادر ہو۔ استاد اپنے طلبہ کو استخراج اور نئے مسائل کے حل کی تلاش میں کن اصولوں اور قواعد کا التزام جتائے اور اجتہادی عمل کے لیے کون سے حدود متعین کرے، اس کے متعلق چند امور کی طرف توجہ مبذول کرانا مقصود ہے۔

اجتہاد کی ضرورت اور دائرہ کار

اولاً اجتہاد کی ضرورت اور اہمیت واضح کی جائے کہ شریعت کی ابدیت اور احکامِ اسلام کی ہر دور اور ہر معاشرے میں تطبیق کی صلاحیت ثابت کرنے کے لیے ہمارے پاس صرف اجتہاد کا راستہ ہے۔ اس پہلو سے بھی غور کیجیے کہ جہاں علماء کرام کی ذمہ داری ہے کہ وہ امت کو انسانی زندگی کے تمام شعبہ جات میں ان احکامِ اسلام کی طرف راہنمائی فراہم کریں جو واضح اور بیّن ہیں۔ وہاں ان کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ جدید دور کے نئے شعبوں اور ایسے پیش آمدہ نئے مسائل ومشکلات میں بھی رہنمائی دیں جہاں بظاہر نصوص اور فقہ کے ذخیرہ میں ان کا کوئی واضح حل ہمیں نہیں ملتا۔ اس صورت میں ان کے پاس واحد راستہ اجتہاد ہی کا ہے۔

کچھ ایسے جدید مسائل طلبہ کے سامنے رکھ دیے جائیں جن کا کوئی حل بظاہر نصوص میں بھی نہ ہو اور قدیم فقہا کے دور میں موجود نہ ہونے کے باعث ان کے ہاں زیرِ غور بھی نہ ہو اور مسائل کی نوعیت بھی اس طرح ہو کہ امت علماء کرام کی طرف سے ان کے حل پیش کرنے کے لیے انتظار کر رہی ہو تو ایسے مسائل کی اہمیت جتا کر اجتہاد کی ضرورت اور اہمیت طلبہ پر واضح کی جا سکتی ہے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ طلبہ کو اجتہادی عمل کے دائرہ کار اور اس کے حدود وقیود سے آگاہ کیا جائے۔

بعض ایسے مسائل ہیں جن میں اجتہاد کی ضرورت واضح ہے مگر کچھ مسائل ایسے بھی ہیں جہاں اجتہاد کی نہ ضرورت ہے اور نہ اجازت۔ مثلاً منصوص مسائل میں اجتہاد کی قطعاً گنجائش نہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور پہلو کہ آج مسلمانوں کو اجتہاد کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کس نوع کے اجتہاد کی؟ کیا ''ابداعی اجتہاد''، کہ تمام ائمہ فقہ اجتہاد کی کاوشوں کو بیک جنبشِ قلم نظرانداز کر کے نئے سرے سے تمام مسائل کے متعلق اجتہاد کا عمل شروع ہو، یا ''ترجیحی'' یا ''انتقائی'' اجتہاد کہ مختلف اقوال فقہیہ میں قواعد کی پابندی کے ساتھ کسی قول کو ترجیح دینا۔ اسی طرح یہ پہلو کہ اجتہاد ایک معمولی عمل نہیں کہ ہر کس و ناکس اس میں حصہ لے سکے۔ اس کے لیے بھی کچھ شرائط ہیں اور کچھ قیود ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اجتہاد کا عمل ایک پرآشوب اور پرخطر عمل ہے۔ مجتہد کے معمولی غفلت برتنے پر عملی زندگی میں، معاشرے میں ہولناک نتائج بھی سامنے آسکتے ہیں۔ اِن خطرات اور ان نازک ذمہ داریوں کا احساس طلبہ میں پیدا کرنا تدریسی ذمہ داری ہے۔

اجتہاد کے مباحث میں کئی پہلو ہیں جن کے متعلق ٹھوس اور مبنی بر علمیت معلومات طلبہ کے لیے فراہم کرنا ہوں گی۔ ہماری نظر میں اجتہاد سے متعلق اس بات پر زیادہ زور دینا چاہیے کہ اجتہاد کا دائرہ صرف فقہی احکام یا عادات سے متعلق مسائل نہیں بلکہ سیاسی، سماجی، اقتصادی، فکری، قانونی اور دستوری غرض ہر سطح پر اجتہادی صلاحیت کی ضرورت ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ وطنِ عزیز پاکستان بننے کے بعد جب دستور کا مسئلہ زیرِ بحث آیا تو سیکولر حلقوں کی طرف سے اعتراض کیا گیا کہ کس کا اسلام نافذ ہو؟ شیعہ یا سنی اسلام، دیوبندی، بریلوی یا اہل حدیث کا اسلام؟ تو اِن سب مسالک کے علماء نے متفقہ طور پر ۲۲ نکاتی ایجنڈا مرتب کیا اور یہ اشکال رفع کیا۔ یہ یقیناً اُن علماء کی اجتہادی صلاحیت و بصیرت کا مظہر تھا۔ اس طرح آج بھی فقہی میدان کے علاوہ دیگر فکری اور سیاسی مسائل ہیں جن پر اظہارِ خیال کے لیے اور ایک صحت مند حل پیش کرنے کے لیے طلبہ میں اجتہادی صلاحیت کا ہونا ضروری ہے۔

اجتہاد کے متعلق بہت سے لوگوں نے لکھا ہے۔ متقدمین نے بھی اور معاصر اہل علم نے بھی۔

اساتذہ کرام کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اجتہاد کے متعلق مثبت اور ٹھوس تحریروں کی طرف طلبہ کی راہنمائی کریں تاکہ وہ مدرسے کا تعلیمی دورانیہ ختم ہونے کے بعد بھی ان سے استفادہ کر سکیں اور ان کی علمی وفکری تعمیر میں کوئی کسر نہ رہے۔

اجتہاد کی مختلف سطحیں

اجتہاد پر گفتگو کرتے ہوئے متقدمین ائمہ فقہ واجتہاد کی کاوشوں پر روشنی ڈالنا بھی ضروری ہے تاکہ ایک تو طلبہ کا اپنے اس علمی ورثے کے ساتھ اعتماد اور اطمینان کا رشتہ قائم ہو اور دوسرا یہ کہ اگر طلبہ کے سامنے اجتہاد کی تاریخ ہو اور تفصیل کے ساتھ ان کو دکھایا جائے کہ مختلف حالات اور ضروریات کے مطابق اسلاف مختلف سطحوں کی کاوشیں کرتے رہے ہیں تو اس سے طلبہ اپنے حالات اور ضروریات کے مطابق اجتہادی ذمہ داری سمجھنے میں استفادہ اور راہنمائی لیں گے۔[۹]

اجتہاد، تجدید اور تجدد

''اجتہاد'' اور ''تجدید'' دونوں بہت اہم اصطلاحات ہیں۔ بلاشبہ اجتہاد ایک مستحسن اور مطلوب امر ہے۔ اس طرح تجدید کے متعلق تو رسالت مآب ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ہر سو سال بعد اللہ تبارک وتعالیٰ اِس دین کی تجدید کے لیے کوئی نہ کوئی شخص پیدا فرماتے رہیں گے۔ تاہم یہ دونوں کام بہت نازک اور پُرخطر میدان ہیں۔ اگر ان کے حدود اور قواعد سے معمولی بے پروائی بھی ہو تو یہ تخریبِ دین متصور ہوں گے۔ آج جہاں اجتہاد کے دائرے میں بہت سے واضح اور قطعی مسائل کو داخل کر کے انہیں اپنے بے لگام اجتہادات کا تختۂ مشق بنانے والوں کی کمی نہیں وہاں تجدید دین کے نام پر شعائر کی حیثیت رکھنے والے احکام سے لاپروائی کرنے والے بھی کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ اب صورتِ حال یہ بن گئی ہے کہ ایک طرف تو جدت پسندی، تجدید دین کے نام پر بے بنیاد نظریے اور دوسری طرف اس دور کے پیچیدہ اور حل طلب مسائل کے چیلنجز۔ تجدد یا جدّت پسندی سے بچتے ہوئے اور صحیح اجتہادی عمل کے قواعد اور اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے پیچیدہ اور حل طلبہ مسائل کا جواب دینا علماء

کرام کی ذمہ داری ہے۔اس کے ساتھ ساتھ مستقبل میں اس عظیم کام کا بیڑا اٹھانے کے لیے طلبہ کی بھرپور تربیت بھی اس میں شامل ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں طلبہ کو اجتہاد کی نزاکت اور اس کے خطرات سے آگاہ کیا جائے اور اس کے اصول وقواعد سے لاپروائی کے نتیجے میں پیش آنے والے منفی نتائج سے آگاہ کرکے اِن اصولوں کی اہمیت بتائی جائے۔

جس تجدید کا حدیث میں ذکر آیا ہے۔اس پر بھی اہلِ علم نے تفصیل سے لکھا ہے کہ تجدید دین کا مفہوم کیا ہے۔اس تجدید کے آداب واصول اور اس کے طریقے کیا ہیں؟ وغیرہ، اِن سب تفصیلات کو سامنے لایا جائے۔اس کے علاوہ جدت پسندی کے جذبے کے تحت تجدید دین کے نام پر جو آوازیں اٹھ رہی ہیں،اور جو نئے نئے نظریات اور تصورات اختراع کیے جارہے ہیں طلبہ کو ان سے بچنے کی تلقین اور عام مسلمانوں کو بچانے کی ذمہ داری کا احساس دلایا جائے۔ نیز انہیں اس بارے میں ہر قسم کے علمی وفکری ہتھیار فراہم کیے جائیں۔

......حواشی......

۱۔ اِن موضوعات پر اساتذہ کرام کی تیاری کے لیے بھی مواد کی کمی نہیں۔مختلف عمدہ اور اچھی کتابیں لکھی گئی ہیں۔مثلاً **تدوین اصولِ فقہ**، ازمولانا مناظر احسن گیلانی،**المناهج الا صوليه**، ازڈاکٹرفتحی الدرینی، **التجديد و المجددون في اصول الفقه**، ازابوالفضل عبدالسلام بن عبدالکریم۔مؤخرالذکر کتاب میں فاضل مؤلف نے متقدمین اصولیین کے کام کو لیا ہے اور یہ تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہر اصولی امام نے سابقہ کام کے ساتھ کن چیزوں میں فرق کیا ہے اور کن ضرورتوں کی بنیاد پر نئی شکل میں اصول فقہ کی ترتیب وتدوین کی ہے۔اسی حوالہ سے **نحو منهج جديد لدراسة علم اصول الفقه**،ازڈاکٹرمحمد الدسوقی ،**معالم الفكر الا صولي قبل الامام الشافعي**،ازڈاکٹر بشریٰ الشقوری بھی قابلِ ذکر ہیں۔

۲۔ اس پر اساتذہ کرام تاریخ تدوین اصولِ فقہ پر لکھی گئی کتب سے بھی استفادہ کرسکتے ہیں۔ایک اچھی کتاب معروف فلسطینی عالم ڈاکٹر فتحی الدرینی کی ہے جس کا نام **المناهج الاصولية** ہے جو حال ہی میں پانچ سو سے زائد صفحات پر بیروت سے شائع ہوئی ہے۔ایک دوسری کتاب ڈاکٹر احمد بلتاجی کی ہے جو دو جلدوں میں ہے۔اور اس کا نام ہے

مناهج التشریع الاسلامی فی القرن الثانی لهجری۔اس کتاب میں مولف نے امام شافعی اورامام شافعی سے قبل متعدد فقہا کے اصولِ اجتہاد کا ذکر کیا ہے۔اس میں امام احمد کا ذکر نہیں آیا۔تاہم امام احمد کے اصول اجتہاد کے لیے شیخ بکر بن عبداللہ کی کتاب **اصول مذہب الامام احمد** مفید ہے۔اس کے علاوہ امام احمد کے اصولِ اجتہاد پر اسی نام سے شیخ عبداللہ بن عبدالمحسن الترکی کی کتاب بھی ہے۔

۳۔ سچ تو یہ ہے کہ وہاں انسان اپنے حقوق کیا اپنی انسانیت کھوکر حیوانیت کی گھاٹی میں گرنے لگا اوراس کے بالمقابل آدم وحوا کی وہ اولاد جو اسلامی تعلیمات اور شریعت کے بتائے ہوئے نظامِ حقوق سے وابستہ رہی وہ اپنی عزت وآبرو، جان و مال اور خاندان کی حفاظت کے علاوہ رفعتوں وعظمتوں کی کن بلندیوں تک جا پہنچی۔اس کی ایک آسان مثال عورت کے حقوق کے مغربی تصور کی پیروی نے اُسے کس حد تک بے توقیر کر دیا اور ذلت و بے بسی کی تصویر بنا دیا، جبکہ وہ اسلام پر یہ الزامات لگا رہے تھے کہ اسلام میں عورت کے کوئی حقوق نہیں، اس سے تمام اختیارات سلب کر کے مرد کے ہاتھوں میں محکوم وغلام بنا کر رکھ دی گئی ہے، اور دنیا سے بے خبر کر کے اسے گھر کی چار دیواری میں قید کر کے رکھا گیا ہے۔ حالانکہ حقیقتِ حال دیکھی جائے تو اس بارے میں اسلامی تعلیمات کے بہترین نتائج اور اثرات کی تاریخ بھی روشن ہے۔اور مغربی نظامِ حقوق کیا ثمرات لے کر آیا وہ بھی دنیا دیکھ رہی ہے۔

۴۔ انگریزی میں جمشید احمد حمید کی کتاب Human rights in Islam and contemporary International Law جو الشریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد نے شائع کی ہے۔عربی میں ڈاکٹر احمد الریسونی، ڈاکٹر محمد الزحیلی اور ڈاکٹر محمد عثمان شبیر حضرات کی مشترکہ کتاب **حقوق الانسان محور مقاصدِ الشریعة** اور **مقاصدِ الشریعة و أثرها فی رعایة حقوق الإنسان**، نیز اسلام میں انسانی حقوق کے لیے **موسوعة حقوق الانسان في الإسلام**، تالیف خدیجہ النبر اوی عمدہ کتابیں ہیں۔

۵۔ مثلاً علامہ شاطبی کی کاوشیں، نیز بعد کے ادوار میں علامہ ابن تیمیہ، علامہ محمد طاہر بن عاشور، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی وغیرہ کی کتابیں۔اس سلسلہ میں تیاری کے لیے مواد کی دستیابی کوئی مسئلہ نہیں۔اس قسم کے کتابوں کا ایک بڑا حصہ پی ڈی ایف فائلز کی صورت میں انٹرنیٹ پر بھی موجود ہے۔مثلاً ڈاکٹر احمد الریسونی کی کتاب علامہ شاطبی پر اور مصر سے شائع ہونے والے معروف عربی مجلّہ **المسلم المعاصر** کا مقاصدِ شریعت سے متعلق خاص شمارہ نمبر ۱۰۳ اور دیگر بہت سی کتابیں یہاں مل جاتی ہیں۔

۶۔ اس پہلو پر بھی مختلف اہل علم نے لکھا ہے۔مثلاً علامہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی **مقاصد الشریعة المتعلقة بالمال** اور مجمع الفقہ الاسلامی مکہ مکرمۃ کی اکیسویں فقہی کانفرنس میں ڈاکٹر حسن سید حامد خطاب کا پیش کردہ مقالہ بعنوان **مقاصد النکاح و آثارها، دراسة فقهية مقارنة**، اور **المقاصد فی المناسک** از ڈاکٹر عبدالوہاب

ابوسلیمان، **مقاصد الشریعة الاسلامة فی الشهادات** از برکات احمد بن ملحم، **المقاصد الشرعیة للعقوبات فی الاسلام** از ڈاکٹر محمد سید طنطاوی، **الحج و اَسرارہ** از علامہ حکیم ترمذی وغیرہ۔ اسی طرح تقریباً تمام فقہی ابواب کی ترتیب پر مقاصد شرعیہ کا محققانہ مطالعہ مختلف اہلِ علم نے کیا ہے۔

۷۔ جیسے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی ملیشیا کے ایک طالب علم نعمان جغیم کا مقالہ بعنوان **طرق الکشف عن مقاصد الشارع**۔ ڈاکٹر جمال الدین عطیۃ کی کتاب **نحو تفعیل مقاصد الشریعة**، اور **الا جتهاد المقاصدی** از نور الدین الخادمی (دو جلدیں) وغیرہ۔

۸۔ مقاصد شریعت کے اس پہلو پر ہماری ناقص رائے میں ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی نے اپنی کتاب **مقاصدِ شریعت** میں بہتر طور پر لکھا ہے۔

۹۔ متقدمین ائمہ فقہ واجتہاد کی کاوشوں اور اجتہادی عمل کے دوران اپنائے گئے اصولوں پر مختلف کتابیں لکھی گئی ہیں، مثلاً **مناهج التشریع فی القرن الثانی لهجری** ڈاکٹر احمد بلتاجی کی دو جلدوں میں۔ اس کے علاوہ ائمہ اربعہ، علامہ ابن تیمیہ، حافظ ابن حزم ظاہری وغیرہم حضرات پر شیخ ابوزھرہ کی قابلِ قدر کتابیں۔ نیز **تاریخ المذاهب الاسلامیه** بھی ایک اچھی کتاب ہے۔ موصوف نے ہر شخصیت کی سوانحِ حیات کے بیان کے ساتھ اس کے اصولِ اجتہاد کو بھی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

عربی زبان کی تدریس

مولانا ڈاکٹر محمد کاشف شیخ

عربی زبان کی تدریس-اہمیت وضرورت

عربی زبان زیادہ بولی اور پڑھی جانے والی بین الاقوامی زبانوں میں سے ایک ہے اور اسے اقوامِ متحدہ کی چھے سرکاری زبانوں میں شامل کیا گیا ہے۔ یہ سرزمینِ حجاز، جزیرہ نمائے عرب، بلادِ شام اور شمالی افریقہ میں بولی جانے والی سب سے بڑی زبان ہے۔عربی زبان کے الفاظ کی بناوٹ اور تراکیب کی خوبصورتی کے ساتھ اس زبان کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ معجزانہ طور پر اس زبان کا ادب اور اس کے قواعد صدیوں سے محفوظ ہیں۔ اِس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ زبان اسلام، مسلمانوں اور شریعتِ اسلامیہ کے مصادر قرآن پاک اور سنت رسول اکرم ﷺ کی زبان ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

> وَإِنَّهُ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ. نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْأَمِيْنُ. عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْـمُنذِرِينَ. بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ. وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ.

> اور بلاشبہ یہ کلام رب العالمین کا نازل کردہ ہے، اسے امانت دار روح لے کر اتری ہے، آپ ﷺ کے قلب اطہر پر تا کہ آپ خبردار کرنے والوں میں سے ہوں، یہ صاف صاف عربی زبان میں ہے اور اس کی خبر پہلے پیغمبروں کی کتابوں میں (لکھی ہوئی) ہے۔(الشعراء:۱۹۲-۱۹۵)

ان آیات سے اور ایسی ہی متعدد آیات سے عربی زبان کی اہمیت وفضیلت واضح ہوتی ہے اور عربی زبان کی تعلیم وتدریس کی ضرورت بھی اجاگر ہوتی ہے۔اسی طرح ایک روایت میں بطور خاص نبی

کریم ﷺ نے عربی زبان سے محبت کی ترغیب دی۔ نبی کریم ﷺ کا مبارک فرمان ہے:

أحبوا العرب لثلاث: لأني عربي، والقرآن عربي، وكلام أهل الجنة عربي.

اہل عرب سے تین اسباب سے محبت کرو کہ میں عرب ہوں، قرآنِ حکیم عربی میں ہے اور اہل جنت کی زبان عربی ہوگی۔[1]

یہی وہ تین بنیادیں ہیں جن کے سبب مسلمان فطری طور پر عربی زبان سے محبت کرتے ہیں اور اس زبان کو سیکھنا دین اور دنیا دونوں کے اعتبار سے اپنے لیے سعادت تصور کرتے ہیں۔ دنیا بھر کے مسلمانوں میں اس زبان کو سیکھنے اور سکھانے کا غیر معمولی اہتمام کیا جاتا ہے۔ ابتدائی قاعدے سے لے کر جامعاتی سطح تک اس زبان کی تدریس دنیا کے بیشتر ممالک میں ذوق وشوق سے جاری ہے۔ عربی ثقافت اور علمی ذخیرے کے فروغ کے لیے بھی اس زبان کی تعلیم وتدریس کا سلسلہ خاصا وسیع ہے۔ اس کے علاوہ مختلف طرح کے رائج علوم کی اشاعت کے سلسلے میں بھی عربی بطور ذریعہ استعمال کی جارہی ہے۔ اس لحاظ سے علمی دنیا کا شاید ہی کوئی شعبہ ایسا ہو جس کا مطالعاتی لوازمہ یا مواد عربی زبان میں موجود نہ ہو۔ ان تمام پہلوؤں کو مدّنظر رکھتے ہوئے یہ کہنا بجا ہے کہ عربی زبان اس وقت اپنی وسعت، اہمیت، افادیت اور ہمہ جہت ضرورت کے اعتبار سے دنیا کی نمایاں زبانوں میں سے ایک ہے۔

پاکستان میں جامعات کی سطح پر بھی عربی زبان کی تدریس کا سلسلہ فروغ پذیر ہے تاہم مدارسِ دینیہ کی شکل میں پاکستان میں حصولِ علم کا ایک روایتی دائرہ بھی ہے جہاں عربی زبان کی تعلیم وتدریس کا اہتمام معمول سے بڑھ کر کیا جاتا ہے۔ ان اداروں میں متعدد علوم کی تدریس میں عربی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور کئی علوم کی تدریس کے لیے عربی کتب بطور بنیادی درسی مواد رائج ہیں۔ دینی تعلیم کے لیے اپنے تخصص کی بنیاد پر دینی مدارس میں صبح وشام عربی کتب کی مدد سے دینی علوم ومعارف کی تحصیل وتدریس کا سلسلہ جاری وساری رہتا ہے۔ اس تحریر کا مقصد دینی تعلیم کے اداروں میں عربی زبان و ادب کی تعلیم وتدریس کے حوالے سے بعض اہم پہلوؤں کو اجاگر کرنا اور اس سلسلے میں مزید بہتری کے لیے بعض نکات اور تدابیر زیر بحث لانا ہے۔

عربی زبان وادب کے مقاصدِ تدریس

عربی زبان وادب کی تعلیم وتدریس میں ابتدائی سطح پر سب سے اہم نکتہ ہدف کا درست تعین کرنا ہے۔بغیر ہدف کے کسی بھی بامقصد سرگرمی کا تصور نہیں کیا جاسکتا چہ جائیکہ تدریس کے اہم پیغمبرانہ شعبے میں ایسا تصور کیا جائے۔عربی زبان کی تعلیم وتدریس کا سب سے اعلیٰ وارفع مقصد اور ہدف دینی علوم کے طلبہ کے لیے قرآن وحدیث اور علومِ اسلامیہ کے بنیادی مصادر کا فہم حاصل کرنا ہے۔اس مقصد کے تحت عربی زبان وادب کے مطالعے کو فروغ دینا اور عربی زبان کی تدریس کے لیے تدریسی طریقوں کی آگاہی اور انہیں مؤثر طور پر استعمال کرنے کی تدابیر اختیار کرنا ہے۔دینی تعلیم کے حصول کے تناظر میں ان اہداف کو لازمی طور پر مدّنظر رکھنا چاہیے۔

ان عمومی اور ہمہ وقتی مقاصد کے علاوہ وہ خصوصی اہداف ومقاصد جو عربی زبان وادب کے اساتذہ کے سامنے ہر وقت رہنے چاہییں تاکہ وہ اپنی جملہ تدریسی سرگرمیوں کو اس کے مطابق ڈھال سکیں، درج ذیل ہیں:

- فہم المسموع (Listening comprehension) کی استعداد کو فروغ دینا
- فہم المقروء (Reading comprehension) کی مہارت فروغ دینا
- التعبیر الکتابی(Written Expression) تحریر وانشاء کی مدد سے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے عربی زبان کو ذریعہ بنانا
- التعبیر الشفوی(Verbal Expression)عربی زبان کے درست تلفظ کے ساتھ اور درست لہجے میں ادائیگی کی استعداد پیدا کرنا اور عربی زبان میں روزمرہ بول چال کے علاوہ دینی وتربیتی موضوعات پر اظہار خیال کی صلاحیت پروان چڑھانا
- عربی زبان کے قواعد وترجمہ کی آگاہی (Grammar and Translation Comprehension)اور ان کی مدد سے مصادر کی تفہیم اور عام بول چال میں استفادے کی استعداد پیدا کرنا

مدارس میں ان تمام پہلوؤں پر پہلے سے توجہ دی جاتی ہے، تاہم وقت کے ساتھ ساتھ انسانی تجربات اور ایجادات نے جو نئے وسائل اور انداز تشکیل دیے ہیں، ان کے استعمال کی جانب توجہ معمول سے زیادہ اہتمام چاہتی ہے۔ ذیل میں عربی زبان سے متعلق ان مہارتوں اور درکار طرزِ تدریس کو مختصراً بیان کیا گیا ہے:

فہم المسموع (Listening Comprehension)

فہم المسموع (Listening comprehension) یعنی سن کر سمجھنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک طلبہ میں عربی زبان کے کلمات کی درست ادائیگی وتلفظ کی صلاحیت، قواعد عربی سے آگاہی اور ادبی ذوق نہ ہو۔ عربی زبان وادب کے مدرّس کا فرض ہے کہ طلبہ میں یہ صلاحیتیں بتدریج پروان چڑھائے جس کے لیے سب سے پہلے خود مدرّس میں بھی ان امور کا ذوق پایا جانا ضروری ہے۔ اس لیے تعلیمی اداروں میں ان صلاحیتوں کے حامل مدرّسین کے تقرر و تیاری کو خصوصی توجہ دی جانی چاہیے۔ روایتی طور پر استاد کا متن کا مطالعہ اور اس کی گفتگو طلبہ یا طالبات کی صلاحیت میں افزائش کا بنیادی ذریعہ ہوتی ہے۔ لہٰذا اساتذہ کی زبان کی صحت از حد ضروری ہے۔ فہم المسموع کے مزید مواقع فراہم کرنے کے لیے بہتر ہے کہ ادارے میں لینگوئج لیب قائم کی جائے۔ عدم دستیابی کی صورت میں جزوی طور پر کمپیوٹرز سے بھی کام چلایا جاسکتا ہے لیکن اہم یہ ہے کہ طلبہ کو اجتماعی طور پر اور بسا اوقات علیحدہ علیحدہ عربی متون کو سننے کا موقع اور مواد فراہم کیا جائے۔ طلبہ کے فہم کو جانچنے کے لئے متعدد سرگرمیاں کرائی جاسکتی ہیں جن کی مدد سے زیرِ بحث موضوع پر زبانی یا تحریری سوال و جواب اور تبادلہ خیال کرایا جاسکتا ہے۔ فہم المسموع کی مفید مشق کے لیے عربی کی لسانی مہارتوں پر مبنی کتب [جیسے **العربية بين يديك**] میں اس مقصد کے تحت حوارات (Dialogues) دیے گئے ہیں اور ان کی ریکارڈنگ بھی دستیاب ہے جو پوری جماعت یا گروپ کو سنانے کے لئے مدرس کو ضروری وسائل مہیا کرنے چاہئیں جن کی مدد سے تمام طلبہ کو ریکارڈنگ سنوائی جاسکے۔ فہم المسموع میں حوارات (Dialogues)

سنوانے کے لیےاوراس کے فہم سے متعلق سوالات کے لیے چند امور کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

- حوارات طلبہ کو کلاس سے پہلے فراہم کیے گئے ہوں۔
- حوارات سنوانے کے لئے لینگویج لیب یا متبادل مناسب انتظام ہونا چاہیے۔
- حوارات میں تنوع ہونا چاہیے۔
- حوارات کے جائزے میں لغوی، صرفی اور نحوی ہر طرح کے نکات زیرِ بحث لائے جاسکتے ہیں۔ جائزے کے دوران حوارات میں تذکیر و تانیث، مفرد، تثنیہ و جمع ، ماضی ،مضارع، امر و نہی، فاعل و مفعول، مضاف و مضاف الیہ، صفت و موصوف وغیرہ کے اعتبار سے ردّ و بدل کیا جاسکتا ہے۔
- کمرۂ جماعت میں طلبہ یا طالبات کے گروپ بنا کر حوارات کی عملی مشق بھی کرائی جاسکتی ہے۔ مدرّس پر لازم ہے کہ وہ تصحیح کا کام انجام دے اور کسی معمولی غلطی سے بھی صَرفِ نظر نہ کرے۔
- جائزے کے لیے کئی طرح کی مشقیں کرائی جاسکتی ہیں جس میں کثیر الانتخابی سوالات، خالی جگہیں پر کرنا، مختصر جوابی سوالات،، صحیح و غلط کی نشان دہی، تلخیص یا توضیح جیسے طریقے شامل کیے جاسکتے ہیں۔

اگر حوارات سنوانے کا کسی طرح کا انتظام نہ ہو تو بھی طلبہ یا طالبات کو ان کی مشق کروا کے کمرۂ جماعت میں سرگرمی کروائی جاسکتی ہے، جس میں یہ امکان پیدا کیا جائے کہ مشق کے دوران ہی تمام جماعت کو اس کے لغوی محاسن و خصائص سے آگاہ کر دیا جائے۔ اس طرح بعض طالبِ علموں کو عربی الفاظ اور جملے بولنے اور دیگر کو انھیں سُن کر سمجھنے کا موقع ملے گا۔

فہم المقروء (Reading Comprehension)

فہم المقروء (Reading comprehension) کا اہم مقصد مطالعاتی مواد کی تفہیم ہے جس کے لیے مفردات، ان کے معنیٰ اور قواعد کی مدد سے عبارت کے فہم کا ہدف حاصل کیا جاسکتا ہے۔

قراءت کی اقسام:

فہم المقروء کے لیے قراءت کی مندرجہ ذیل تمام اقسام کو زیر استعمال لانا چاہیے۔

۱-القراءۃ الجھریۃ (Loud Reading)

القراءۃ الجھریۃ یا بلند خوانی میں کلمات کی درست ادائیگی کی مشق اور بوقت ضرورت خاص طور پر شعر میں ترنم اور نغمگی کے ساتھ پڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔تحریر میں وقف اور دیگر علامات کی آ گاہی بھی اس قسم کی قراءت سے حاصل کی جاسکتی ہے ۔طلبہ کے سامنے بعض اوقات مدرّس کوخود بلند خوانی کر کے اس کے قابلِ توجہ پہلوؤں کو اجاگر کرنا چاہیے۔اس کے بعد طلبہ میں سے مختلف افراد کو یہ ذمہ داری تفویض کی جائے اور مناسب امور کی تشریح کے ذریعے لفظوں کی ادائیگی اور جملوں کے انداز کی وضاحت کی جائے ۔اس طریقے سے جہاں زیرِ مطالعہ مواد کی تفہیم میں مدد ملے گی،وہاں زبان سے عربی عبارات کوادا کرنے سے جھجک بھی ختم ہوگی اور درست تلفظ کے ساتھ ادائیگی کی مشق بھی ہوگی۔

۲-القراءۃ السریۃ (Silent Reading)

ذاتی اور تیز رفتار مطالعہ کے لیے آہستہ آواز میں پڑھنے کی مشق ہونا ضروری ہے ۔تاہم اس طرح کی قراءۃ کے دوران بھی متن میں مستعمل وقف اور علامات کی آشنائی اور ان کا لحاظ ضروری ہے،تا کہ فہم درست ہو،البتہ اس میں ترنم ونغمگی کی ضرورت نہیں۔ بلند خوانی کی مشق جس قدر پختہ ہوگی،زیرِلب مطالعہ اتنا ہی مفید اورسُبک ہوگا۔

۳-القراءۃ المکثفۃ (Intensive Reading)

اس قسم کے مطالعے کا مقصد مطالعاتی مواد کو باریک بینی کے ساتھ پڑھنے کی مشق کرانا ہے جس کی مدد سے زیر بحث عمیق نکات پر غور وخوض کر کے قابل ذکر پہلوؤں کا اظہار اوران کا تجزیہ

کرنے کی استعداد پروان چڑھانا ہے۔اس قسم کی خواندگی میں تمام قاری یکساں نہیں ہوتے لیکن بتدریج طلبہ میں اس کی استعداد بڑھانے کی کوشش کرنی چاہئے۔قرآن حکیم،سنت رسول اکرم ﷺ،تفسیر، شرح حدیث، فقہ و اصول فقہ، سیرت طیبہ، اسلامی تاریخ اور فلسفہ وغیرہ مضامین کی درسی کتب اسی انداز سے پڑھانے کی کوشش کی جانی چاہیے۔

۴-القراءة الموسعة (Extensive Reading)

اس کا مقصد زیرِ درس مضمون سے متعلق عمومی مطالعہ ہے جس کے لیے عام طور پر رسائل و جرائد اور دیگر عام کتب کے مطالعے پر زور دیا جاتا ہے۔اس نوعیت کا مطالعہ بالعموم متعلمین کی عام معلومات اور زبان دانی کی عمومی استعداد میں اضافے کے لئے مددگار ثابت ہوتا ہے۔مدرس کو چاہیے کہ طلبہ کو بسا اوقات عام کتب اور زیر درس کتب سے ہٹ کر دیگر مطالعاتی مواد تجویز کرے جس سے طلبہ میں عام مطالعے کا رجحان بھی پیدا ہو اور وہ صرف درسی کتب تک ہی محدود ہو کر نہ رہ جائیں۔

قراءت کی سرگرمیاں:

- درست تلفظ اور ادائیگی کی اصلاح کی مشق کرائی جائے۔
- عربی کے مختلف رسم ہائے خط سے طلبہ کو آشنا کیا جائے جیسے خط نسخ اور خط رقعہ عربی کے معروف رسم الخط ہیں۔خط نسخ عربی کتب میں زیادہ استعمال ہونے والا رسم الخط ہے جب کہ خط رقعہ اس سے مختلف اور قدرے آسان ہے۔مختلف رسم الخط پڑھنے کی مشق کرائی جائے۔
- عربی میں کلمات بطور خاص اسماء اور افعال کے حروف اصلی کی پہچان کو اہمیت حاصل ہے،طلبہ کو اس کی درست شناخت کرانے سے انہیں قراءت میں سہولت ہوتی ہے۔
- کلام عرب کے منتخب نثر و نظم کے سبق آموز اور بامقصد حصوں کے مطالعے کی عادت ڈالیں۔ ابتدا مختصر اور دلچسپ قصص و حکایات سے کی جاسکتی ہے۔

- طلبہ میں بار بار پڑھنے کی عادت ڈالیں: ہر دفعہ پڑھتے وقت نئے پہلو پیش نظر رکھیں۔ مثلاً پہلی مرتبہ مفردات، دوسری مرتبہ مرکزی خیال اور تیسری بار قواعد پر توجہ مرکوز کرائیں۔
- اہم الفاظ یا نکات کو نمایاں کرائیں۔ علیحدہ سے نوٹ کرائیں یا خط کشیدہ کرائیں۔
- عبارت سے حاصل فہم کو اپنے الفاظ میں لکھنے کی مشق کرائیں۔
- ڈکشنری یا لغت سے استفادے کی مشق کرائیں۔ آن لائن لغات سے استفادے کی ایسی عادت ڈالیں جس سے ذاتی صلاحیت میں بھی اضافہ ہو۔
- مطالعہ مکمل کرانے کے بعد تلخیص تیار کرائیں۔
- طلبہ کے اسٹڈی گروپ بنائیں جن میں روزمرہ مشاہدات یا حاصل مطالعہ پر عربی میں تبادلہ خیال کا اہتمام کریں۔
- تصویریں، خاکے، ہمہ جہت تدریسی کتب جن کا سمعی و بصری مواد بھی دستیاب ہو کو تدریس کے لیے منتخب کرنا زیادہ مفید ہے۔ جیسے **العربیة للناشئین** اور **العربیة بین یدیک** جن کا سمعی مواد بھی آن لائن دستیاب ہے۔
- مدرس عربی میں آن لائن ذرائع پر دستیاب قصص القرآن اور اسلامی تاریخ کی متعدد ویڈیوز میں سے مختصر اور آسان ویڈیوز کو طلبہ کی سرگرمیوں کے لیے منتخب کر سکتا ہے۔

التعبیر الکتابی (Written Expression)

تحریر وہ ذریعہ ہے جس کی مدد سے اپنے خیالات کو دوسروں تک منظّم اور مربوط شکل میں منتقل کیا جا سکتا ہے اور اس طریقے سے اپنے خیالات کو بعد کے زمانوں تک محفوظ بھی بنایا جا سکتا ہے اس طرح تحریر کردہ مواد سے زیادہ بڑے پیمانے پر اور زیادہ عرصے تک استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ تحریر کو زبان کی چار معروف مہارتوں میں شمار کیا جاتا ہے بلکہ یہ مہارت دیگر مہارتوں کی کامیاب تکمیل کے نتیجے کے طور

پر زیادہ نکھر کر سامنے آتی ہے۔

ادب عربی کی تدریس کا اہم ہدف طلبہ کا عربی میں بول چال کرنا، تقریر و تحریر کے ذریعے اپنے خیالات دوسروں تک منتقل کرنا ہے۔ اگر طلبہ میں واقعی یہ استعداد پیدا ہو رہی ہے تو سمجھا جائے گا کہ عربی کے مدرسین اور ان کے زیر تربیت طلبہ مفردات، قواعد، تراکیب ہی نہیں بلکہ زبان کے مؤثر استعمال اور کلچر تک سے واقف ہیں اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر سالہا سال تک عربی قواعد صرف ونحو، بلاغت وبیان اور عربی ادب کی اعلیٰ درجے کی کتب کے علاوہ تفسیر، حدیث اور فقہ وغیرہ کی عربی میں درسی کتب پڑھنے پڑھانے کے باوجود عربی میں اظہار خیال کی صلاحیت پروان نہ چڑھے تو پھر یہ دینی مدارس کے نظام تعلیم کے لئے سوالیہ نشان ہے۔ لہٰذا مدرسین عربی کو طلبہ میں زبان کی جملہ مہارتوں کو فروغ دینے کے لئے فکر مند ہونا چاہئے۔

تدریس کتابت کے مراحل اور سرگرمیاں:

- ابتدائی مرحلے میں جب طلبہ کو مفردات اور قواعد کی آگاہی ہو جائے اور وہ تراکیب اور جملے تحریر کرنے کے قابل ہو جائیں تو مدرس ان سے تحریر کی آسان مشقیں کروائے جس میں خالی جگہ پر کرنا، نامکمل جملے مکمل کرنا، جملے میں کلمات کی ترتیب درست کرنا اور غیر مرتب جملوں کی ترتیب درست کرنا وغیرہ جیسی مشقیں شامل ہیں۔
- ابتدائی مرحلے کی مشقیں کامیابی سے حل کر لینے کے بعد طلبہ کو بتدریج آسان اور سادہ موضوعات پر لکھنے کی مشق کرائی جائے گی، تمام جماعت کو ایک موضوع بھی دیا جا سکتا ہے اور تمام طلبہ کا الگ الگ موضوعات بھی دیے جا سکتے ہیں۔
- دیے گئے موضوعات سے متعلق پیشگی سوالات جوابات کی ذریعے یا کسی مناسب طریقے سے موضوع کے بارے میں رہنمائی فراہم کی جا سکتی ہے۔
- روزمرہ زندگی کے اہم امور کے بارے میں لکھنے کی مشق کرانا بالعموم دلچسپ اور مفید ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر طلبہ کو وطنی باکستان یادراستی فی الجامعة جیسے موضوعات پر لکھنے کی مشق دی جاسکتی ہے۔اس طرح تخلیقی لکھائی یعنی الکتابة الابداعیة (Creative Writing)، کی صلاحیت کو رفتہ رفتہ بڑھا کر طلبہ کسی بھی موضوع پر اپنے خیالات عربی میں تحریری طور پر دوسروں تک پہنچاسکتے ہیں۔موضوعات کچھ اس نوعیت کے ہوسکتے ہیں: اکتبوا عن میزات الادب الجاهلی۔قارنوا بین الادب الجاهلی و الادب الحدیث۔ ماهی عوامل تطور النثر فی العصر العباسی ؟التکنولوجیا فی خدمة الانسان المعاصر ۔تاہم یہ مفید ہوگا کہ ایسا کوئی موضوع دیتے ہوئے اس سے متعلق کچھ دیر اجتماعی طور پر گفتگو کر لی جائے تاکہ موضوع اور اس کی مختلف جہتیں طالبِ علم کے سامنے نمایاں ہوجائیں اور متعلقہ ذخیرہ الفاظ ذہنوں میں حاضر ہوجائے۔

- مدرّس کو چاہئے کہ ابتدائی مرحلے میں طلبہ کی تیار کردہ مشقوں کی تصحیح کے بارے میں پوری جماعت کو آگاہ کرے تاکہ تمام طلبہ اس سے سیکھ سکیں لیکن بعد کے مراحل میں کمرہ جماعت میں مکمل تصحیح کے بجائے صرف نشان دہی پر اکتفا کیا جائے۔

التعبیر الشفوی(Verbal Expression)

کسی بھی زبان میں اظہارِ خیال کے لیے بالعموم دو طریقے استعمال کیے جاتے ہیں: تقریر اور تحریر۔تحریر کی تیاری کے لیے غور وخوض اور نظر ثانی کا موقع مل سکتا ہے لیکن تقریر کی صورت میں بالعموم موقع پر اپنی بات کو دوسروں تک منتقل کیا جاتا ہے۔اسی لیے زبان کے ذریعے اظہارِ خیال لسانی مہارتوں میں قدرے مشکل سمجھا جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ کسی بھی زبان میں مؤثر ابلاغ کے لیے زبان کے مفردات اور قواعد کی فقط آگاہی کافی نہیں بلکہ زبان کے تمام متعلقات کو بروئے کار لاکر ہی اپنے خیالات کا اظہار کامیابی سے کیا جاسکتا ہے، نیز تقریر کا اسلوب بھی تحریر کے اسلوب سے مختلف ہوتا ہے مثلاً تقریر میں بلاغت مختصر جملوں اور آسان فہم تراکیب سے آتی ہے جب کہ تحریر میں بعض اوقات

اس کے برعکس ہوتا ہے۔ایک مدرّس کی کامیابی یہی ہے کہ وہ زیرِ تربیت افراد میں زبانی اظہار کے حوالے سے اس کے مشکل ہونے کا یہ احساس اور جھجک نہ پیدا ہونے دے۔ بلکہ انھیں مسلسل حوصلہ افزائی کے ذریعے یہ باور کروائے کہ کسی بھی زبان اور بالخصوص عربی میں تقریر، خطاب یا بول چال کی مدد سے اظہار خیال کی صلاحیت زیادہ سے زیادہ تدریب اور مشق کے بغیر پیدا نہیں کی جاسکتی۔

بول چال اور تقریر کی استعداد میں اضافے کے لیے مختلف سرگرمیاں کی جاسکتی ہیں جن کی مدد سے مدرّس اپنے طلبہ کو عربی میں اظہار خیال کی تربیت دے سکتا ہے۔

- درسی مواد میں دیے گئے حوارات یعنی مکالمے تدریب اور مشق کا آسان اور مؤثر ذریعہ ہیں۔ **العربية بين يديك** میں کوئی درس اس سے خالی نہیں۔طلبہ کے مابین گروپ بنا کر کلاس میں عملی طور پر حوارات کرائے جاسکتے ہیں۔
- مدرس روزمرہ زندگی کے معمولات اور مشاغل کے بارے میں طلبہ سے سوال جواب کر کے بول چال کی تربیت دے سکتا ہے۔
- طلبہ کے لیے مختلف دینی، سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل اور امت مسلمہ کے بین الاقوامی مسائل پر تبادلہ خیال اور مباحثے کا اہتمام کیا جاسکتا ہے اور اس میں طلبہ زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ تقریری مقابلے بھی بول چال کی تربیت دینے میں اہم محرک ثابت ہوسکتے ہیں۔
- کھیل ہی کھیل میں یا لغوی پہیلیوں اور قصہ گوئی کے ذریعے بھی بول چال کی تربیت دی جاسکتی ہے، اس کے علاوہ مختلف اہم مواقع،تقریبات اور تفریحی و مطالعاتی دوروں کی روداد طلبہ سے عربی میں پیش کرنے کا کہا جائے تو وہ بڑے شوق سے ان تمام سرگرمیوں میں حصہ لیں گے۔
- تاریخی شخصیات اور واقعات کا احوال عربی میں بیان کرنے کا کام بطور ایک سرگرمی طلبہ کو دیا جاسکتا ہے۔

الغرض یہ کہ مدرّس کے پاس سرگرمیوں کے انتخاب کے لیے بھرپور مواقع دستیاب ہوتے ہیں

بشرطیکہ وہ انہیں استعمال کرنے پر آمادہ ہو اور اس کے لیے پیشگی اطلاع و تیاری کا نظام بھی تشکیل دے۔ بصورت دیگر طلبہ کی طرف سے سنجیدگی کا مظاہرہ نہ ہونے کی صورت میں یہ سرگرمیاں مکمل طور پر ثمر آور ثابت نہ ہوں گی۔

تدریس عربی کے طریقے اور درکار مہارتیں

ذیل میں مندرجہ بالا مقاصد کے حصول کے لیے تدریس عربی کے متعدد طریقے، موزوں طریقہ، اور درکار مہارتیں زیر بحث لائی جا رہی ہیں۔

براہِ راست طریقہ (Direct Method)

زبان سیکھنے کا براہِ راست طریقہ عربی میں **الطریقة المباشرة** کہلاتا ہے۔ اس طریقے میں بنیادی طور پر اساتذہ اور طلبہ کے درمیان عربی میں مسلسل بات چیت کی مشق پر زور دیا جاتا ہے، چاہے وہ الفاظ کے معنی کی وضاحت کرنے کے لیے ہو یا براہِ راست کوئی بات دوسرے تک منتقل کرنے کے لیے ہو۔ بغیر ترجمہ کے براہِ راست زبان سیکھنے کا طریقہ ایک فطری طریقہ ہے جس کے مطابق طلبہ زیادہ آسانی سے زبان سیکھ پاتے ہیں۔ اس طریقے کے استعمال سے زبان سیکھنے کے لیے ترجمہ کی ضرورت نہ ہونے کے برابر رہ جاتی ہے۔ اس طریقے میں سب زیادہ اہمیت متعلقہ ادارے میں اور کمرہ جماعت میں عربی زبان سیکھنے کے لیے موزوں ماحول مہیا کرنا ہے۔ اس لحاظ سے عربی سیکھنے اور سکھانے کے لیے تدریسی سرگرمیوں کا مؤثر اطلاق بھی اہم ہے جسے یکساں طور پر تمام افراد کے لیے آزمایا جا سکتا ہے۔ اس طریقے کے مطابق عمومی طور پر نہیں لیکن ضرورت پڑنے پر معلم درمیانی زبان جیسے اردو یا کسی بھی مقامی زبان سے مدد لے سکتا ہے۔ ماحول بنانے کے لیے طلبہ کی عام بول چال میں عربی کی پابندی کرائی جائے خاص طور پر کمرہ جماعت میں اور اگر تعلیمی ادارے کے ماحول میں اس کا اہتمام ہو تو کافی مفید ہو سکتا ہے۔ یہ بات مشاہدے میں آ چکی ہے کہ عربی بول چال سکھانے کے لیے عربی کے علاوہ دیگر زبانوں پر پابندی عائد کر دی جائے یا عربی سیکھنے کے دوران دیگر زبانوں کے استعمال کی صورت

میں معمولی جرمانہ عائد کر دیا جائے تو زیادہ تر شرکاء کورس کے دوران ہی عربی بول چال سیکھ لیتے ہیں۔ اس ابتدائی کامیابی کے بعد ان کی مستقل محنت ان کی عربی دانی میں مزید نکھار کا باعث بن سکتی ہے۔

بول چال کا طریقہ (Method of Conversation)

محادثہ اور بول چال ابلاغ کے طریقوں میں سے ایک ہے جسے استعمال کر کے کم وقت میں زیادہ اور آسانی سے عربی زبان سکھانے میں مدد مل سکتی ہے۔ اس طریقے میں مدرّس کی ذمے داری ہوتی ہے کہ وہ طلبہ کو چھوٹے گروپوں میں تقسیم کر کے انہیں مختلف امور سونپ سکتا ہے۔ اس کا انداز یہ ہوگا کہ طلبہ کے گروپ کو کسی عام اور نسبتاً آسان موضوع پر مطالعہ کرایا جائے یا روزمرہ معمولات اور سرگرمیاں مطالعے کا موضوع بنائی جائیں۔ ان موضوعات پر گروپ کے ارکان میں مطالعے کے بعد تبادلہ خیال ہو۔ مختصر اور سادہ تحریر بھی تیار کر لی جائے اور آخر میں اسی کے مطابق تمام ارکان یا ان میں سے بعض کمرۂ جماعت میں تمام طلبہ کے سامنے زیرِ بحث موضوع پر عربی میں اظہار خیال کریں۔ اگر کلاس کی منصوبہ بندی کی گئی ہے اور اچھی طرح سے پڑھایا گیا ہے، تو طلبہ تیزی سے عربی زبان سیکھ سکتے ہیں اور اس طریقے کے مطابق کلاس شروع کرنے کے چند ہفتوں بعد عربی میں گفتگو کرنا شروع کر سکتے ہیں۔ تاہم، یہ طریقہ استاد کے معیار اور درسی مواد کے انتخاب پر زیادہ منحصر ہے۔

پڑھنے اور لکھنے کا طریقہ (Method of Reading & Writing)

کسی بھی زبان کے سیکھنے کے عمل میں جن عوامل کی ضرورت ہوتی ہے ان میں پڑھنا اور تحریر اہم ہیں ان دونوں مہارتوں میں مدرّس کی استعداد کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مدرس کی اپنی کمزوری لازمی طور پر طلبہ کی استعداد اور مہارت پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ دینی مدارس کے ماحول میں بلاشبہ اساتذہ کی علمی صلاحیت و استعداد پر شبہ نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کے ساتھ اس بات کا بھی خیال رکھنا از حد ضروری ہے کہ عربی زبان کی تدریس جس مدرس کے سپرد ہو اسے عربی بول چال، تحریر اور بلند خوانی کی مہارتوں پر عبور ہونا چاہئے۔

قراءت سے متعلق امور میں عبارت کا فہم اور قراءت میں رفتار کے مسائل نمایاں ہیں۔ ان مسائل کو حل کرنے اور طلبہ کی عربی زبان دانی کی استعداد میں بہتری لانے کے لیے مدرس کو منتخب مطالعاتی مواد کی طلبہ سے ایک سے زائد بار بلند خوانی کرانی چاہیے۔ کمرہ جماعت میں مقابلے کا ماحول پروان چڑھانا بھی اس کے لئے مفید ثابت ہوسکتا ہے۔ اس کے لیے ایک کارگر تدبیر یہ ہوسکتی ہے کہ مدرس منتخب مطالعاتی مواد طلبہ کے سامنے پیش کرے اور اس کی توضیح کرنے کے بعد طلبہ کے فہم کو جانچنے کے لیے ان کے سامنے چند سوالات پیش کرے جن کے جوابات طلبہ کی جانب سے زبانی بیان کیے جائیں اور تحریری طور پر بھی دیے جائیں۔ یہ تمام سرگرمی وقت کی تحدید کے ساتھ ہونی چاہیے تاکہ طلبہ کو محدود وقت میں اپنا کام مکمل کرنے کی مشق بھی کرائی جاسکے اور ایسے طلبہ کی نشان دہی ہو سکے جن کو فہم کے سلسلے میں یا زبان دانی کے سلسلے میں دشواری کا سامنا ہے۔ مدرس ایسے طلبہ کی بروقت رہنمائی کر سکے گا۔ ابتدائی جماعتوں میں مدرس کمرہ جماعت میں اس نوعیت کی سرگرمیوں کی مدد سے طلبہ میں عربی پڑھنے اور لکھنے کی مہارت کو فروغ دے سکتا ہے لیکن منتہی یعنی آخری درجوں کے طلبہ کے لیے زیادہ مناسب ہوگا کہ انہیں فکری، ثقافتی، دعوتی، سماجی، حالات حاضرہ اور کھیل وتفریح وغیرہ موضوعات سے متعلق منتخب مواد فراہم کیا جائے اور اس کو مدنظر رکھ کر طلبہ کے مابین مباحثے (Debates) اور تحریری مقابلے کرائے جائیں۔ جب تک عربی زبان کی تدریس کے لئے مذکورہ تدابیر پر مبنی اسلوب اختیار نہیں کیا جائے تو باوجود اس کے کہ طلبہ عربی زبان وادب کی منتہی درجات کی کتب ترجمہ کی مدد سے پڑھ لیں گے مگر ان میں عربی زبان کی مہارتوں کا حصول نہ ہو سکے گا۔

قواعد اور ترجمے کا طریقہ (Method of Grammar & Translation)

قواعد کی مدد سے ترجمہ کا ہدف حاصل کرنا اس طریقے کا اہم پہلو ہے جس میں ذخیرہ الفاظ (vocabulary) کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ زبان کی تدریس میں قواعد بذات خود مقصود نہیں ہوتے بلکہ ان کی مدد سے درست زبان کے استعمال پر قدرت حاصل کی جاسکتی

ہے۔تنہا قواعد کی تعلیم زبان کی مہارتوں کو فروغ دینے میں کافی نہیں سمجھی جاتی، اس کے لیے دیگر معاونات (Teaching aids) کو بروئے کار لانا ضروری خیال کیا جاتا ہے۔مثال کے طور پر عربی زبان سکھانے کے ابتدائی مرحلے میں طالب علم کو ایسے مواد سے روشناس کیا جاتا ہے یا اسے استعمال کرنے کی مشق کرائی جاتی ہے کہ جس کی مدد سے وہ بآسانی عربی میں اظہار مافی الضمیر کرسکتا ہو اور اس کے لیے طلبہ کو دلچسپ حکایات، قصے، ترنم کے ساتھ ادا کی جانے والی نظمیں جو مختصر ہوں اور آسان فہم بھی اور بتدریج طلبہ کو مختلف ادبی تحریروں کو پڑھنے کا موقع فراہم کیا جائے۔بالعموم درسی کتب اسی اصول پر مرتب کی جاتی ہیں اور دینی مدارس میں قواعد عربی کی تدریس کے لئے متعدد کتب شامل درس ہیں جن میں علم الصرف اور علم النحو کی بطور خاص کئی کتب پڑھائی جاتی ہیں۔اس کے علاوہ عربی ادب نثر ونظم کے منتخب شہ پاروں پر مشتمل مجموعوں کو بھی عربی زبان سکھانے کے لئے شامل درس کیا گیا ہے جن میں **قصص النبیین، القراءۃ الراشدۃ یا القراءۃ الرشیدۃ، نفحۃ العرب** اور **مختارات** یا **مقامات حریری** قابلِ ذکر ہیں۔

عربی قواعد کی تعلیم کے حوالے سے علم الصرف اور علم النحو دونوں کی الگ الگ کتب شامل درس ہیں۔زبان کی مؤثر تدریس کے لیے یہ بات لازمی طور پر مدنظر رکھی جانی چاہئے کہ قواعد سے متعلق کتب کی تدریس کا مقصد بجائے خود کتاب فہمی نہیں ہے بلکہ عربی زبان کی مہارتوں قراءت، مکالمہ وتکلم اور کتابت میں مدد دینا اور ان میں بہتری لانا ہے لیکن اگر اساتذہ کی توجہ اس جانب نہ ہو اور قواعد عربی کی کتب کے متن بھی طلبہ کو یاد کرادیے جائیں لیکن زبان کے استعمال میں قواعد کو مدنظر رکھ کر ادائیگی میں ہر قسم کی غلطی سے بچنے کا ملکہ طالب علم میں پیدا نہ ہو تو قواعد کی کتب پڑھانے کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

عربی ادب کی کتب کا مقصد تدریس بھی صرف ترجمے کی صلاحیت پروان چڑھانا نہیں ہونا چاہیے اگرچہ یہ بھی مقصود ہو کہ قرآن حکیم اور سنت رسول اکرم ﷺ کے نصوص کا فہم ایک حد تک اس کا متقاضی ہے لیکن اس میں بھی ضروری حد تک ہر قسم کے ماحول میں عربی زبان وادب کے استعمال کی

صلاحیت پیدا کرنا اور اس میں نکھار لانا مقصود ہونا چاہئے۔ دینی مدارس کی روایت میں عربی کی تدریس کے سلسلے میں تا حال جن کتب کی تدریس کا رجحان ہے ان میں قواعد عربی علم الصرف وعلم النحو وغیرہ کی الگ کتب اور زبان وادب سے متعلق الگ کتب، جن میں سے بعض کتب کا تذکرہ پہلے گزر چکا ہے، پڑھائی جاتی ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عربی زبان کی مہارتوں کو فروغ دینے کا رجحان پروان چڑھ رہا ہے اور درسی مواد کے سلسلے میں ایسی کتب مرتب کی جا رہی ہیں کہ جن میں بیک وقت قواعد اور زبان وبیان دونوں کے نظری سے زیادہ عملی وتطبیقی پہلوؤں کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہو۔ اسی طرح آن لائن دستیاب وسائل سے استفادہ کا رجحان بھی بڑھ رہا ہے۔

موزوں طریقے کا انتخاب

اگر یہ جاننا ہو کہ عربی سیکھنے اور سکھانے کے لئے بہترین طریقہ کون سا ہے، تو اس کا واضح اور آسان جواب یہی ہے کہ عربی سیکھنے سکھانے کا بہترین طریقہ ان میں سے کوئی ایک نہیں ہوسکتا بلکہ موزوں طریقہ یہ ہے کہ ان تمام طریقوں کو بوقت ضرورت اور حسب موقع اختیار کیا جائے۔ اس لحاظ سے مجموعی طریقہ ہی موزوں طریقہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ ہر طریقے کے اپنے فوائد اور نقصانات ہوتے ہیں، اور ہر طریقے میں کسی خاص پہلو پر توجہ مرکوز کی جاتی ہے۔ عربی سیکھنے سکھانے کے موزوں اور بہترین طریقہ منتخب کرنے کے لیے مقاصد تدریس پر نگاہ مرکوز رکھنی چاہیے جس کا زیادہ تر انحصار اساتذہ پر اور کسی حد تک طلبہ کی ترجیحات وضروریات پر ہوتا ہے۔ اس کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ ایک ہی جماعت یا گروہ کے طلبہ کی انفرادی خصوصیات اور اس کے مطابق ان کو زبان سکھانے کے لیے دوسروں سے مختلف تدریسی حکمت عملی کا اپنانا لازمی ہے جسے نظر انداز کرنا کسی مؤثر تدریسی صلاحیت کے حامل استاد کے لیے کسی طرح مناسب نہیں۔ اگر انفرادی ضروریات کو یا رجحانات کو پیش نظر رکھا جائے تو بیان کردہ طریقوں میں سے قواعد و ترجمہ کا طریقہ، الطریقۃ المباشرۃ یا مفردات (vocabulary) پر مبنی طریقے موزوں معلوم ہوں گے لیکن ہر طریقے کو تمام طلبہ کی صلاحیت اور

رجحان کے مطابق قرار دینا مشکل ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ اور متعدد طریقوں کے مفید پہلوؤں کو حسب موقع وحسب ضرورت استعمال کیا جائے۔ یہی طرزِ عمل مؤثر تدریس کے لئے زیادہ موزوں ومناسب ہے۔اس اسلوب کے مطابق عربی سکھانے کے لئے جو تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں وہ یہ ہیں:

- دوران سبق کمرۂ جماعت میں استاد اور طلبہ کے مابین تعامل زیادہ سے زیادہ ہونا چاہیے جس میں پڑھنے، لکھنے، سننے اور بولنے کے ذریعے عربی مفردات،قواعد اور منتخب ادبی عبارتوں کی تعلیم کا اہتمام ہو۔
- روزانہ عربی بول چال کے موضوع کا تعین اور اس کے مطابق طلبہ کی مشق کا دورانیہ روزانہ کی بنیاد پر طے کرنا۔
- طالب علم کی مطالعہ کرنے کی صلاحیت میں بہتری۔
- عربی کی تعلیم میں تربیت یافتہ عرب اساتذہ سے پیشہ وارانہ رہنمائی حاصل کرنا۔
- اساتذہ وطلبہ کے مابین منتخب موضوعات پر عربی بول چال کے مواقع مہیا کرنا۔
- رنگین، دیدہ زیب بصری معاونات کا استعمال۔
- سمعی مہارتوں میں اضافے کے لیے میسر وسائل و ذرائع کو استعمال کر کے عربی سنانے کا اہتمام کرنا۔
- روزانہ کی مشق میں نمایاں کارکردگی والے طلبہ کی حوصلہ افزائی اور دوسرے طلبہ کے ساتھ معاونت کی صورت بنانا۔

تدریسی سرگرمیاں اور معاونات کا استعمال

کوئی بھی زبان سیکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے لیے درکار ماحول اور اس سے فائدہ

اٹھانے کے لیے اسی قدر محنت کی جائے اور اس کی بنیادی ذمہ داری مدرس پر عائد ہوتی ہے۔ زبان سکھانے کے لیے سادہ اور دلچسپ انداز اپنانا چاہیے جس میں پیچیدگی کم اور آسانی زیادہ ہو۔ زبان سکھانے کے لیے تمام تر انحصار ترجمہ اور قواعد پر نہیں کیا جاسکتا۔ اس صورت میں مدرس اور طلبہ کے مابین تعامل بہت محدود ہوگا جب کہ زبان کی تدریس کے لیے تدریسی سرگرمیاں اور ماحول میں آسانی سے دستیاب دلچسپ اور متنوع معاونتوں جن میں بطور خاص سمعی و بصری معاونتیں شامل ہیں ان کو استعمال کرنا از حد ضروری ہے۔ تدریس عربی کے لیے کمرہ جماعت کا ماحول دوستانہ اور طلبہ و اساتذہ کے مابین بھرپور تعامل پر مبنی ہونا چاہیے۔ اسی صورت میں ان دلچسپ سرگرمیوں اور معاونتوں کے استعمال کے فوائد حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ تدریسی سرگرمیاں اور معاونات عربی زبان دانی کی مہارتوں کی ضمن میں اوپر بیان کی گئی ہیں۔

عربی کی تدریس کے لیے اہم وسائل تعلم

تعلیمی اداروں میں عربی زبان و ادب بطور خاص عربی بول چال کا ماحول بنانے کے لیے وسائل میں سب سے زیادہ اہمیت افرادی وسائل کو حاصل ہے یعنی عربی زبان و ادب اور عربی بول چال و تحریر پر مکمل عبور رکھنے والے اساتذہ کے تقرر کی کوشش کی جائے جن کی سہولت کاری کے لیے ذیل کی فہرست میں دئے گئے وسائل کی فراہمی مطلوبہ اہداف کے حصول میں معاون ہوسکتی ہے۔

- مختبر اللغۃ (Language lab)
- عربی مفردات (Vocabulary) اور مقولات پر مبنی تصاویر و چارٹس
- لغات (Dictionaries)
- عربی رسائل و جرائد اور اخبارات
- سمعی و بصری تسجیلات (Recordings)
- ریکارڈنگ کی سہولت

- پروجیکٹر یا ملٹی میڈیا
- وائٹ بورڈ، سافٹ بورڈ و دیگر لوازمات
- کمپیوٹر لیب

اس تحریر کے ابتدائی حصے میں مذکور آیتِ قرآنی اور حدیث نبوی کی جانب توجہ دوبارہ مبذول کرواتے ہوئے یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ عربی زبان کے مدرّس کی لگن اور شوق کا بنیادی محرک یہ ہونا چاہیے کہ طلبہ میں دین اور دینی علوم میں رسوخ پیدا ہو اور معاشرے کو ایسے علما میسر آئیں جو عربی زبان وادب کی نزاکتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے علومِ قرآن و حدیث کو سہل انداز میں عوام تک پہنچا سکیں۔ مدرّس اور طالبِ علم کا اوّلین اور حتمی ہدف رضائے الٰہی کا حصول ہی رہنا چاہیے۔

......حاشیہ......

۱- اس حدیث کو عقیلی نے الضعفاء میں، طبرانی نے الکبیر میں، الحاکم نے مستدرک میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اس کے بارے میں اہم یہ ہے کہ یہ یا تو تمام طریقوں کے اعتبار سے بحیثیت مجموعی حسن ہے یا اس میں ضعف ہے اور اسے ترھیب و ترغیب میں بیان کرنا جائز ہے۔

تدریسِ علمِ کلام

مولانا محمد رفیق شنواری

I۔ اہمیت اور اسباب و محرکات

علمِ کلام کی اہمیت

اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی بھی قول وعمل اور جدوجہد کی حیثیت کا تعین، کرنے والے کی نیت اور نظریئے کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ نظریہ اور عقیدہ ہی اس تمام تر کوشش اور محنت کے لیے روح کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسانی رویے بھی ذہنیت اور سوچ کی بنیاد پر تشکیل پاتے ہیں۔ اسی اہمیت کے پیشِ نظر عہد رسالت کا ابتدائی دور نظریہ سازی اور اصلاحِ عقیدہ کے لیے ہی صرف ہوا۔ اس دور میں تشریعی احکام بہت ہی کم دیے گئے اور قرآنِ کریم کے اکثر حصے کا نزول اور معجزات کا ظہور بھی اِسی مقصد کے لیے ہوا۔ درحقیقت صحیح عقیدہ، مثبت نظریہ اور پختہ سوچ وفکر ہی وہ منبع ہے جہاں سے نیک تمنائیں اور جذبات جنم لیتے ہیں، خیر کے اقوال وافعال پھوٹتے ہیں اور باہمی اخوت ومحبت اور ایثار وقربانی پر مبنی رویے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی بنیاد پر اچھے افراد تیار ہوتے ہیں اور وہی صالح افراد مل کر مثالی معاشرہ تشکیل دیتے ہیں۔ اور یہ مثالی معاشرہ ہی معیاری تہذیب، تمدن وثقافت اور کردار کی تاریخ رقم کرتا ہے۔ اس کے بعد تہذیبوں کے تقابل کا عمل وجود میں آتا ہے۔ چنانچہ مذاہب کے جانچنے کے لیے ان کا تہذیبی کردار اور تمدنی رول ڈھونڈا جاتا ہے۔ اس طرح یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ فکر وعقیدہ ہی وہ بنیادی اکائی ہے جو کسی بھی مذہب وتہذیب کی حیثیت متعین کرنے میں اساسی رول ادا کرتی ہے۔

آج کی دنیا پر نظر ڈالیں تو علم کلام کے قدیم مباحث کے تدریسی ماحول میں معاصر ضروریات کے پیشِ نظر نظریے اور فکر و عقیدے کی اہمیت اور گلوبل دنیا میں تہذیبی و فکری چیلنجز کا احساس اور ان سے نمٹنے کے لیے تیاری پر آمادگی کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ فطری طور پر اس ضمن میں علم کلام کے ذخیرے سے بھرپور استفادے اور مطلوبہ اہداف و مقاصد تک رسائی کا مسئلہ بھی نسبتاً زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ لہٰذا اساتذہ کے لیے ضروری ہے کہ گلوبل دنیا میں بڑھتے چلے جانے والے تہذیبی و فکری چیلنجز سے طلبہ کو آگاہ کریں اور دینی سوچ و فکر اور اسلامی عقیدے کی تحفظ اور معاشرے میں اس کو فروغ دینے کی طرف توجہ دلائیں۔ نیز ان پر یہ واضح کریں کہ اس تہذیبی، فکری اور نظریاتی جنگ میں ہمارا اسلحہ اور ہتھیار، دفاع اور اور دشمنوں پر وار کی وہی حکمتِ عملی اور علمِ کلام کے وہی اسالیب ہونے چاہییں جو یونانی اور ایرانی فلسفے سے مقابلہ کرنے کے دوران امام غزالیؒ، امام رازیؒ اور امام ابن تیمیہؒ وغیرہ حضرات نے استعمال کیے تھے۔ انہوں نے اولاً اسلامی علوم کو گہرائی اور گیرائی کے ساتھ سمجھا، دینی حمیت، اسلامی سوچ و فکر کو مضبوطی سے تھاما، فلسفے پر گہری نقد و نظر کی صلاحیت حاصل کی اور پھر جب عقیدے کی جنگ کے میدان میں اترے تو یونانی فلسفے کا دلائل و براہین سے مقابلہ کرتے ہوئے نظریاتی بنیاد پر اسے شکست دی۔

دوسری جانب اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اگر تحفظ اور اصلاح عقیدہ میں علم کلام کا یہ اہم کردار ہے تو اس کے بارے میں امام شافعیؒ جیسے جلیل القدر ائمہ کے مذمتی بیانات کیوں سامنے آئے تھے، اور علم کلام میں اشتغال و تحصیل کے عمل پر سوالیہ نشان کیسے لگا تھا۔ یوں موجودہ دور کی ضروریات اور علم کلام کی مدد سے بآسانی ان کی تکمیل واضح کرنے کے ساتھ علم کلام سے منع کرنے والے جلیل القدر ائمہ کے بیانات وارشادات کی نوعیت اور حیثیت کی بھی تشریح کرنی ہوگی۔ ان دونوں متضاد آراء میں تسلی بخش تطبیق کر کے طلبہ کو مطمئن کرنا ہوگا۔

اس نکتے کی وضاحت کے لیے اساتذہ کرام کو علم کلام کے آغاز وارتقا، تاریخِ ترتیب و تدوین اور ہر دور میں علم کلام پر اثر انداز ہونے والے عوامل و محرکات کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

علمِ کلام کی تدوین: اسباب ومحرکات

علمِ کلام کی اہمیت اور ضرورت واضح کرنے کے بعد طلبہ کو علم کلام کی مکمل اور جامع تاریخ سے روشناس کرایا جائے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ علم کلام اپنے وضع اور ترتیب وتدوین کے اعتبار سے دیگر اسلامی علوم سے قدرے مختلف ہے۔ آغاز سے لے کر تدوین کی معاصر صورت تک ہر مرحلہ دوسرے مرحلے سے مزاج، صورت اور کسی حد تک موضوعات میں مختلف ہے۔ اس لیے اس علم کی جامع تاریخ طلبہ کے سامنے رکھنا تدریس علم کلام کے مبادیات میں سے ایک اہم موضوع ہے۔ اس ضمن میں واضح کرنا چاہیے کہ اولاً عہد نبوی اور خلافتِ راشدہ کے ادوار میں اسلام کی آسان، سادہ اور زود فہم تعبیر و تشریح کا انداز تھا۔ بعدازاں رفتہ رفتہ منطقی مقدمات، عقلی تمہیدات اور پیچ در پیچ تعبیرات اور اصطلاحات کا حجم بڑھتا چلا گیا۔ اِن تبدیلیوں کے اسباب وعوامل سامنے لا کر ان عقلی مباحث اور فلسفیانہ اسلوب کے لیے کی جانے والی کاوشوں کو مؤثر بنانے میں رول اور کردار کو بھی واضح کرنا ہوگا۔ پھر علم الکلام کے تمام ادوار کی خصوصیات اور ہر دور میں کلامی مباحث اور رُخ اور ان سے مطلوبہ اہداف ونتائج کی وضاحت بھی ضروری ہوگی۔ آخر میں بطورِ نتیجہ معاصر ماحول اور صورتِ حال میں اہداف کا تعین، مباحث اور موضوعات کی تحدید، علمی وفنی وسائل وذرائع کا انتخاب، طریقۂ کار اور اس علمی وفکری سفر کو صحیح سمت میں برقرار رکھنے کے لیے اصول وقواعد کا تعین اور ان جیسے اہم نکات کو زیرِ بحث لانا علم کلام کی تدریس کے آغاز میں استاد کے لیے مناسب ہوگا۔

بنیادی سبب اس کا یہ ہے کہ عصرِ حاضر کی قوتیں علم وفکر کے ذریعے مسلمانوں کے دین ومذہب پر حملے کو زیادہ مؤثر سمجھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فلسفے کی آڑ لے کر مذہب اسلام کے عقائد ونظریات، انفرادی واجتماعی طرزِ زندگی کے اصول واحکام، اخلاق وقانون کے مسائل، سیاست ومعیشت کے قواعد، غرض ہر پہلو سے اسلام کے ایک ایک اصول وقاعدے کو اپنے ایجاد کیے ہوئے فلسفے کی ترازو میں تولتے ہیں۔ اور یوں امتِ مسلمہ اور مذہب اسلام ہتھیار کے ساتھ ساتھ تہذیبی وفکری حملوں کی زد میں بھی ہے۔ عقائد کے باب میں اس نوعیت کی جنگ مسلمانوں کو ماضی میں بھی لڑنا پڑی تھی اور اس

جنگ میں ان کا ہتھیار یہی علم الکلام تھا۔ اب ہم نے اسی علم الکلام کی تاریخ کو پڑھنا ہوگا اور مذہب و فلسفے کے درمیان لڑی جانے والی اس جنگ کی داستان جاننا ہوگی اور وہیں سے معاصر تناظر میں اس پرانے اوزار (علم الکلام) کو جدید ضرورتوں سے لیس کرنا ہوگا۔

علم کلام کی تاریخ، ترتیب و تدوین اور اس علم کے پروان چڑھنے میں بنیادی رول ادا کرنے والے عوامل ومحرکات سمجھنے سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ اس کی حیثیت اور اس میں اشتغال کے بارے میں جو متضاد آراء پائی جاتی ہیں، ان میں تطبیق پیدا ہوگی۔ جن حضرات نے علم الکلام کو پروان چڑھانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، خود بھی پائے کے ''متکلمین'' بنے اور اس علم کے حصول پر زور دیا، ان کے ارشادات کا پس منظر کیا تھا اور ان کے خیال میں کن نتائج کا حصول مقصود تھا۔ اسی طرح جو حضرات اس علم کے حصول سے منع کرتے تھے ان کے ارشادات کا پس منظر کیا تھا اور وہ کس نوعیت کے علم کلام سے منع کرتے تھے۔ ان دونوں نقطہ ہائے نظر سے طلبہ کو اچھی طرح واقف ہونا چاہیے۔

آج بھی یہ ممکن ہے کہ علم الکلام کی تحصیل پر زور دینے والے حضرات کی نہج پر چل کر دورِ حاضر کی ضروریات کا احساس پیدا کیا جائے اور اُنہی کی محنتوں اور کاوشوں سے استفادہ کر کے علم کلام میں حذف و اضافہ اور اصلاح و تجدید کر کے اس دور کی ضروریات کی تکمیل کا سامان کیا جائے۔ عین اسی وقت میں علم الکلام سے منع کرنے والے حضرات کے ارشادات کو سامنے رکھ کر غیر ضروری مسائل اور اس دور میں یکسر نا قابل قبول پیچ در پیچ مقدمات اور غیر ضروری منطقی اور عقلی مقدمات سے بوجھل اسلوبِ تعبیر اور طریقۂ بیان ترک کیا جائے۔

II۔ عصرِ حاضر کے کلامی مسائل

قدیم علم کلام میں صرف عقائد اسلام کے متعلق بحث ہوتی تھی، جن کی نوعیت یا تو محض ان کو ثابت کرنے کی ہوتی تھی یا انہیں متزلزل کرنے کے لیے کیے جانے والے اعتراضات کے جوابات کی ہوتی تھی۔ کیونکہ اس زمانے میں مخالفین اسلام نے اسلام پر جو اعتراضات کیے تھے، وہ تمام عقائد ہی

کے متعلق تھے۔لیکن آج کل تاریخی، اخلاقی، تمدنی ہر حیثیت سے مذہب کو جانچا جاتا ہے۔ مذہبی عقائد پر بحث بہت محدود ہوگئی ہے۔ مثلاً مغرب میں مذہب اسلام کے جنت، جہنم، اور قیامت میں دوبارہ زندہ اٹھانے جانے والے عقائد کی بہ نسبت تعددِ نکاح، طلاق، غلامی اور جہاد جیسے اخلاقی اور قانونی عنوانات زیادہ موردِ الزام ہیں۔اس بناء پر علم کلام میں اس قسم کے مسائل سے بھی بحث کرنا لازمی ہے۔

طلبہ کو سمجھانا ہوگا کہ سب سے ضروری چیز دلائل اور براہین کو ایسے صاف اور سادہ پیرائے میں بیان کرنا ہے کہ زودفہم ہونے کے ساتھ ساتھ وہ دل میں اتر جائیں۔ قدیم طریقہ میں پیچ در پیچ مقدمات، منطقی اصطلاحات اور نہایت دقیق خیالات سے کام لیا جاتا تھا۔ اس طریقہ سے مخاطب مرعوب ہوکر خاموش اور لاجواب تو ہو جاتا تھا لیکن اس کے دل میں یقین اور وجدان کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی تھی۔

''علم العقائد والکلام'' کے بیشتر مباحث یونانی فلسفہ اور اس کے ساتھ ساتھ ایرانی، ہندی اور قبطی فلسفہ کے ساتھ ہمارے علمی تعارف کی پیداوار ہیں۔اور ہمارے ہاں اسے ''معقولات'' کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔لیکن اب ارتقائی مراحل نے خود اس فلسفہ کی ہیئت اور شکل وصورت بدل کر رکھ دی ہے۔مثلاً ماضی میں سائنس کو معقولات کا حصہ تصور کیا جاتا تھا اور وہ فلسفہ کا حصہ سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ ہمارے ہاں فلکیات اور طبیعیات کو معقولات ہی کے ایک حصے کے طور پر پڑھایا جاتا تھا۔لیکن اب ایک عرصے سے سائنس فلسفہ ومعقولات سے الگ ہوکر ایک مستقل علم کی شکل اختیار کرنے کے بعد مشاہدات ومحسوسات کے دائرے میں شامل ہوچکی ہے۔ درس نظامی کے نصاب کے باب میں اس تبدیلی کی عکاسی نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ فلسفہ اور سائنس کی علاحدگی کے باعث عقائد اور ان کی تعبیرات کے ضمن میں جو نئے سوالات پیدا ہوئے ہیں، ان کا جواب دینے کی سرے سے ضرورت ہی دینی حلقوں میں محسوس نہیں کی جاتی۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ فلسفہ اور سائنس کے پہلو بہ پہلو عمرانیات یعنی سوشیالوجی کا علم بہت سے سوالات لیے ہمارے سامنے کھڑا ہے۔ جدید تہذیب اور گلوبل سولائزیشن میں اس علم نے ترقی

کرتے کرتے آسمانی تعلیمات کی سی اہمیت حاصل کررکھی ہے۔آج کی انسانی سوسائٹی کے بیشتر مسائل اب اس کے حوالے سے طے ہوتے ہیں،مگر مسلم علماء نے بالعموم اس سے بے اعتنائی برتی ہے۔نتیجتاً ابن خلدون اور شاولی اللہؒ کے بعد اس درجہ کا کوئی اور عالم نظر نہیں آتا جس نے عمرانیات کو باقاعدہ موضوع بنا کر اس پر بحث کی ہو۔ایسے میں یہ بات عجیب نہیں لگنی چاہیے کہ ہماری نئی نسل کے ذہنوں میں عمرانیات اور سوسائٹی کے ارتقا کے حوالے سے سوالات اور شکوک کا ایک جنگل آباد ہے۔ ضرورت ہے کہ دینی حلقے اس صورتِ حال کا ادراک کرتے ہوئے ان سوالات کے جوابات پر توجہ دیں۔

اس ضمن میں عالمی افق پر گزشتہ تین صدیوں کے درمیان رونما ہونے والی علمی تبدیلیوں اور خاص طور پر فلسفہ،سائنس اور عمرانیات کی انسانی ذہنوں پر حکمرانی سے پیدا شدہ صورت حال میں ہمیں ''علم العقائد والکلام'' کے نصاب کا از سرِ نو جائزہ لینا ہوگا۔اس کا مطلب عقائد میں تبدیلی نہیں ہے بلکہ ان کی تعبیرات وتشریحات کے اسالیب اور ترجیحات کی از سرِنو تشکیل ہے۔ماضی میں جس طرح یونانی اور دیگر فلسفوں کی آمد پر مسلم علماء نے اپنے عقائد پر پوری دل جمعی کے ساتھ قائم رہتے ہوئے ان کی علمی،عقلی توجیہات وتعبیرات کا ایک نظام تشکیل دیا تھا اور اس طرح اپنے عقائد وایمانیات کے خلاف فلسفہ ومعقولات کی یلغار کا رخ موڑ دیا تھا۔آج بھی اسی کام کے احیاء کی ضرورت ہے۔درحقیقت عقائد وایمانیات کے باب میں جدید فلسفہ،سائنس اور عمرانیات کے پیدا کردہ مسائل اور مشکلات کسی اشعری،ماتریدی،ابن حزم،غزالی،ابن رشد،ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ کی تلاش میں ہیں جو ظاہر ہے کہ آج کے مدارس کی کوکھ سے جنم لیں گے۔

علمِ کلام کی تدریس کے حوالے سے بطور نمونہ عقائد و ایمانیات سے تعلق رکھنے والے چند سوالات کا ذکر مفید ہوگا جو آج کے علمی تناظر میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کے ذہنوں میں عام طور پر اٹھتے ہیں۔طلبہ کو ایسے سوالات کے قابل اطمینان جوابات فراہم کرنے کے لیے تیار کرنا اساتذہ کی اسی طرح کی ذمہ داری ہے جس طرح ابوالحسن اشعری اور ابومنصور ماتریدی نے اپنے دور کے علمی چیلنج کا

منطق واستدلال کے ساتھ سامنا کیا تھا:

- انسان کو جب نفع ونقصان کے ادراک کے لیے عقل دی گئی ہے تو پھر مذہب کی کیا ضرورت ہے؟
- وحی کی ماہیت کیا ہے؟ اور کیا یہ انسانی عقل ووجدان سے ہٹ کر کوئی الگ چیز ہے؟
- وحی اور عقل کا باہمی تعلق کیا ہے؟
- انسانی سوسائٹی جب مسلسل ارتقا کی طرف بڑھ رہی ہے تو نبوت کا دروازہ درمیان میں کیوں بند ہو گیا ہے؟
- سائنس اور مذہب کا باہمی تعلق کیا ہے؟
- مذاہب کی مشترکہ صداقتوں پر یکساں ایمان رکھنے اور ان کے مشترکہ مصالح پر مشتمل احکام پر عمل کرنے میں کیا حرج ہے اور کسی ایک مذہب کی پابندی کیوں ضروری ہے؟
- سوسائٹی کے ارتقا اور تجربات کی بنیاد پر تشکیل پانے والے افکار ونظریات اور تہذیب کو مسترد کرنے کا کیا جواز ہے؟
- قرآن وسنت کے معاشرتی احکام اس دور کی عرب ثقافت یا رواجات کے پس منظر میں تھے۔ کیا یہ اس سے مختلف ثقافتوں کے ماحول میں بھی واجب العمل ہیں؟
- احکام وقوانین میں مصالح ومنافع اور اہداف ومقاصد معتبر ہیں یا ظاہری ڈھانچہ بھی ضروری ہے؟
- اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خدا کا وجود بھی ہے یا نہیں؟ وغیر ذلک۔

اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ مسائل نئے نہیں ہیں، بلکہ ہر دور میں کسی نہ کسی عنوان سے زیرِ بحث رہے ہیں۔ لیکن آج کے عالمی تناظر اور مباحثہ ومکالمہ کی زبان میں یہ زیادہ ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ ایک مسلمان کو اسلامی اعتقادات وایمانیات کے معیار پر باقی رکھنے اور خود غیر مسلم کو اسلام کی تعلیمات پر مطمئن کرنے کے لیے ان سوالات اور ان جیسے دیگر بہت سے سوالات کے ایسے جوابات

ضروری ہیں جو آج کے علمی تناظر اور ہمہ نوع معلومات کے افق میں قابل اطمینان ہوں۔

III۔ فلسفۂ ملاحدہ اور مذاہبِ باطلہ کا رَد

مذہب اور فلسفے کی بنیادیں اور ان میں فرق

مسلمانوں کی تعلیمی روایت میں علم کلام اگرچہ ابتداء میں ایک مختصر اور سادہ علم تھا۔لیکن رفتہ رفتہ اس میں جو چیزیں اضافہ ہوتی گئیں اس کے لحاظ سے اب علم کلام دو چیزوں کے مجموعے کا نام ہے:

ا۔ اسلامی عقائد کا اثبات، اور ۲۔ فلسفۂ ملاحدہ اور مذاہبِ باطلہ کا رَد۔

جہاں تک پہلے حصے کا تعلق ہے امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (متوفی ۱۷۶۲ء) کے زمانے تک برعظیم پاک و ہند میں علم کلام میں جس قدر تصنیفات تھیں تقریباً وہ سب صرف اسی حصے سے متعلق تھیں۔ان میں وہ کتابیں بھی شامل ہیں جو اسلامی عقائد کی بعض ذیلی اور جزوی تفصیلات کے بارے میں خود مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا ہونے پر اپنی تائید اور ایک دوسرے کے خلاف لکھی گئی تھیں۔

ہمارے ہاں شاہ ولی اللہؒ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے عقائد کے علاوہ احکام شرعیہ کو بھی غور وفکر اور بحث کا موضوع بنایا اور اہل بدعت کی ان تمام باتوں کی قلعی کھولنے کی کوشش کی جو انہوں نے اسلامی احکام کو اپنی کوتاہ عقلی کے ترازو میں تولنے کے بعد کی تھیں۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ اُن سے پہلے برعظیم سے باہر بھی کسی نے احکام شرع کو عقلِ صحیح کے موافق ثابت نہیں کیا اور یہ کارنامہ انہیں کا تھا۔تحقیق یہ ہے کہ پہلے بھی متعدد اہلِ علم اس پر بہت کچھ لکھ چکے تھے اور ابن تیمیہ کا اس موضوع پر کلام بہت زیادہ ہے بلکہ ایک مبسوط تصنیف اسی موضوع پر انہوں نے لکھی ہے۔

عقائد سے متعلق بحثوں کے علاوہ عصرِ حاضر کی ضروریات میں اہم یہ ہیں کہ اولاً اسلام اور فلسفے کے تعلق کو واضح کیا جائے کیونکہ ملاحدہ کے یہاں سِرے سے مذہب کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ نیز ان

کے خیال کے مطابق اسلام کے بعض احکامات عقل صریح کے مخالف ہیں۔

دوسرا یہ کہ مذہب کی ضرورت تسلیم کرنے کے بعد کسی مذہب کے بارے میں درست یا غلط اور حق یا باطل کا تعین کیسے ہوگا؟ جانچنے کی کسوٹی کیا ہوگی؟ مذہبِ حق کی بنیادیں کیا ہوں گی؟ اور مذہبِ باطل کے کیا نشانات ہوں گے۔

اس ضمن میں بنیادی طور پر مندرجہ ذیل نکات زیر غور آنے چاہییں:

- اسلام اور فلسفے کا تعلق۔ کہ کیا اسلام پورے فلسفے کو رد کرتا ہے یا چند ضروری مسائل کی مذہبِ اسلام میں جگہ نہیں۔
- فلسفے کی اساس۔ کہ فلسفے کی بنیاد کن امور پر ہے اور اس کے کیا مفروضات و اصول ہیں۔
- فلسفے کا دائرہ بحث اور یہ کہ فلسفہ کن نتائج تک پہنچنے کی کوشش ہے۔
- مذہب کی تعریف اور حقیقت کی وضاحت۔
- مذہب کی بنیادیں۔
- انسانی فطرت اور مذہب (بالخصوص مذہبِ اسلام) کے درمیان تعلق کی وضاحت۔
- مذہب کا دائرہ بحث۔
- مذہب سے کن نتائج تک رسائی مطلوب ہے۔
- حق و باطل مذہب کے درمیان فرق۔
- مذہبِ حق اور مذہب باطل کے درمیان تفریق کا معیار کیا ہے اور یہ کہ مذہب حق کن خوبیوں کا حامل ہونا چاہیے، اور مذہب باطل کے کیا نشانات ہیں؟

اساتذہ کی تیاری کے لیے ان موضوعات پر بہترین مواد علامہ شبلی نعمانیؒ کی "**علم الکلام**" اور "**الکلام**"، اور مولانا مناظر احسن گیلانی کی "**الدین القیم**" میں ملے گا۔

عقل ونقل کا تعارض اور اسلام کا طریقۂ تعلیم

فلسفے اور فلسفہ زدہ ذہنیت کا مزاج یہ ہے کہ وہ ہر شے عقل کی کسوٹی پر جانچتا اور حتمی رائے قائم کرتا ہے۔ آج کل بھی مغربی فلسفہ اور مغربی عقل اسلام اور اسلامی احکام کے بارے میں یہی رویہ اختیار کرتی ہے۔ المیہ یہ ہے کہ وہ بھول جاتے ہیں کہ زیرِغور لائے جانے والے اسلامی احکام کس نوعیت کے ہیں۔ کیا وہ مغربی عقل و فلسفے اور سائنس کے دائرہ کار میں شامل اور دائرہ بحث میں داخل بھی ہیں یا نہیں۔ دوسرا اس بات کی بھی کوئی ضمانت نہیں کہ خود سائنس کی تحقیق حتمی اور مغربی عقل بلکہ عام انسانی عقل، عقلِ کل اور کامل ومکمل ہے کہ اس کے مطابق ہر چیز کو صحت وافادیت کی سند ملے اور اس کے مخالف ہر چیز ناقابل اعتبار ٹھہرے۔

ہم پہلے یہ تجویز عرض کر چکے ہیں کہ استاد کی ذمہ داری میں یہ شامل ہے کہ مادیت کے اس دور میں مذہب کی ضرورت اور دائرہ بحث کو واضح کرنے کے ساتھ مذہب حق کے معیارات بھی واضح کیے جائیں اور یہ بتایا جائے کہ اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو ان تمام معیارات پر پورا اترتا ہے۔ پھر اس کے بعد عقل اور سائنسی علوم کا دائرہ بحث واضح کیا جائے۔

یہ تفصیلات اور نکات اس قدر مفصل اور واضح ہونے چاہییں کہ مندرجہ ذیل اور اس نوعیت کے دیگر سوالات کے بارے میں صحیح جوابات اور مستحکم موقف طلبہ کے سامنے بالکل واضح ہو جائے:

- عقلی وسائنسی علوم کے بارے میں اسلام کا کیا موقف ہے؟
- کیا عقلی اور سائنسی علوم اسلامی احکام کی حقانیت کی دلیل اور معیار بن سکتے ہیں؟
- عقل کے ساتھ تعارض کی صورت میں کیا کوئی اسلامی حکم مشکوک یا ناقابل اعتبار قرار دیا جا سکتا ہے؟ یا وہ عقلی نتیجہ اور سائنسی تحقیق ہی غیر معتبر ہوگی؟
- عقل اور اسلام کے احکام کے درمیان تعلق کا کتنا لحاظ رکھا گیا؟

قریبی زمانے میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ان حوالوں

سے اسلامی احکام کو اپنی فکر اور تحقیق کا موضوع بنایا اور یہ ثابت کر دیا کہ اسلام میں کوئی حکم ایسا نہیں جو ''عقل صحیح''، یا ''عقل کامل'' کے خلاف ہو۔ اور اس مقصد کے لیے انہوں نے ایک عظیم کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' تالیف فرمائی۔۱

گلوبلائزیشن کا چیلنج اور علم کلام

جدید سائنسی تحقیقات نے نئی ایجادات کی بدولت مشرق و مغرب کے فاصلوں کو سمیٹ کر اور اقوام و اوطان کی آپس کی دوریوں کو ختم کر کے ایک گاؤں کی شکل میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ فاصلوں اور رابطوں میں بُعد ختم ہونے کے بعد انسانی زندگی میں انتہا درجے کی سرعت آئی ہے۔ اس چیز سے جہاں انسانی زندگی کو سہولتیں اور فوائد ملے ہیں وہاں تہذیبیں، ثقافتیں اور مذاہب خطرے میں بھی پڑ گئے ہیں۔ کیونکہ عالمی سطح پر مقتدر طاقتوں کی کوشش یہ ہے کہ دنیا کو گلوبلائز (یعنی جغرافیائی فاصلوں کو، اور ایک خطے کے لوگوں کو دوسرے خطے کے لوگوں کے بارے میں معلومات کی فراہمی میں تاخیر کو ختم) کر کے میڈیا اور ذرائع ابلاغ کی مدد سے اپنی ہی تہذیبی اور ثقافتی روایات، زندگی گزارنے کے ڈھنگ اور طریقے، اپنا ہی فلسفہ اور اچھے برے یا صحیح وغلط کے درمیان تمیز کے اپنے ہی معیارات ساری دنیا پر مسلط کیے جائیں۔ ایسی صورت حال میں کچھ مذاہب اور قومیں اقدامی حملے، جبکہ بعض دیگر اپنی روایات و اقدار کے تحفظ اور دفاع کی پوزیشن میں ہیں۔ اس کو جدید مفکرین ''تہذیبی ونظریاتی جنگ'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس جنگ میں مغرب کا ایک ہتھیار ''میڈیا'' ہے۔ اس سے وہ کئی طرح کے کام لیتا ہے۔ مثلاً اپنے نظریات، نشست و برخاست کے طور طریقے، زندگی گزارنے کے اصول و اہداف، اچھے برے یا غلط وصحیح کا اپنا معیار، اپنی روایات و اقدار کی لمحہ بہ لمحہ دنیا میں تشہیر، نیز اپنے مخالفوں کی ہر شئے کو انتہائی حد تک محدود کر کے ختم کرنا یا اس کی بری تصویر بنا کر اس تصویر کی تشہیر کرنا یا مساوات اور آزادی کے نام پر ہر شخص کو کسی بھی مذہب کے اصول وحدود سے باغی بنا کر شتر بے لگام کی طرح اضطراب و انتشار کی کیفیت میں مبتلا کرنا، یہ اور اسی طرح دیگر کئی طور طریقے ہیں جو مغرب اس تہذیبی ونظریاتی جنگ میں اپنا رہا ہے۔

دینی اداروں کے طلبہ اس جنگ میں اسلام اور امت مسلمہ کی اقدار و روایات کی حفاظت کرنے میں علم الکلام سے کیسے استفادہ کریں۔ اس سلسلے میں اولاً تو یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ تہذیبوں اور نظریوں کی اس جدید جنگ میں صدیوں قبل مرتب و مدون علم کلام سے استفادہ نسبتاً مشکل کام ہے۔ لہٰذا اولاً علم کلام میں اصلاح و تجدید کی ضرورت تسلیم کرکے تدریس کے لیے غیر ضروری اور پرانے موضوعات کے حذف اور جدید موضوعات کے اضافے کے ساتھ ایک ڈھانچہ تیار کیا جائے اور تدریسی عمل کو محنت و مشقت کے ساتھ اس نصابی ڈھانچے کے مطابق ڈھالا جائے۔ پھر طلبہ کو کم از کم پرنٹ میڈیا کے ذریعے اس میدان میں رول ادا کرنے پر آمادہ کرنا چاہیے۔ مدارس سے جرائد و مجلّات کا اجراء ایک خوش آئند امر ہے تاہم وقت کی ضروریات اور تقاضوں کے مطابق انہیں مزید مؤثر اور فعال بنانے کی ضرورت ہے۔

اساتذہ کرام کو چاہیے کہ طلبہ کو علمی وفکری موضوعات سے متعلق میڈیا پر تحریر و تقریر کی صلاحیت کے حصول پر آمادہ کریں اور انہیں اس قابل بنائیں کہ میڈیا پر چلنے والی براہ راست مغرب کی اسلام مخالف مہمات یا ہمارے اپنے ہی ناداں مغرب کے ہمنوا تبصرہ نگاروں، تجزیہ نگاروں اور لکھاریوں کے اعتراضات کا مثبت انداز میں ٹھوس علمی بنیادوں پر شائستہ علمی لہجے میں جواب دے سکیں اور ان کا راستہ روک سکیں۔ نیز اس ''مغربی میڈیا'' ہی کو ذاتی دلچسپی اور قابلیت کے ساتھ اسلامی ہدایات اور اقدار و روایات کو فروغ دینے کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

پرنٹ میڈیا کے ساتھ ساتھ اگر یہ مہم غیر متزلزل ایمان و ایقان اور راسخ عقیدہ اسلام کے ساتھ الیکٹرانک اور سوشل میڈیا تک پھیلائی جائے تو افادیت اور تاثیر میں کوئی شک نہیں۔ گلوبلائزیشن کے متعدد عناصر نے مذہب کے جامع اور محیط پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کو آسان بنا دیا ہے۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک عام انسان کو بھی یہ موقع ملا ہے کہ وہ ساری دنیا تک اپنے مذہب کی آفاقی اور کائناتی حقیقت پہنچا سکے۔ ایسے میں محض چند تنگ نظر اور تعصب زدہ لوگوں کو ذرائع ابلاغ پر قابض ہونے کا موقع دینے کے بجائے کیوں نہ ہم سب ایک کائناتی زاویہ نگاہ سے عالمی ذرائع ابلاغ کے ذریعے سے

اپنا نقطۂ نظر پیش کریں؟

طلبہ کو اس حقیقت کا ادراک کرایا جائے کہ یک مذہبی معاشروں کی جگہ اب کثیر مذہبی معاشرے نمو پذیر ہیں۔ گویا معاشرتی حقائق ہمیں اس پر مجبور کر رہے ہیں کہ ہم اپنے محدود رویوں سے نجات حاصل کر کے ایک ایسا عالمی رخ اختیار کریں جس میں دوسروں کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کیا جائے۔

قادیانیت کی تردید

قادیانیت کا فتنہ امت مسلمہ کے وجود کے لیے اور ہر مومن کے ایمان کے لیے ایک بہت بڑا دھچکا اور چیلنج ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ بہت بڑا احسان تھا کہ ملک کے طول وعرض میں تمام مسالک کے علماء کی متفقہ قیادت میں تمام مسلمانوں نے اس کا مقابلہ کیا اور آئینی اور قانونی راستوں سے اس کا راستہ روکنے کی کامیاب کوشش کی گئی۔

یہ باطل عقیدہ ایک طرف تو مسلمانوں کے ایک اہم ترین عقیدے ''عقیدۂ ختم نبوت'' سے تعلق رکھتا ہے، جو مسلمانوں کے لیے بہت حساس معاملہ ہے۔ دوسری طرف اس فتنے کا تعاقب آئینی اور قانونی طریقے سے کیا گیا اور ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کے اتفاق سے اس ٹولے کے خلاف قانون سازی کی گئی۔ اس طرح تمام سیاسی قائدین اور حکومت وقت اس سلسلے میں امت مسلمہ اور ''عقیدہ ختم نبوت'' کے تحفظ میں شریک ہوئے تھے۔ تاہم تمام تر شکست وریخت کے باوجود یہ سوچ آج بھی زندہ ہے اور کسی بھی وقت حملہ کرنے کے لیے چور دروازے کے کھلنے کا انتظار کر رہا ہے۔

اس فتنے سے خطرے کی شدّت اور ماضی کے اندر تمام مسلمانوں اور تمام مسالک کے علماء کی محنتوں اور کاوشوں کے پیش نظر دینی اداروں کا یہ فرض بنتا ہے کہ اپنے اسلاف واکابر کی کاوشوں اور جدوجہد کا یہ سلسلہ جاری رکھتے ہوئے نیز اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے تدریس میں اس فتنے کی سرکوبی کے لیے جگہ دیں اور اپنے طلبہ کو اس فریب اور اس کے خلاف اپنے علماء کی جدوجہد سے آگاہ کریں اور حتی الوسع اس بارے میں علمی ذخیرہ اور معلومات طلبہ کو فراہم کریں۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ یہ مذہب کلامی بحثوں پر بہت انحصار کرتا ہے۔

دین و دنیا کی تفریق کا تصور اور اس کا تنقیدی جائزہ

دین و دنیا کی تفریق کا تصور ہمارے روایتی دانشوروں کو اپنے مغربی اکابر سے ورثے میں ملا ہے۔ان کا خیال ہے کہ سائنسی علوم میں مغرب کی ترقی کا راز صرف اور صرف یہ ہے کہ اس نے مذہب کو ملک کے آئین و قانون،معیشت وتجارت،تعلیم وتربیت اور تمام منصوبوں اور پالیسیوں سے نکال کر خالص نجی اور ذاتی معاملہ قرار دیا ہے۔اسی طرح ان کا یہ بھی خیال ہے کہ مشرق یا امت مسلمہ کی پستی اور ناکامی کا واحد سبب ہر چیز پر مذہب کو فوقیت دینا اور ہر اقدام میں مذہب ہی کا اتباع کرنا ہے۔ چنانچہ ان کا دعویٰ ہے کہ مغرب کی طرح وطن عزیز میں بھی ریاست کے تمام اداروں اور چیلنجز کا مقابلہ کرنے اور کامیابیوں کی طرف سفر کے لیے مذہب کو نکال کر صرف مسجد کے در و دیوار تک محدود کیا جائے۔

مدارس کے اندر علم کلام کے طلبہ کے سامنے یہ بحث آنی چاہیے۔دین و دنیا کی تفریق کے اس تصور کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم ہونی چاہییں تا کہ وہ خود بھی سمجھیں اور دوسروں کو بھی سمجھا سکیں کہ یہ تصور کن مسلّمات اور مفروضوں پر قائم ہے۔خود ان مفروضوں کی حقیقت کیا ہے؟ کیا دینِ اسلام واقعی دنیوی ترقیوں میں رکاوٹ ہے؟ دین و دنیا کی تفریق سے انسانی زندگی پر کون سے نتائج مرتب ہوں گے؟ ہماری معاشرتی زندگی،تعلیمی نظام،معیشت وتجارت، آئین و قانون الغرض تمام پہلوؤں کو مذہب سے پاک کیا جائے تو یہ تمام امور جوں کے توں رہیں گے یا ان میں انحطاط یا ترقی رونما ہو گی؟ کیا مذہب اسلام ایک مثالی معاشرے اور کامیاب ریاست کا ضامن نہیں؟ کیا مغرب سائنسی علوم میں اس برق رفتار ترقی کے بعد بھی مذہب سے باغی ہو کر اپنے لوگوں کو اطمینان اور روحانی تسکین دے سکا ہے؟

الغرض اس تصور کے گرد اور بھی کئی طرح کے سوالات گردش کر رہے ہیں۔ان کے بارے میں ٹھوس بنیادوں پر مبنی علمی وفکری مباحث کا طلبہ کے سامنے آنا ضروری ہے۔تا کہ خود بھی ان کے بارے میں مطمئن ہوں اور عملی طور پر معاشرے میں نکل کر عام مسلمانوں کی بھرپور رہنمائی کر سکیں۔

علمِ کلام کی تدریس کا مؤثر طریقہ

علم کلام کے مؤثر طریقۂ تدریس کے بارے میں کچھ عرض کرنے سے پہلے یہ امر ضروری ہے کہ پہلے تدریسی مواد کا تعین کیا جائے۔ کیونکہ ہم پہلے یہ تجویز دے چکے ہیں کہ علم کلام کے سالہا سال سے رائج مباحث تک محدود و مقید رہنا کافی نہیں۔ عقائد کے علاوہ فکری، تہذیبی، سماجی و عمرانی اور اخلاقی و قانونی سرحدوں کا تحفظ بھی ضروری ہے۔ اس بناء پر علم کلام کے اس پرانے ڈھانچے میں حذف و اضافہ کر کے تدریسی لائحہ عمل طے کرنے کے لیے ایک جامع **خطة البحث** تشکیل دیا جائے۔

یہ کام ابتدا میں مدارس اپنی صوابدید پر کریں۔ اس طرح کہ کئی مدارس کے اساتذہ باہمی اشتراک اور مشاورت سے موضوعات و مسائل کا ایک نقشہ ترتیب دیں۔ اسی طرح انفرادی تجربے اور مشق کے بعد وفاق اور بورڈ کی سطح پر بھی یہ کام کیا جا سکتا ہے۔ اس بارے میں ہرگز یہ ضروری نہ سمجھا جائے کہ تمام موضوعات کو یکساں طور پر گہرائی اور تفصیلات کے ساتھ پڑھانے کا التزام کیا جائے۔ بلکہ بہتر یہ ہوگا کہ بنیادی موضوعات کی تو تدریس کی جائے اور کچھ دیگر مسائل کے بارے میں طلبہ سے تمرینی مضامین اور مختصر مقالہ جات لکھوائے جائیں۔ تاہم اس سلسلے میں استاد ہر مرحلے میں مزید تحقیق و مراجعت کے لیے طلبہ کو کتابوں، تحقیقی مجلّات و جرائد اور بحوث و مقالات کی نشاندہی کا اہتمام کریں اور یہ آگاہی فراہم کریں کہ حال میں کن اطراف پر کیا کام ہو رہا ہے اور مستقبل میں کون کون سے کام کرنے کے ہیں۔

یہ طریقہ ایک عرصے تک چلتے رہنے کے بعد وفاق اپنے زیرنگرانی ایک تدریسی کتاب بھی تیار کر سکتے ہیں۔ تاہم معاصر ضروریات کے پیش نظر حذف و اضافے اور اس علم کی افادیت کے لیے اصلاح و تجدید کی گنجائش اور مشاورت کا سلسلہ قائم رکھنا ہوگا۔

علم کلام کی تدریس کے لیے تیار ہونے والے خطة کا اولین اور بنیادی حصہ اسلامی عقائد کے متعلق ہوگا۔ اس بارے میں اکثر و بیشتر مدارس میں **شرح العقیدة الطحاوية** مقرر ہوتی ہے یا

بعض مدارس میں اس کے بجائے کوئی اور ایسی کتاب زیر تدریس رہتی ہے جو مذکورہ کتاب کی طرح غیر ضروری عقلی مباحث سے خالی، مغلق منطقی مقدمات سے عاری، آسان اور سادہ لفظوں اور سلیس ترتیب کے ساتھ اسلامی عقائد پر مشتمل ہوتی ہے، یہ امر خوش آئند ہے کہ طلبہ ایسی کتابوں کو پڑھ کر کم وقت میں بآسانی صحیح اسلامی عقیدے کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

جہاں تک عقلی، منطقی اور نسبتاً پیچیدہ کلامی مسائل کا تعلق ہے تو ان امور کی افادیت کا ایک پہلو اگرچہ یہ ضرور ہے کہ طلبہ ایسے مشکل اور عقلی مباحث کی مشق اور تمرین سے غور وفکر کی استعداد میں پختگی اور قدیم کتب کے فہم کی صلاحیت حاصل کرتے ہیں، لیکن اگر اس میں اس بات کا بھی لحاظ رکھا جائے کہ ایسے مشکل اور پیچیدہ مباحث کا دائرہ صرف آج کے ماحول میں مفید ثابت ہونے والے اور عصر حاضر سے مطابقت رکھنے والے مسائل تک محدود کر دیا جائے تو مذکورہ فوائد کے حصول کے ساتھ ساتھ دیگر ضروری مسائل کی بحث وتمحیص کے لیے وقت بچ جائے گا۔

گذشتہ سطور میں ہم نے جو چند جدید مباحث، مثلاً اخلاقیات، سماجیات اور عمرانیات وغیرہ کو شامل کرنے کی تجویز عرض کی ہے، تو اگرچہ یہ اپنے مزاج میں ایک بالکل نیا اقدام ہے۔ اس سلسلے میں، جیسا کہ عرض کیا گیا ہے، اولاً موضوعات کا تعین کر کے جامع خطہ بنایا جائے گا۔ تمام موضوعات کی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ہشت سالہ نصاب ہی میں تدریس ضروری نہیں۔ اس کے برعکس، جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ، جملہ موضوعات کو تقسیم کر کے کچھ تعلیمی اداروں میں زیر تدریس لائے جائیں اور کچھ طلبہ کے ذاتی مطالعہ اور تحقیق پر چھوڑ دیے جائیں۔ اسی طرح یہ تقسیم بھی ممکن ہے کہ بنیادی اور انتہائی ضروری مسائل کی مفصل تدریس کی جائے بقیہ مسائل کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کی جائیں اور ان کی تقابلی اور تفصیلی بحث وتحقیق کے لیے بعض بڑی جامعات میں قائم اداروں ''**قسم التخصص فی الدعوۃ و الارشاد**'' میں زیر تدریس لائے جائیں۔

......حواشی......

۱۔ اس بارے میں اساتذہ کرام کی تیاری کے لیے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی کتابیں بالخصوص **العقل و النقل**، مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تصانیف۔مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی **الدین القیم**، مولانا شبلی نعمانیؒ کی **علم الکلام** اور **الکلام** اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تصانیف بالخصوص **حجة الله البالغه** اور فلسفے اور مغربیت پر مضبوط نقد کے لیے مولانا مودودیؒ کی کتابیں بہترین مصادر و مراجع ہیں۔ڈاکٹر محمود احمد غازی کی بعض تصانیف بالخصوص اسلام اور مغرب تعلقات اور سید حسین نصر کی کتاب "Islam and the Plight of Modern Man"۔

حصہ سوم

مدرسہ کا ماحول

تصوف، تزکیہ وارشاد

مولانا محمد رفیق شنواری

تعلیم وتربیت کا اہتمام

تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوئے بغیر انسان کو معاشرے میں ایک نامکمل اور ادھورے پن کا احساس رہتا ہے۔ درحقیقت تعلیم ایک میٹھے پھل کی مانند ہے اور یہ انسان کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے۔ زندگی کو ایک خوبصورت اور حسین نکھار کے ساتھ خوابوں کی تعبیر صرف اور صرف تعلیم ہی فراہم کرسکتی ہے۔ اگر تعلیم کے ساتھ اچھی تربیت بھی ہو جائے تو فرد، معاشرہ، ملک وقوم کی ترقی کا اہم ترین ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ تعلیم انسان کو ایک وژن دیتی ہے اور تربیت اس کو عملی طور پر نافذ کرنے کا فن سکھاتی ہے۔ ماضی کے تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ معاشرہ یا ملک وقوم کی ترقی اور خوشحالی و پرسکون زندگی کا حصول اچھی تعلیم اور اچھی تربیت کے بغیر ناممکن ہے۔

مدارس کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کا انتظام بھی اسی اہتمام کے ساتھ کرتے ہیں جس اہتمام کے ساتھ تعلیم کا بندوبست کرتے ہیں۔ اساتذہ جس قدر طلبہ کی تعلیم کے بارے میں متفکر رہتے ہیں اسی قدر ہر طالب علم کے اخلاق، نشست و برخاست، رفتاروگفتار، وضع قطع، لباس، غیر نصابی سرگرمیاں، باہم میل جول، استاد کا ادب واحترام اور بزرگوں کی تعظیم وتکریم، ان سب امور کے بارے میں فکرمند اور جہاں ضروری محسوس کریں تو سختی کا رویہ بھی اختیار کرتے ہیں۔

تدریس کے اعلیٰ معیار کے حصول کا تقاضا ہے کہ مدارس اپنی اس روایت کو قائم رکھیں اور خیال رکھیں کہ وہ کبھی یہ خصوصیت کھونہ پائیں، اساتذہ اسے معمول کا معاملہ سمجھ کر سستی یا غفلت نہ برتیں۔

طلبہ کی تربیت کے ضمن میں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ انہیں اپنے ادارے کے طلبہ اور اساتذہ یا اپنے مسلک ہی کے اکابر کے دائرے سے نکل کر دوسرے مسلک کے اکابر و علماء کے احترام و تکریم کی بھی یکساں طور پر تربیت دی جائے۔ عوامی مجلسوں میں بے جا تنقیدی تبصروں اور ان کے بارے میں غیر ضروری سخت رویہ اختیار نہ کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ اس طرح واضح کرنا چاہیے کہ مسلکی تنوع تو ایک حقیقت ہے اور شاید یہ کبھی ختم نہ ہو، لیکن مسلکی تعصب کا اثر کم ہونا بھی ضروری ہے۔ اساتذہ کی ذمہ داری اصلاح و تربیت کے معاملے میں اس حد تک محدود نہیں کہ وہ طلبہ کو ایک مصلح و مرشد کے ساتھ تعلق قائم کر کے اپنی ذاتی اصلاح و تربیت کرانے کی طرف راغب کریں بلکہ ان کی ذمہ داریوں میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ طلبہ کے اخلاق و اقدار، سلوک اور رویوں کو اس قدر پُر کشش بنائیں کہ وہ اپنی ذات کی حد تک یا معتقدین اور ہم مسلکوں کی حد تک محدود نہ ہو، بلکہ معاشرے کا کوئی بھی فرد اُن سے استفادے میں مسلک کی غیریت کو حجاب نہ سمجھے، اور نہ ان کی غیر ضروری شدّت پسندی اور بے رخی اس باب میں رکاوٹ ہو۔

تزکیہ واحسان اور اس کی اہمیت

اساتذہ کو دوران تدریس اس بات کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے کہ اصلاحِ نفس، تزکیہ باطن اور علم الاحسان کی اہمیت طلبہ پر مخفی نہ رہے اور ایسا نہ ہو کہ طلبہ اس کو معمول کی ایک سرگرمی سمجھ کر اس سے دور رہنے لگیں۔ بلکہ اس امر کا خاص طور پر خیال رکھا جانا چاہیے کہ ہر طالب علم اپنے تعلیمی مشاغل کے ساتھ ساتھ کچھ وقت نکال کر روحانی تربیت کے لیے اساتذہ تصوف سے کسبِ فیض کریں، کیونکہ تصوف کا موضوع انسان کا نفس اور دل ہے۔ نبی کریم ﷺ کی متعدد ایسی حدیثیں ہیں جو نفس اور دل کی اصلاح پر بالخصوص توجہ دلا رہی ہیں۔ یہی دل پورے جسم انسانی کا بادشاہ ہونے کی حیثیت سے تمام اعضاء کو احکامِ الٰہیہ کا مطیع و تابع فرماں بنا دیتا ہے۔ دوسرا یہ کہ تصوف و احسان خود ان احکام اور تعلیمات پر مشتمل ہے جو مستقل طور پر دین کا حصہ ہیں۔ بخل، تکبر، حسد اور عجب جیسی بیماریوں سے نجات اور اچھے اخلاق، تواضع و انکساری، اللہ تعالیٰ اور رسولِ خدا ﷺ کی محبت جیسی خصالِ حمیدہ کا

حصول شریعت کے احکام ہیں۔اس لیے ہمہ وقت توجہ دینی چاہیے کہ ظاہری علوم اور مباحث میں منہمک ہوکر کہیں ان احکام شرعیہ سے غفلت نہ ہو جائے۔

اس جانب اساتذہ کئی طریقوں سے توجہ دلا سکتے ہیں۔ایک طریقہ عام طور پر مدارس میں رائج ہے کہ ہفتہ وار یا ہفتے میں دو یا تین دن اصلاحی بیانات کا سلسلہ قائم کیا جاتا ہے۔اس طریقے کو نہ صرف اہتمام کے ساتھ جاری رکھا جائے بلکہ جس حد تک بھی ممکن ہو اساتذہ خود بھی اس کی اہمیت اور طلبہ کی تعلیم اوران کی دلچسپی بڑھانے کے لیےان میں شرکت کریں۔

اسی کی ایک نوعیت یہ ہے کہ مدرسے میں ایک بزرگ عالم اور شیخ کو بطور خصوصی مہمان بلایا جاتا ہےاور تمام طلبہ اوراساتذہ کی حاضری میں وعظ ونصیحت اورارشادات کی محفل منعقد ہوتی ہے۔اس کا بھی طلبہ کے دلوں پر بڑا اچھا اثر ہوتا ہےاوراس بلائے گئے عالم یا شیخ کی شخصیت سے متاثر ہوکر بسا اوقات ان کے اخلاق واطوار اور خصالِ حمیدہ کو طالب علم اپنے اندر منتقل کرنے کی کوشش شروع کرتا ہے۔

تدریس کے دوران ایک مؤثر طریقہ یہ بھی ہے کہ قرآن کریم اوراحادیث نبویہ کا وہ حصہ جو وعظ ونصیحت، جنت وجہنم کی یاد، ترغیب وترہیب اور حب اللہ اور حبِ رسولؐ وغیرہ پر مشتمل ہے،اس حصے کو اساتذہ اپنے تجربات، اسلاف کی ریاضتوں کے واقعات اوران کے تجربات کی تشریح کے ساتھ پڑھائیں۔طلبہ کے ذہنوں میں اس حصے کے فنی، تحقیقی اوراختلافی مباحث سے خالی ہونے اورامتحان کا حصہ نہ ہونے کی بناء پر زیادہ اعتنانہ کرنے کا احساس پیدا نہ ہونے دیں۔

طلبہ کو اپنی اصلاح پر آمادہ کرنا اور دوسروں کو اصلاح کی فکر دلانے کا اہتمام ایک پسندیدہ عمل ہے۔یہ بھی ضروری ہے کہ دوسروں کی اصلاح پر زور اوراپنے آپ کو بھول جانے کے رویے سے بچنے کے لیے بھی طلبہ کو متوجہ کیا جاتا رہے، کہ یہی قرآنی تعلیم ہے۔

فرداور معاشرے کی اصلاح میں تصوف کا کردار

عملِ تدریس میں اساتذہ کے سامنے ایک اوراہم پہلو بھی بار بار بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ نبی کریم ﷺ کا دیگرانبیاء کے ساتھ ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ سابقہ انبیاء مخصوص افراد یا کسی خاص

قوم یا معاشرے کے افراد کی اصلاح کے لیے بھیجے جاتے تھے، جبکہ ہمارے نبی ﷺ کی نبوت ورسالت تمام انسانوں اور قیامت تک قائم ہونے والے ان گنت معاشروں اور اقوام کے لیے ہے۔ فرد، خاندان، معاشرہ اور پوری انسانیت کے لیے دنیا وآخرت میں فلاح ونجات کا سامان فراہم کرنا آپؐ کا مشن تھا۔ اس عالمی اور آفاقی ذمہ داری میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ ان ہی کی طرف سے قرار دیے جانے والے ورثا اور ان کی صف میں شامل ہونے والے طلبہ بھی شامل ہیں۔

انسانیت کو مادیت آلودہ، اضطراب اور بے چینی سے پُر معاشرے میں قلب وذہن کی طمانیت اور روح کی تسکین کی ضرورت ہے۔ اور یہ طے ہے کہ یہ نعمت نہ تو مغرب کی مادیت میں ہے اور نہ خشک علمی تحقیقات اور مباحثوں میں، بلکہ یہ نعمت اپنے خالق کے ساتھ دائمی تعلق اور استوار رشتے میں ہے۔ جس طرح قرآن کریم واضح چیلنج دے کر کہتا ہے۔ ''الا بذکر اللّٰہ تطمئن القلوب'' (خبردار! صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ملتا ہے)۔

علوم دینیہ کی تعلیم وتدریس کے ذریعے اگر طلبہ کو غور وفکر کی یہ صلاحیت دی جاتی ہے تو اصلاحِ باطن اور تزکیۂ اخلاق کے ذریعہ فکر کی پاکیزگی اور مزاج وطبیعت میں صفائی اور طہارت حاصل ہوتی ہے۔ ایسے نیک سیرت، پاک باطن اور ذی استعداد طلبہ اگر معاشرے میں آئیں گے تو تقویٰ، طہارت اور علم وفہم کی مہکتی خوشبو کو سونگھتے ہی معاشرے کے تمام افراد کو اپنے قلب ودماغ کے اطمینان اور روح کی تسکین کی متاع، جس کے ڈھونڈنے میں وہ حیران وسرگرداں ہیں، کا سراغ انہی فضلا کے ہاں ملے گا اور اللہ تعالیٰ ہی کی یاد پر مبنی اس تعلق اور پھر بھٹکتی انسانیت کا اپنے رب سے رشتہ قائم ہونے پر خیر وبرکتوں کے دروازے کھلیں گے اور یوں ملک وملت اور معاشرے میں اخوت ومحبت اور استحکام پیدا ہوگا۔

لہٰذا اساتذہ اس بات کا ضرور خیال کریں کہ ہر طالبِ علم اور فاضل مدرسہ سے نکلتے ہوئے تصوف اور اصلاح وارشاد کی ہدایات لے کر نکلے۔ کیونکہ تصوف دلوں پر اللہ کا رنگ چڑھانے کی تحریک ہے۔ تاریخ صوفیاء اور درویشوں کی دل پذیر باتوں کی بدولت اسلام میں داخل ہونے والے لوگوں

کے واقعات سے بھری پڑی ہے اور آج معاشرہ جس اضطراب و بے چینی کی کیفیت میں مبتلا ہے، تصوف، اصلاح وارشاد اور تزکیہ واحسان کی مہم ہی میں اس کا علاج ہے۔

تصوف کے بارے میں چند بنیادی معلومات

مصدر وماخذ

مستشرقین کا اسلامی علوم میں بحث وتحقیق کا ایک مخصوص طریقۂ کار ہے۔ وہ پوری اسلامی تاریخ میں جھانک کر یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام کے ابتدائی دور سے لے کر جب اس علم یا فن کی داغ بیل ڈالی گئی، اس کی مرحلہ بہ مرحلہ ترتیب وتدوین کس طرح ہوئی اور مختلف مراحل سے ہوتا ہوا آج کی حتمی شکل تک یہ کیسے پہنچا۔ اس تسلسل میں ان کا موضوع تصوف بھی ہے اور وہ تاریخ میں جا کر یہ ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں کہ تصوف کیسے پیدا ہوا اور کن کن مراحل سے ہوتا ہوا ایک مستقل علم کی شکل اختیار کر گیا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے اوائل سے لے کر آج تک انہوں نے ''تاریخی حقائق'' کی روشنی میں تصوف کے مصدر وماخذ کے بارے میں طرح طرح کے نظریات اختراع کیے۔ کوئی کہتا ہے کہ تصوف کا مصدر ''مجوسیت'' ہے کہ مجوسیوں کی بعض عادات مسلمانوں میں در آئیں اور وہ رفتہ رفتہ صوفیاء کی عادات اور پھر بالعموم مسلمانوں کے اندر بھی اچھی خصلتیں شمار ہونے لگیں۔ کوئی کہتا ہے کہ صوفیاء زہد اور ریاضتوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے پیروؤں سے زیادہ مشابہت رکھتے ہیں اور یہ انہی کی تعلیمات اور سنتیں ہیں اس لیے تصوف دراصل عیسائیت کی مرہون منت ہے۔

مستشرقین کے انداز بیان اور چرب لسانی کا حلقۂ اثر مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور دانشور حضرات میں بھی پھیلتا جا رہا ہے اس تناظر میں ضرورت ہے کہ دینی مدارس کے علماء اور طلبہ اس جانب توجہ دیں اور مستشرقین کے من گھڑت ''تاریخی حقائق'' سے پردہ اٹھا کر حقیقی تصوف اور اس کے بنیادی اصول وقواعد کو واضح کر کے کتاب وسنت ہی میں اس کی اصل اساسات اور بنیادیں تلاش کر کے واضح کریں۔ نبی کریم ﷺ کی وہ تمام احادیث، صحابہ وتابعین کے وہ سارے آثار واخبار اور وہ تمام

سنتیں نکال کر سامنے رکھیں جن پر صوفیاء کے طرزِ عمل اور ''صحیح تصوف'' کی بنیاد کھڑی ہے۔ نیز مجوسیوں اور عیسائیوں کی وہ روایات اپنی اصل شکل میں سامنے لے آئیں جو مستشرقین کی جانب سے پیش کی جاتی ہیں، تاکہ تصوف کی تعلیمات اور ان میں فرق نمایاں ہو۔ ۱

اصلاحِ نفس اور طریق الی اللہ کے مختلف مراحل

ہر انسان کا فرض اور اس کی تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ وہ ایمان و عمل کے ذریعے اپنے خالق کے قریب سے قریب تر ہوتا جائے۔ اپنے رب سے دور کر دینے والی تمام حرکات و سکنات سے دور رہے اور رب کائنات کے حضور میں قریب لانے والے تمام اقوال و اعمال کو اختیار کرے۔ دوسری طرف یہ حقیقت بھی معلوم ہے کہ اپنے رب کا قرب کوئی حسی قرب نہیں کہ پیروں سے چل کر حاصل کیا جائے۔ بلکہ یہ معنوی اور روح کا سفر ہے۔ اسی طرح یہ بھی طے ہے کہ انسان کے معنویات (نفسیات) اور روح تصوف ہی کا موضوع ہے۔ انسانی نفسیات اور قلب و روح کو وحی کی تعلیمات میں ڈھالنا صوفیاء ہی کا مشغلہ ہے۔ وہ اس کام کے اصول و آداب، طور طریقے اور مراحل جن میں یہ کام سرانجام دیا جاتا ہے، ان سے واقف ہیں۔ اس مبارک سفر کا نقطۂ آغاز کیا ہے؟ مسلسل آگے بڑھتے رہنے کے لیے کیا آداب و شرائط ہیں؟ یہ صوفیاء کا کام اور دن رات کا مشغلہ اور زندگی کا محور و مقصد ہے۔

یہ سفر ان کے ہاں مختلف مراحل میں تقسیم ہے۔ اصلاحِ نفس اور گناہوں سے تزکیے سے شروع ہو کر اپنے منتہیٰ کی طرف بڑھتا رہتا ہے۔ آغاز میں کن شرائط و آداب کا لحاظ کرنا ہوگا، کن خصلتوں سے دور رہنا اور کن معمولات کو اختیار کرنا ہوگا یہ ساری تعلیمات تصوف کے ابواب ہیں۔ صوفیاء کے تصورات و نظریات اور تجربات ان کی تکمیل ہیں۔

اس کام کی اہمیت اور صوفیاء کے زندگی بھر کے تصورات و تجربات سے استفادے کی خاطر طلبہ کو اس کی تفصیلات سے آگاہی ضروری ہے۔ اس بارے میں ان کی فکر سازی اور عملی زندگی پر اثرات ڈالنے کے لیے تدریس کا فریضہ سرانجام دینے والے معلمین کی خصوصی توجہ ناگزیر ہے۔ ۲

صوفیاء کی اصطلاحات سے آگاہی

جس طرح کسی استاد کی راہنمائی اور کہنہ مشق ماہر اور حاذق کی تربیت کے بغیر اور محض ذاتی مطالعہ اور اپنی ہی تحقیق پر مبنی علم ادھورا، غلطیوں اور مسامحات سے قریب تر ہوتا ہے اسی طرح کسی اللہ والے کی صحبت سے یکسر مستغنی ہو کر اور اپنے ذاتی مطالعے پر بالکلیہ اعتماد کر کے محض تصوف کی کتابوں سے کام چلانے کا رویہ اختیار کیا جائے تو اس میں اصلاح کے ساتھ ساتھ خطا کے امکانات بھی برابر ہوں گے۔ اس لیے ضروری ہے کہ کسی اللہ والے کی تربیت حاصل کی جائے اور ان سے تعلیم و تربیت کا مسلسل سلسلہ قائم رکھا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ صوفیاء کی کتابوں، ان کے تصورات و نظریات اور کتابوں اور مکتوبات میں درج تعلیمات و تجربات سے بھی استفادہ کیا جائے۔

یہ تعلیم دیتے وقت اساتذہ اس پہلو کی طرف بھی طلبہ کی توجہ مبذول کرائیں کہ اس بارے میں بھرپور استفادے اور صحیح اور مکمل فہم کے لیے ان اصطلاحات اور الفاظ و کنایات سے آگہی ضروری ہے جو علم التصوف میں صوفیاء کے ہاں رائج اور مستعمل ہیں۔ چنانچہ تصوف کے مختلف سلسلوں اور ان کے معروف ائمہ صوفیاء میں ہر ایک کا طریقۂ کار، اذکار و معمولات کا اپنا اپنا طریقہ اور پھر ہر ایک کے ہاں رائج اصطلاحات وغیرہ، ان سب امور کا تعارف کرایا جائے۔ ان سب طرق اور سلاسل کا مقصد اور غرض و غایت میں متحد ہونے کے ساتھ ساتھ صرف طریقۂ کار میں اختلاف اور ان میں جوہری فرق بھی واضح کرایا جائے۔ ظاہر ہے کہ ان سب امور پر مخصوص اصطلاحات کا بڑا اثر ہے۔ ان مصطلحات کا مفہوم سمجھے بغیر ان سب طرق اور سلاسل کی روح اور حقیقت تک رسائی مشکل ہے۔

شیخ اور مرید کے آداب

مسلمانوں کی تعلیمی روایت کے حوالہ سے ایک جملہ مشہور ہے کہ ''**العلم کلہ ادب**'' کہ علم سراسر ادب ہی ہے۔ یعنی تحصیل علم میں وہ طالب علم اپنا سینہ علم کے نور سے منور کر سکتا ہے جو علم، استاد اور درس گاہ غرض تعلیم و تعلم سے جڑی سب چیزوں کے احترام و ادب کا پاس رکھے۔ ادب سے عاری

شخص اگر چہ وقتی طور پر تو اپنی فطری صلاحیت کے بل بوتے پر امتحان ہال یا کمرۂ جماعت کے ماحول میں اپنی برتری ثابت کر سکے گا لیکن علم کی روشنی لے کر معاشرے میں راہنمائی کا کردار ادا کرنے میں کامیاب نہ ہوگا۔ تصوف بھی ایک علم ہے اور شاید خالص تصورات و نظریات پر مبنی نہ ہونے کے بجائے اصلاح و احسان کا علم ہونے پر دیگر علوم کی بہ نسبت آداب کا بطریقۂ اشد متقاضی ہے۔ ادب و احترام میں مدارس بے مثال تاریخ اور کردار رکھتے ہیں۔ اساتذہ سے یہ توقع غلط نہیں ہے کہ اپنا یہ کردار اور بے مثال تاریخ اپنے اسلاف و اکابر کے تجربات اور واقعات کی روشنی میں جدید نسل کو منتقل کرنے کا اہتمام ہو۔ ایسا نہ ہو کہ اساتذہ کی طرف سے خاطر خواہ توجہ نہ دینے کی وجہ سے طلبہ اس پہلو کو غیر ضروری سمجھنے لگیں اور یوں اپنے اسلاف اور اپنی بے مثال تاریخ سے سلسلہ ٹوٹ جانے سے انہیں محرومیوں کا سامنا ہو۔

لہٰذا اساتذہ کو توجہ دینی چاہیے کہ تعلیمی اور تدریسی ماحول میں حصولِ علم کے آداب و شرائط پورا کرنے کے ساتھ ساتھ تزکیۂ نفس اور اصلاح و ارشاد کے مراحل میں بھی طلبہ خود کو ان تمام آداب و شرائط کا پابند بنائیں جن کی صوفیاء کی طرف سے مکمل اہتمام سے تلقین کی جاتی ہے۔ تب اصلاح و ارشاد کی یہ مہم اپنی منزل کی طرف بڑھتی رہے گی اور مقصد کا حصول قریب سے قریب تر ہوتا جائے گا۔

تصوف، باطل نظریات و غلط رسومات اور اعتراضات

اسلامی تاریخ میں دین کی تبلیغ و اشاعت اور احیاء کے معاملے میں جتنا دور اندیش طبقہ صوفیاء کا رہا ہے، اتنا کوئی اور نہیں۔ تجدید و احیاء دین کی جتنی بھی تحریکیں اٹھیں اور کامیابی کی طرف بڑھتی رہیں ان میں تصوف اور صوفیاء کا کردار نمایاں رہا۔ لیکن یہ ایک فطری امر ہے کہ پورے ڈھانچے میں جو عضو زیادہ مرکزی اور فعال کردار ادا کرتا ہے اس کو خطرات بھی زیادہ لاحق ہوتے ہیں اور خطرے سے متاثر ہو کر پھر اس ڈھانچے کا پورا نظام متاثر کرتے ہیں۔ کچھ یہی معاملہ صوفیاء کا بھی ہے کیونکہ اگر معاشرے میں ایک طرف انسانیت کو حقیقی زندگی سے متعارف کرنے والے صوفیاء ہیں تو دوسری طرف انسانیت سے عقل و خرد چھین کر ان سے کھیلنے والے افراد بھی نام نہاد 'صوفیاء' رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر تصوف

پر آج کے مستشرقین علمی اورنظریاتی قسم کے اعتراضات کررہے ہیں تو اسلامی تاریخ میں ابن تیمیہ جیسے اکابر علماء نے نام نہاد صوفیاء کے کرداراور حقیقی تصوف میں درآنے والے فلسفیانہ قسم کے غلط نظریات اورواضح اسلامی تعلیمات سے متصادم تصورات کو دیکھ کر تصوف پر تنقید کی۔

اس تناظر میں طلبہ کو بنیادی طور پر دو باتیں سمجھانے کی ضرورت ہے۔ایک تو اسلامی تعلیمات سے متصادم تصورات ونظریات سے حقیقی اوراسلام کے صحیح اورٹھوس بنیادوں پر مرتب تصوف کو چھان کر طلبہ کے سامنے رکھیں۔وہ غلط رسومات جن کی اسلام میں کوئی جگہ نہیں اورتصوف اورصوفیاء کے کردار پر بدنما داغ کی طرح دکھائی رہے ہیں،ان کی نشاندہی کریں۔

دوسرا یہ کہ تاریخ میں جو بعض علماء صوفیاء پر تنقید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ان واقعات کے اصل حقائق طلبہ کے سامنے لائے جائیں۔تنقید کی بنیادوں اوراسباب کے ساتھ ساتھ تنقید کی نوعیت بھی بتلائی جائے اور یہ واضح کیا جائے کہ کیا وہ تنقید محض ایک خاص پہلو یا مخصوص باتوں اورنظریات پر تھی یا تصوف کے پورے نظام اورعلم پر؟

تاریخِ تصوف: معروف صوفیاء کی خدمات

مستشرقین کا ایک دلچسپ موضوع، جیسا کہ پہلے بھی بتلایا گیا ہے، اسلامی علوم کی تاریخ اور ترتیب وتدوین کے مراحل جاننا بھی ہے۔چنانچہ اس سلسلے میں انہوں نے تصوف کی تاریخ کو بھی اپنی تحقیق اورغوروخوض کا موضوع بنایا ہے اوراس ضمن مختلف اشکالات اوراعتراضات اٹھائے ہیں۔ تصوف جیسے مبارک اسلامی اور دینی علم، بلکہ جسے تمام دینی علوم کا جوہر کہا جاسکتا ہے، سے تحریک استشراق کے گردوغبار جھاڑنے اور ہمارے اسلاف اور ہماری تاریخ میں ہمارے لیے پنہاں دروس و عبرتک رسائی کی خاطر ہمیں بھی اس علم کی تاریخ سے اعتناء کرنا چاہیے۔اس سلسلے میں اولین اورقائدانہ ذمہ داری علماء ہی کی طرف لوٹتی ہے اورانہیں معاشرے میں موجودعوام بلکہ اس سے کئی گنا بڑھ کر اپنے تلامذہ کو اس اہم کام کی طرف راغب اوران کے لیے بنیادی معلومات فراہم کرنی چاہیے۔تصوف کی تاریخ پڑھنے کا جہاں ایک مقصد مستشرقین کے الزامات اور بہتانوں کا جواب ہوگا وہاں تصوف کی

معرفت، تاریخ کے ہر مشکل مرحلے میں صوفیاء کے کردار سے آگاہی، تصوف کی معرفت میں ان کے نظریات وتجربات اور مشاہدات سے استفادہ اوران کی تصانیف، خدمات اور مکتوبات وارشادات سے اصلاح وتزکیہ کی مہم میں اکتساب فیض بھی کرنا ہوگا۔

اس سلسلے میں اساتذہ اپنے طلبہ کوعہد بہ عہد تاریخ تصوف اور معروف صوفیاء کی حیات وخدمات اوران کے نظریات اور تصانیف کا بنیادی تعارف پیش کریں۔ یہاں برسبیلِ مثال کسی خاص ترتیب کے بغیر کچھ صوفیاء اور چند ایک مصادر کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے۔

امام غزالیؒ

تصوف کی دنیا میں امام غزالی کے نام سے کون واقف نہیں ہوگا۔ تصوف کا ہر استاد اور طالب علم امام کے احسانات کا مرہون ہے۔ اساتذہ امام غزالی کی حیات وخدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے تصوف میں ان کی خدمات اور نظریات وتصورات کا تعارف پیش کریں۔ نیز تصوف میں امام کی تصانیف کا تعارف اور طریقۂ استفادہ بھی بتلائیں۔ مثلاً امام کی مشہور ومعروف کتاب ''احیاء علوم الدین'' وغیرہ کی اہمیت طلبہ کو بتلائیں کہ مسلمان علماء نے اس کتاب کی کتنی خدمت کی ہے۔ کئی کئی جلدوں میں اس کی شروح لکھی ہیں۔ تخریج احادیث کا اہتمام کیا گیا اور ہر عالم نے اپنے طلبہ کواس کتاب سے کسبِ فیض اور دقت نظر سے پڑھنے کی تلقین کی ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے تصوف کے ذریعے برعظیم کے مسلمانوں کی اصلاح میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ انہوں نے تصوف کے باب میں کیا احسانات مسلمانوں پر چھوڑے ہیں۔ ایک مختصر تعارفی شذرہ مولانا عبید اللہ سندھی کے قلم سے ملاحظہ ہو۔ مولانا سندھی شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی کتاب ''همعات'' کے اردو ترجمہ ''تصوف کی حقیقت اوراس کا فلسفۂ تاریخ'' کے ابتدائی کلمات میں رقم طراز ہیں:

’’حضرت امام ولی اللہ نے سلوک پر چند کتابیں لکھی ہیں۔ چنانچہ وہ اذکار اور آداب جو ایک سالک کو سب سے پہلے کرنے چاہییں ’’القول الجمیل‘‘ میں ذکر فرماتے ہیں، ایک ترقی یافتہ دماغ کو سلوک کا منتہٰی یعنی نوع انسانی کے موطن حظیرۃ القدس سے اتصال سمجھانے کے لیے آپ نے ’’سطعات‘‘ تحریر فرمائی ہے۔

انسان کی اندرونی نفسی قوتوں یعنی ارادہ اور تدبیر نفس پر سلوک کا کیا اثر پڑتا ہے اور ایک قوت دوسری قوت سے کس طرح پھوٹ کر نکلتی ہے اس کا بیان آپ نے ’’الطاف القدس‘‘ میں کیا ہے۔ راہِ سلوک کے جو بڑے سالک گزرے ہیں ان میں سے ابتدائی دور میں حضرت جنید بغدادی اور بایزید بسطامی (رحمہما اللہ تعالیٰ) ہیں اور آخری دور میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی، حضرت معین الدین چشتی اور حضرت بہاء الدین نقشبندی (رحمہم اللہ تعالیٰ) بہت بڑے بزرگ ہیں۔ انہوں نے سلوک کو کس طرح مرتب کیا اور ان کی صحبت سے کامل کس طرح پیدا ہوئے؟ یہ تاریخ حکمت کا ایک مستقل باب ہے۔ جسے امام الائمہ حضرت امام ولی اللہ نے زیرِ نظر رسالہ ’’ہمعات‘‘ میں ضبط فرمایا ہے، اسے تصوف کا فلسفۂ تاریخ سمجھنا چاہیے۔

آگے انسانیت اس فکر کو عقلی درجے پر کس طرح قبول کرے گی؟ پرانے یونانی اور ہندی حکماء انسانیت کے متعلق کیا خیالات رکھتے تھے؟ وہ اپنے خیالات کو انسان کے عام معارف کے ساتھ کس حد تک موافق بنا سکے۔ اور ایک حکیم ان کو تسلیم کر کے اپنے سلوک کو کس طرح معقول طور پر پیش کرتا ہے۔ اس کے لیے آپ نے ’’لمعات‘‘ لکھی۔[۳] آپ کے پوتے محمد اسماعیل شہید نے ان رسالوں کی تمہید ’’العبقات‘‘ کے نام سے لکھی ہے۔

اگر ان پانچوں رسالوں کو تھوڑی سی محنت کر کے غور سے پڑھ لیا جائے تو امام ولی اللہ کا سکھایا ہوا طریقِ سلوک اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ حکمت ولی الٰہی میں یہ رسالے ابتدائی قاعدوں کے طور پر پڑھائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد امام ولی اللہ کی حکمت کی تعلیم شروع کی جاتی ہے۔‘‘

حضرت مجدّد الف ثانیؒ

حضرت مجدّد الف ثانیؒ کی شخصیت، کارناموں اور مآثر و خدمات سے تصوف کی دنیا کا ہر فرد واقف ہے۔ ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری اپنی کتاب ''تصوف اور شریعت، مجدد الف ثانی کے افکار کا مطالعہ'' میں لکھتے ہیں:

''شیخ مجدد کا دور ہندوستان میں اسلام کی زبوں حالی کا دور تھا۔ اس کے تین بڑے اسباب تھے۔ پہلا سبب وہ رویہ تھا جو مذہب اور خاص طور پر اسلام کے سلسلے میں اکبر نے اپنے عہد میں اور اس کے جانشین جہانگیر نے اپنے عہد کے ابتدائی حصے میں اپنایا۔ دوسرا امراء کے حلقے میں مذہب بیزار اور اہل سنت مخالف عناصر کا غلبہ تھا۔ اور تیسرا تصوف کے حلقوں میں غلط افکار اور خلاف سنت طریقوں کی اشاعت تھا۔ اس کی وجہ سے مسلم عوام میں شرک و بدعت اور دوسرے مفاسد بری طرح پھیل رہے تھے۔ شیخ مجدد نے پہلی دو خرابیوں کے ازالے کے سلسلے میں جو کارنامہ انجام دیا اس سے دنیا واقف ہے۔ ہم نے پہلے باب میں اس پر اختصار کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ تیسرے محاذ پر جو کام شیخ نے کیا وہ غیر معمولی اور اپنی نوعیت کا منفرد کام ہے۔ اب تک اس کا کماحقہ تعارف نہیں کرایا گیا۔

شیخ مجدد نے پورے تصوف پر شریعت کی روشنی میں نظر ڈالی، اس کے ہر پہلو، خواہ اس کا تعلق تزکیۂ نفس اور وصول الی اللہ کے طریقے سے ہو یا علوم و معارف سے، یا زندگی اور دین کے نقطۂ نظر سے ہو، شیخ نے سب کا گہرائی سے جائزہ لیا۔ جو فکر، رجحان یا طریقہ یا عمل شریعت سے ہٹا ہوا یا قرآن و سنت سے متصادم پایا اس پر کھل کر تنقید کی۔ اس معاملے میں کسی بڑے سے بڑے صوفی، متقدم یا متاخر کے احترام کو حائل ہونے نہیں دیا۔ اس اہم تنقیدی کام کے ساتھ شیخ نے کئی دوسرے کام غیر معمولی نوعیت کے انجام دیے۔ میں یہاں صرف دو چیزیں مثال کے لیے پیش کروں گا:

یہ سوال کہ تزکیہ و احسان کا جو طریقہ نبی ﷺ نے اختیار فرمایا اور وہ جو صوفیاء نے بعد میں اپنایا کیا دونوں میں کوئی بنیادی فرق ہے؟ اس کا جواب عام طور پر صوفیاء نفی میں دیتے رہے ہیں اور یہ کہتے رہے ہیں کہ اگر کچھ فرق ہے تو جزئیات میں ہے اور ذرائع و وسائل کے حدود میں ہے۔ اس کے

برخلاف شیخ مجدد نے بڑی جرأت سے یہ بات کہی کہ دونوں طریقوں میں ایک بنیادی فرق ہے۔ صوفیاء کا طریقہ فنا و بقا سے عبارت ہے، یہی روحانی تجربہ اس کا امتیازی پہلو ہے، جہاں تک طریقۂ نبوت کا تعلق ہے، تو اس میں اس تجربہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ تصوف کی آٹھ سو سالہ تاریخ میں شیخ مجدد وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس بنیادی فرق کی نشاندہی کی۔ یہ اسی دوٹوک اعتراف کا نتیجہ تھا کہ سو سال بعد شاہ ولی اللہ نے اپنی مشہور تصنیف ''حجة اللّٰه البالغة'' میں صاف الفاظ میں لکھا کہ خدا تک رسائی کے دو طریقے ہیں، ایک انبیاء کا اور دوسرا صوفیاء اور متأخرین فلاسفہ [اہلِ فلسفہ] کا۔ اور ان کے نواسے شاہ اسماعیل نے ''صراط مستقیم'' میں طریقۂ نبوت اور طریقۂ ولایت کے عنوان سے دو الگ الگ فصلیں قائم کر کے ان پر تفصیل سے بحث کی، اور ان کی خصوصیات، ہدایات اور ثمرات پر کلام کیا۔

دوسری چیز شیخ ابن عربی کے نظریہ وحدۃ الوجود کے مقابلہ میں نظریہ وحدۃ الشہود کی علمی تشکیل ہے۔ شیخ ابن عربی کا نظریہ چار سو سال تک صوفیاء کے حلقہ میں چھایا رہا۔ اس کے خلاف کچھ متکلمین نے آواز اٹھائی۔ بعض صوفیاء نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور شیخ علاء الدولہ سمنانی (م ۷۳۶ھ/ ۱۳۳۰) جیسے بزرگوں نے اس سے اپنی برأت کا اعلان کیا۔ مگر اس نظریے پر قرآن وسنت کی روشنی میں مفصل تنقید اور اس کے مقابل نظریے کی فلسفیانہ تشکیل اور دفاع کا کام صرف شیخ مجدد نے انجام دیا۔''

ان تمام ائمہ کے علاوہ اسلاف ہی کے دور سے لے کر ہر دور میں ایسے باکمال صوفیاء اور رجال اللہ کا وجود رہا ہے جن کا دنیائے اسلام کو معمور و معطر رکھنے میں بڑا کردار تھا۔

اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اساتذہ کی مراجعت میں سہولت کی خاطر چند تحریروں کا ذکر ذیل میں کیا گیا ہے۔

۱۔ تصوف کی تاریخ اور چند معروف صوفیاء کے کارناموں کے تذکرے کے لیے پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب کی کتاب ''تاریخ تصوف''۔

۲۔ تصوف کی نو اہم اور مشہور کتابوں کے اجمالی مطالعہ اور تعارف کے لیے مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی کتاب ''تصوفِ اسلام''۔

۳۔ امام غزالیؒ، ابن العربیؒ، حضرت جنید بغدادیؒ، مولانا جلال الدین رومی وغیرہ حضرات کی تصوف کے باب میں خدمات اوران کے نظریات وتصورات کے تعارف پر مشتمل عذرا وقار صاحبہ کی کتاب ''تصوف کے بنیادی مأخذ''۔ اسی طرح تصوف میں امام غزالیؒ کے اصول ونظریات اور طریقۂ کار پر ایک جامع بحث کے لیے دیکھیے ''مقالات احسانی'' از مولانا سید مناظر احسن گیلانی۔

۴۔ مجدد الف ثانیؒ کی حیات وخدمات پر مولانا سید زوار حسین شاہ صاحب کی کتاب۔ ان کے علاوہ حضرت مجددؒ کے محض تصوف کے باب میں خدمات وتصورات پر ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری کی انگریزی تصنیف ("Sufism and Shari'ah" A Study of Shaykh Ahmad Sirhindi's efforts to reform Sufism) اوراس کا ترجمہ ''تصوف اور شریعت، مجدد الف ثانیؒ کے افکار کا مطالعہ'' ایک عمدہ اور تحقیقی کتاب ہے۔ حضرت مجددؒ کی حیات اور آپ کی ''مکتوبات امام ربانی'' سے تصوف کے بنیادی مسائل وموضوعات پر مشتمل مکتوبات کا عنوانات کے اضافوں کے ساتھ عربی ترجمہ کے لیے استاذ جلیل علامہ ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب کی کتاب ''**تاریخ الحرکة المجددیة**''۔

۵۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے افکار ونظریات کے لیے حضرت شاہ صاحب کی اپنی تصانیف کے علاوہ مولانا عبیداللہ سندھی کی کتابیں بھی مفید ہیں۔

ان کتابوں کا ذکر محض نمونے کے طور پر کیا گیا، ورنہ تصوف کی دنیا سیکڑوں تحقیقی اور عمدہ کتابوں سے بھرپور ہے۔

......حواشی......

۱۔ تصوف کی تاریخ پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ایک بہترین تحقیقی کتاب ڈاکٹر ابوالوفا الغنیمی التفتازانی کی ''**المدخل الی التصوف الاسلامی**'' بھی ہے۔

۲۔ تصوف کی وہ کون سی کتاب ہوگی جو ان مباحث سے خالی ہوگی اس لیے اساتذہ کرام اس باب میں استفادہ میسر جملہ کتابوں سے بآسانی کر سکتے ہیں۔تاہم سلیس اور عمدہ اسلوب میں اس کی تفصیلات مولانا سید زوار حسین شاہ صاحبؒ کی کتاب ''**عمدۃ السلوک**'' میں بھی ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

۳۔ کچھ شک نہیں کہ تصوف کے باب میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتب ھمعات اور لمعات بہت اہم ہیں، تاہم یہ پہلو ذہن میں رہے کہ ان میں کچھ باتیں محلِ نزاع بھی ہیں۔

عمومی توسیعی محاضرات

سید ندیم فرحت

انسانی معاشرت اور علما کا کردار

انسانی زندگی کی بے شمار مختلف جہات ہیں اور ان میں سے ہر ایک جہت میں ہر لمحہ کوئی نہ کوئی تبدیلی یا ارتقائی عمل جاری ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسانی زندگی کے تمام دائروں اور اس کے تمام پہلوؤں کے حوالے سے رہنمائی اسلام کی ابدی و سرمدی تعلیمات میں موجود ہیں لیکن یہ بھی درست ہے کہ ان تعلیمات کے مختلف حالات میں اطلاق کا درست ترین راستہ بتانا علماء دین ہی کی ذمہ داری ہے۔ اسلام کے اس عملی پہلو کا ہی ایک مظہر یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کی علمی روایت میں 'عالم' سے مراد صرف کتابی علم اور نظری مباحث کا جاننے والا نہیں ہے بلکہ وہ معاشرتی تقاضوں اور زندگی کے مختلف میدانوں میں موجود نزاکتوں کو اچھی طرح جانچ کر نہ صرف علمی رہنمائی فراہم کرتے ہیں بلکہ اہم معاشرتی ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے عملی نمونہ بھی پیش کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ معاشرے کے چلن سے غیر واقف شخص کو اس کے تمام تر کتابی ا اور نظری علم کے باوجود 'جاہل' خیال کیا جاتا ہے۔

مسلم معاشروں میں ایسے افراد کی اب بھی کمی نہیں ہے جو اپنے روزمرہ معاملات اور پیش آمدہ حالات میں اسلام کے اصولوں کی پاسداری کرنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لیے گاہے بگاہے علما سے رجوع کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں ایک بڑا طبقہ ایسا بھی موجود ہے جو کسی بھی صورتِ حال سے متعلق پیش کردہ مختلف حل عقل کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں اور پھر جس رائے کو زیادہ قرینِ عقل خیال کرتے ہیں اس پر عمل کرتے ہیں۔

ان میں پہلی طرح کے افراد جو اسلام کو اپنی پہچان، شناخت اور انتخاب قرار دیتے ہیں، اگر انہیں بھی اسلام کے اصولوں کے مطابق درست رہنمائی میسر نہ ہو اور وہ بحالتِ مجبوری زمانے کا چلن چلنے پر مجبور ہو جائیں، جو کہ بیشتر صورتوں میں اسلامی احکامات و تصورات کے منافی ہے، تو اس کا سب سے زیادہ بار علماء امت پر ہی آئے گا۔ دوسری جانب اگر علماء مختلف معاملات اور حالات سے متعلق دین کے احکام اور ان کی حکمتوں کو نہ صرف خود بہت اچھی طرح جانتے اور سمجھتے ہوں بلکہ انہیں ہر طرح کے مخاطبین کی استعداد اور ماحول کے تناظر میں کھول کھول کر بیان کر سکتے ہوں تو یقیناً دوسری قسم کے افراد میں سے بھی ایک بڑی تعداد کے حوالے سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ دینِ اسلام کی حقانیت کے قائل ہو جائیں گے اور ممکن ہے کہ ہدایت کی نعمت سے سرفراز بھی ہو جائیں۔ تاہم اگر یہ دونوں طبقات موجود نہ بھی ہوں تو بھی یہ علما کا فرض ہے کہ وہ عصرِ حاضر میں درپیش نت نئے مسائل کے حوالہ سے تحقیقِ حق اور اتمامِ حجت کے لیے قرآن وسنت کی روشنی میں طے شدہ اصولوں کے مطابق درست ترین حل عوام کے سامنے پیش کریں۔ پھر ایک ایسی امت جس کا وظیفہ راہِ ہدایت کی طرف دعوت دینا اور دینِ حق کو بالادست کرنا ہے، اس کے ہر فرد کے لیے لازم ہے کہ اسے نہ صرف دینِ متین سے متعلق مکمل شرحِ صدر حاصل ہو بلکہ وہ خود اپنے لیے اور اپنے ساتھی انسانوں کے لیے واضح لائحۂ عمل بھی رکھتا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو مستحکم اصولوں پر استوار کیا ہے جنہیں فقہاء امت نے شرح وبسط کے ساتھ بیان کر دیا ہے اور علماء نے نسل در نسل ان کی تعلیم کا مناسب انتظام فرما دیا ہے۔ گویا سوال و جواب کے اس پورے عمل میں اگر کوئی مشکل پیش آ سکتی ہے وہ صرف اس صورت میں پیش آ سکتی ہے جب سوال کو درست طور پر سمجھا نہ جا سکا ہو ورنہ یہ ممکن نہیں ہے کہ دین میں کسی انسانی مسئلے کا شافی و کافی حل موجود نہ ہو۔ سوال کو درست طور پر سمجھ نہ پانے کا ہی نتیجہ ہے کہ ماضی میں بعض علما نے ان وسائل کی حرمت کا فتویٰ دیا جنہیں آج ہم مباحات کے زمرہ میں شمار کرتے ہیں، یا اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وقت اور حالات میں تبدیلی کی بنا پر بنیادی اصولوں کو برقرار رکھتے ہوئے طرزِ عمل میں تبدیلی ناگزیر

ہوگئی ہے۔ گویا کسی عالمِ دین کا ایک سوال یا صورتِ حال کو کسی محدود تناظر میں دیکھنا یا مکمل طور پر سمجھے بغیر کوئی فتویٰ، حتیٰ کہ رائے تک دے دینا، نہ صرف معاصر معاشرے میں فکری انتشار کا باعث بن سکتا ہے بلکہ لادین اور دین دشمن عناصر کو مستقل طور پر اہلِ دین کو مطعون ٹھہرانے کا بہانہ بھی فراہم کرتا ہے۔

جدید رجحانات اور مطلوبہ رویہ

علماء کرام تبلیغ وتبیینِ دین کا فریضہ اسی صورت میں بہتر طور پر نبھا سکتے ہیں جب وہ معاشرے میں ظہور پذیر رجحانات اور رویوں سے بھی آگاہ ہوں۔ موجودہ دور میں انسانی رویے بڑی حد تک ان سائنسی ایجادات سے وابستہ ہیں جو بہت تیزی سے ترقی پا رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ رابطوں میں آسانی نے ایک ایسی فضا قائم کردی ہے کہ مختلف معاشرے ایک دوسرے کو زیادہ بہتر طور پر جان اور سمجھ رہے ہیں اور اس عمل میں ایک دوسرے کا اثر بھی قبول کر رہے ہیں۔ عالمی منظر نامے میں یہ بھی واضح ہے کہ علمی و مادی وسائل کا زیادہ بہتر استعمال غیر مسلم ترقی یافتہ اقوام ہی کر رہی ہیں اور ان کی بھرپور کوشش ہے کہ نہ صرف ان کی تیار کردہ مصنوعات بلکہ ان کے نظریات وخیالات بھی دنیا بھر میں رائج ہوں۔ اس مقصد کے تحت نہ صرف اخبارات، رسائل، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ کو اور ان سے وابستہ افراد کو استعمال کیا جا رہا ہے بلکہ تعلیمی نصابات، تعلیمی ماحول اور معلمین کی ذہن سازی کے ذریعے بھی ملحدانہ سوچ کو عام کیا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی میں سماجی و معاشی پہلو سے بھی ہر ادارہ مغرب کی عطا کردہ سوچ کے ساتھ ہی قائم کیا جاتا اور چلایا جا رہا ہے۔ اس ماحول میں ذہنوں میں سوالات کا ابھرنا اور شکوک وشبہات کا پرورش پانا یکسر فطری ہے۔

ایک عالمِ دین ان سوالات اور شبہات کا جواب صرف اسی صورت میں دے سکے گا جب وہ اس پس منظر سے بھی آگاہ ہو جو اس سوال یا شبہے کا باعث بنا ہے اور اس بحث سے بھی آگاہ ہو جو اس ضمن میں علمی یا عوامی حلقوں میں موجود ہے۔ گویا اسے جس حد تک ممکن ہو سکے اپنے گردوپیش سے باخبر رہنا چاہیے۔ کیوں کہ یہ بات مسلّم ہے کہ جو شخص اپنے دور کے حالات سے واقف نہ ہو وہ چاہے کئی کتابوں

کا حافظ ہی کیوں نہ ہو، عملی زندگی کے حوالے سے جاہل ہی سمجھا جائے گا۔

ہمہ جہت شخصیت کی تشکیل میں استاد کا کردار

دینی مدارس میں طلبہ (یا طالبات) کو ایک طویل نصاب مکمل کرنا ہوتا ہے اور مدارس کے منتظمین اس بات کا اہتمام کرتے ہیں کہ طلبہ کا زیادہ سے زیادہ وقت تحصیلِ علم میں گزرے اور ان کی توجہ دیگر امور کی طرف کم سے کم ہو۔ اس اہتمام سے اگرچہ وہ کتب کا مطالعہ تو اچھے انداز میں کر لیتے ہیں لیکن انہیں عمومی زندگی کو سمجھنے، معاشرتی رویوں کو جاننے اور ان کا مطالعہ کرنے اور جدید رجحانات سے روشناس ہونے کا موقع بہت کم ملتا ہے۔ ایسے میں یہ استاد اور دینی ادارے کے مہتمم کا فرض ہے کہ وہ ایسے مواقع پیدا کرے جس سے طالبِ علم اپنے تعلیمی سلسلے کی تکمیل کے بعد جب عملی زندگی میں قدم رکھے تو خود کو معاشرے میں اجنبی نہ سمجھے اور نہ اس کا طرزِ عمل اسے معاشرے میں اجنبی بنا دے بعض اوقات ایسی مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں کہ مدرسے کے محدود ماحول سے باہر نکلنے والا فرد جب تحصیلِ علم کے بعد عملی زندگی میں داخل ہوتا ہے تو وہ لوگوں کے رویے اور معاشرے کا چلن دیکھ کر یا تو مبہوت ہو جاتا ہے اور خود کو ایک خول میں بند کر لیتا ہے یا وہ اس نئی دنیا سے اس قدر مسحور ہو جاتا ہے کہ اسی کے رنگ میں خود کو ڈھالنے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔ چونکہ ایک طالبِ علم دورانِ تعلیم اپنا تمام یا زیادہ تر وقت مدرسے میں ہی گزارتا ہے اس لیے مدرسے کے اساتذہ اور منتظمین کی یہ ذمہ داری ہے کہ اس کی شخصیت کی متوازن تعمیر کا اہتمام کریں اور ایسی کسی خامی کے امکان کو کم از کم کرنے کی کوشش کریں جس کی وجہ سے وہ معاشرے میں اپنا کردار پوری طرح ادا کرنے میں رکاوٹ محسوس کرے۔

توسیعی محاضرات کی اہمیت

طلبہ کی سوچ میں وسعت اور گہرائی پیدا کرنے کے لیے ایک بنیادی کردار تو استاد کا ہے کہ وہ ذاتی طور پر ہر درس کے دوران جدید علمی وفکری مباحث اور عملی رویوں اور رجحانات کا تذکرہ کرتا رہے اور طلبہ کو یہ دعوت دے کہ دین کے اصولوں کے مطابق ان کا حل تجویز کریں۔ تاہم اس حوالے سے

مدرسے کا کردار بھی بہت اہم ہے۔عمومی ماحول میں علمی وفکری رجحان پیدا کرنے کے ساتھ ادارے کی سطح پر ایسے توسیعی محاضرات کا اہتمام بہت مفید ہوگا جو کم وقت اور جامع انداز میں مختلف موضوعات کے حوالے سے طلبہ واساتذہ کو بنیادی رہنمائی فراہم کریں۔اس کے لیے یہ مفید ہوگا کہ ہر تعلیمی سال کے آغاز میں ان موضوعات کی ایک فہرست ترتیب دے دی جائے اور ماہانہ یا پندرہ روزہ بنیاد پر ہر موضوع کے حوالے سے کسی ایسے صاحبِ علم وفن کو دعوت دی جائے جو نہ صرف اس موضوع سے بہتر طور پر آگاہ ہو بلکہ اس کی دیانت بھی قابلِ اعتماد ہو۔اگر کسی وجہ سے مدرسہ کی سطح پر ایسے محاضرات کا اہتمام نہ ہو سکے تو ایک مدرس خود اپنے طور پر بھی اپنے تدریسی گھنٹے کے دوران زیرِ تربیت افراد کے لیے یہ اہتمام کرسکتا ہے۔

تدریب المعلمین کے لیے توسیعی محاضرات

مدرسہ کی سطح پر اس طرح کا ماحول پیدا کرنا اور توسیعی محاضرات کا باقاعدہ اہتمام کرنا صرف اسی صورت میں ممکن ہوگا جب خود اساتذہ اپنے فن میں مہارت کے ساتھ معاصر سماجی، معاشی، سیاسی، قومی اور بین الاقوامی امور سے آگاہ ہوں۔اس لیے اس قسم کے توسیعی محاضرات کو تدریب المعلمین کے کورس کا حصہ بھی بنایا جانا چاہیے جن سے مدارس کے اساتذہ کے احاطۂ علم کو وسیع کرنے اور عام زندگی میں درپیش امور ومعاملات کی آگاہی پہنچانے میں آسانی ہو۔اس کے ساتھ اساتذہ کے لیے یہ بھی مفید ہوگا کہ ان کے لیے ترتیب دیے گئے محاضرات میں جدید وسائل کے بہتر استعمال کے لیے رہنمائی فراہم کی جائے۔

مجوزہ موضوعات

موضوعات کے تعین میں اساسی و تعلیمی اہداف کو مدّ نظر رکھا جانا ضروری ہے۔ نیز اس امر کا خیال رکھا جائے کہ بے شمار ممکنہ موضوعات میں سے وہ کون سے اہم ترین موضوعات ہیں جن کا انتخاب زیادہ مفید ثابت ہوگا۔ذیل میں مثال کے طور پر چند عمومی موضوعات کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے۔

- مسلمانوں کا نظام تعلیم: نظریہ، روایت، ارتقا اور مسائل
- غیر مسلموں کا نظام تعلیم: نظریہ، روایت، ارتقا اور مسائل
- پاکستان میں مروّجہ نظام ہائے تعلیم (جائزہ)
- عصر حاضر میں دینی تعلیم: نئے تجربات اور ان کا جائزہ (عالمی سطح پر)
- مغربی تہذیب کی فکری بنیادیں
- جدید تصورات و رجحانات پر ایک نظر (جمہوریت اور اس کی مختلف شکلیں, سیکولرازم، اوپن مارکیٹ/ منڈی کی معیشت، نظامِ سرمایہ داری، عالمگیریت، انسانی حقوق، خواتین کی آزادی، دہشت گردی، میڈیا کا کردار، سماجی میڈیا، آزادیٔ اظہار، موسمی تغیرات، عالمی تجارت WTO، اقوامِ متحدہ، ورلڈ بینک، تخفیف اسلحہ، علاقائی تعاون کی تنظیمیں، ملکوں کے وسائل پر قبضے کی جدید شکلیں)
- دستور پاکستان: ایک مطالعہ
- پاکستان میں نظام انصاف اور قانون سازی (پارلیمنٹ، سپریم کورٹ، ہائی کورٹس، ذیلی عدالتوں، وفاقی شرعی عدالت، اسلامی نظریاتی کونسل، پولیس وغیرہ کی ترکیب، دائرۂ کار، فرائض اور ان سے تعامل کی نوعیت وطریقِ کار)
- دینی اور عصری علوم میں قربتیں اور فاصلے
- اسلامی بینکاری: تصور، ارتقا اور مسائل
- طب کے میدان میں ہونے والی پیش رفت اور اس سے پیدا شدہ سوالات
- خاندان کا ادارہ، درپیش چیلنج
- عورت، مغرب اور اسلام
- عالمی اقتصادی نظام، اسلامی نظام معیشت اور ہمارا کردار

موضوعات کی یہ فہرست نہ تو حتمی ہے اور نہ ہی اس کی پابندی لازمی ہے۔ حالات، ضرورت اور

متعلقہ موضوع کے ماہر کی دستیابی کے مطابق ان میں ردوبدل کیا جا سکتا ہے۔ نیز کسی ایک موضوع پر گہرائی سے مطالعہ کے لیے ایک سے زاید نشستیں بھی ممکن ہیں اور محض اجمالی تعارف کے لیے ایک ہی نشست میں دو موضوعات کو جمع بھی کیا جا سکتا ہے۔ بعض اوقات یہ ضرورت بھی محسوس ہو سکتی ہے کہ کسی حالیہ واقعہ اور اس سے پیدا شدہ بحث کو زیرِ تربیت افراد کے سامنے شرح و بسط اور درست معلومات کے ساتھ رکھا جائے۔ اس لیے حالاتِ حاضرہ کے موضوعات بھی زیرِ بحث آ سکتے ہیں۔ بتدریج یہ کوشش بھی کی جائے کہ ہر محاضرے کے بعد سوال جواب کی روایت ڈالی جا سکے تاکہ یہ محاضرات جن کا ایک مقصد الجھنوں کو کم کرنا ہے بذاتِ خود کچھ نئی الجھنوں کا سبب نہ بن جائیں۔

تدریب المعلمین کے چالیس روزہ کورس کے دوران شرکاء کو تین گروپس میں تقسیم کر کے ایسے کم از کم تین محاضرات منعقد کروائے جائیں تاکہ اس پورے کام کا تصور مزید واضح ہو اور عملی مشق کی بھی ایک صورت پیدا ہو جائے۔

ہم نصابی سرگرمیاں

مولانا عبدالقدوس محمدی

اسلامی نظام تعلیم کے بالعموم اور دینی مدارس کا تعلیمی نظام تشکیل دینے کے لیے اساسیات، اصول وقواعد اور حدود بعینہ وہی ہونی چاہیے جو سرکار دو عالم ﷺ کی تعلیم و تربیت کی تھی اور یقیناً فلاح و نجات اسی میں ہے۔ کوئی بھی نظام تعلیم اگر اس معیار پر پورا اُترے تو اس کے مؤثر اور مفید اور بار آور ہونے میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں رہنا چاہیے۔ کیونکہ وہ معیار اور اصول ربانی تھے۔ اور رب بھی وہ جو ماضی کو بھولا نہیں، حال سے بے خبر نہیں، مستقبل سارا کا سارا اس کے سامنے وا ہے۔ انسان کی تمام ضرورتوں اور تقاضوں کے خالق، انسانوں کو انہیں پورا کرنے کی معاونت و توفیق بخشنے میں ستّر ماؤں سے زیادہ ہمدرد اور پیار والے ہیں۔ وہ تعلیم و تربیت کے لیے جن اصول وقواعد اور معیار کا تعین کریں گے اس کی افادیت اور تاثیر پر کیا پھر بھی گفتگو اور مباحثوں کی ضرورت باقی رہے گی۔ مسلمانوں کو عصری اور مذہبی سبھی امور کی تعلیم کے لیے اس معیار کو اپنانا چاہیے۔ اگر ضرورت ہے تو وہ صرف اس کو سمجھنے کی ہے اور اس کا تجزیہ کر کے جامع قواعد مرتب کرنے کی ہے۔

ہم نصابی سرگرمیاں نبوی تعلیم و تربیت کی روشنی میں کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی تعلیم و تربیت کا ایک حصہ ہم نصابی سرگرمیوں پر بھی مشتمل ہے۔ عہد نبوت میں نیزہ بازی، دوڑ میں مسابقت، شعر گوئی اور ہنسی مزاح ثابت ہیں جن کی تفصیلات حدیث اور سیرت کی کتابوں میں موجود ہیں۔ لہٰذا مدارس میں جو بعض ہم نصابی سرگرمیاں تشکیل دی جاتی ہیں وہ نبوی نظامِ سے ہم آہنگ ہی ہے۔ ان سرگرمیوں کی تشکیل میں کن قواعد کا خیال رکھنا ضروری ہے اس پر بھی پہلے گفتگو کی

جا چکی ہے۔ البتہ یہاں چند ہم نصابی سرگرمیوں کی تشکیل کے کچھ مواقع کا ذکر کیا جاتا ہے جن میں استاد کی شمولیت بھی ضروری ہے۔ کیونکہ استاد کو کمرۂ جماعت سے باہر ہر وقت واعظ اور مدرس بن کر نہیں رہنا چاہیے بلکہ اپنی شخصیت، اخلاقی اصول اور اقدار کا لحاظ رکھتے ہوئے شاگردوں کے ساتھ شاگرد ہی بن کر رہنا چاہیے۔ کیونکہ اگر استاد تعلّی کا مظاہرہ کرتے ہوئے استاد ہی بن کر رہیں تو اس سے طلبہ کے درمیان مرعوبیت کی فضا قائم ہوگی اور کھل کر طلبہ کو اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کا موقع میسر نہ ہوگا جس کی وجہ سے ان کی شخصیت میں بہتری اور نکھار پیدا نہیں ہوسکتا۔ اس کے برخلاف اگر استاد شاگردوں کے ساتھ شاگرد ہو کر رہیں بالخصوص ہم نصابی سرگرمیوں کے سرانجام دیتے ہوئے تو مرعوبیت کی فضا قائم نہ ہوگی اور ہر طالب علم کھل کر خوداعتمادی کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرے گا جن میں مزید بہتری لانے اور نکھار پیدا کرنے کا استاد کو موقع ہوگا۔ تو ہم نصابی سرگرمیوں میں جہاں استاد کا ہونا ضروری ہے۔ وہاں استاد کا بحیثیت استاد نہیں بلکہ شاگرد بن کر ہی وجود ضروری ہے تب یہ ہم نصابی سرگرمیاں افادیت کی حامل ہوں گی۔

بزمِ ادب

مدارس کی تاریخ پر اگر ایک نظر دوڑائی جائے تو شروع ہی سے بزمِ ادب کے تصور کے بارے میں معلومات ملیں گی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان اکابرین کے دور میں بھی ہم نصابی سرگرمیوں کے اس پہلو یعنی بزمِ ادب کی ضرورت اور افادیت مسلّم تھی۔ چنانچہ اس واضح حقیقت کے پیش نظر کراچی کے علاوہ دیگر مدارس کو بھی اس پہلو پر غور کرنا چاہیے۔ کراچی کے مدارس میں بالعموم بزمِ ادب کا انعقاد ہوتا رہتا ہے خیبر پختون خوا کے بیشتر مدارس میں اس کا فقدان ہے۔ بزمِ ادب میں مختلف امور میں مختلف سطحوں کے مقابلوں کا انعقاد ہوتا ہے مثلاً: تقریری اور تحریری مقابلے وغیرہ۔

تقریری مقابلہ: تقریری مقابلوں کا انعقاد مختلف سطحوں پر ہونا چاہیے سب سے ادنیٰ سطح تو یہ ہے کہ چونکہ مدارس کے طلبہ کی اکثریت کا قیام مدارس ہی میں ہوتا ہے تو ہوسٹلز یا دار الاقامہ کے نگران کے زیرِ نگرانی ایک ہفتہ وار غیر رسمی تقریری مقابلہ منعقد کیا جائے جس کے لیے آسان موضوعات کم از کم

ایک ہفتہ قبل نگران استاد متعین کریں اور مقررہ دن منعقد ہونے والے بزمِ ادب میں ہر خواہش مند طالب علم کو بولنے اور تقریر کرنے کا موقع دیا جائے۔ محفل کے آخر میں استاد اس مقابلے کی اہمیت اور اس میں شرکت کی افادیت کے بارے میں طلبہ کو بتلائیں۔ انہیں ہچکچاہٹ ختم کرنے اور اپنی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کی ترغیب دیں۔ تقریر کے اصولوں کی طرف رہنمائی کریں۔

دوسری سطح رسمی طور پر ہر کلاس میں تقریری مقابلوں کا انعقاد ہے۔ اس سطح کے مقابلوں کا انعقاد سال کے اختتام سے کچھ عرصہ قبل ہونا چاہیے۔ اس کے لیے استاد نسبتاً قابل مطالعہ موضوعات متعین کریں اور استفادے اور تیاری کے لیے نسبتاً مشکل اور اعلیٰ معیار کی کتابوں اور مآخذ کی نشاندہی بھی کریں۔ ان مقابلوں ایک یا دو استاد بھی بطور جج شرکت کریں اور بہترین کارکردگی پر طلبہ میں چھوٹے چھوٹے انعامات بھی تقسیم کریں۔

اس کے بعد مدرسے کی سطح پر تقریری مقابلوں کے انعقاد کا مرحلہ آتا ہے۔ یہ مرحلہ رسمی ہونا چاہیے اور پورے مدرسے کی سطح پر اس کو حوصلہ افزائی اور طلبہ کی تشجیع و ترغیب کے لیے اتنی اہمیت دی جائے کہ تین اساتذہ پر مشتمل ایک ٹیم کے زیر نگرانی اس کی تشکیل ہو۔ اس کے لیے بھی موضوعات نسبتاً زیادہ دقیق ہونے چاہییں۔ انعام کا مستحق ٹھہرانے کے لیے معیار بھی اعلیٰ ہونا چاہیے اور اس کے اختتامی مرحلے میں شریک طلبہ کی حوصلہ افزائی اور غیر شریک طلبہ کی ہمت افزائی کے لیے مہتمم خود شرکت کریں اور طلبہ میں انعامات تقسیم کریں۔

اس کے بعد آخر میں بین المدارس تقریری مقابلوں کا انعقاد ہوتا ہے۔ ان مقابلوں کا انعقاد ضلعی، صوبائی یا ملکی، جتنا بھی ممکن ہو، سطح پر سال کے آخر میں ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں ہر مدرسے کے اساتذہ اپنے طلبہ کو تربیت دیں۔ تقریر کی خوبیوں اور اصولوں سے انہیں روشناس کرائیں اور طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لیے ان مقابلوں کو اتنی اہمیت دی جائے کہ وفاق کے نمایندہ شخصیات ان میں شرکت کریں اور مستحق ٹھہرائے جانے والے طلبہ میں انعامات تقسیم کریں ان مقابلوں کے انعقاد سے پہلے ان کی تشہیر کی جائے، اور بعد میں اخبارات یا وفاق ہی کے نمائندہ مجلّات میں کامیاب طلبہ کی خبریں شائع

کروائی جائیں۔

تحریری مقابلے: اس بات میں کوئی شک نہیں کہ عوام کی رہبری کے لیے مثبت، معیاری اور بامعنی لٹریچر اور متنازعہ مسائل کے متعلق تحقیقی مواد کی فراہمی بھی مدارس کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں زیر تعلیم طلبہ کی تحریر و انشا کے میدان میں تربیت بھی ضروری ہے۔تحریری مقابلوں کا انعقاد بھی مختلف سطحوں پر کیا جانا چاہیے۔اس میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ تحریر کے لیے زبان اردو، عربی یا انگریزی ہو۔ مقامی زبانوں کے بجائے یہ عالمی سطح پر بولی اور لکھی جانے والی زبانیں ہیں۔

سب سے پہلا مرحلہ اس کا ماہانہ ہونا چاہیے کہ پورے ایک مدرسے کی سطح پر کوئی بھی طالب علم اپنی اختیار کے مطابق کسی بھی زبان میں اور کسی بھی موضوع پر چند سو الفاظ پر مشتمل ایک مضمون لکھے۔ ان مقابلوں میں تحقیق کے بجائے محض انشا کے اصول وقواعد پر توجہ دینی چاہیے۔تمام مقالات موصول ہونے پر کسی استاد کو جج کی ذمہ داری دی جائے اور وہ بہتر اور معیاری مقالات کا چناؤ کریں۔ پھر جو طلبہ مطلوبہ معیار کے مطابق مضامین نہ لکھ پائے ہوں تو پیار ومحبت سے ان کی اصلاح کی جائے اور اگلی بار لکھنے کے لیے اس کا جذبہ بیدار رکھنے کے لیے ان کی ہمت افزائی کی جائے۔اور کامیاب طلبہ کے مضامین مدرسے کی ویب سائٹ پر یا مہتمم کے دستخط اور مدرسے کی مہر کے ساتھ مدرسے کے کسی عام نوٹس بورڈ پر اگلے مقابلے تک آویزاں رکھیں۔تاکہ غیر شریک طلبہ ان سے استفادہ بھی کریں اور ان میں شوق وذوق پیدا ہو۔

دوسرا مرحلہ موقع ومحل کے مطابق ششماہی یا سالانہ ہونا چاہیے۔اس کا معیار انشا کے اصولوں کے ساتھ ساتھ تحقیق کے اصولوں پر بھی مبنی ہونا چاہیے۔یہ بھی مدرسے ہی کی سطح پر ہوں اور اس کے لیے ایسے مسائل یا موضوعات کا تعین ہونا چاہیے جو نسبتاً جدید بھی ہوں اور ان کے متعلق مواد بھی پایا جاتا ہو۔اور زیادہ دِقت اور امعان پر مبنی نہ ہوں بلکہ وہ موضوعات اس حیثیت کے ہوں کہ تحریری مقالہ تیار کرنے میں طالب علم کا کام صرف موجودہ مواد کی انشا وتحقیق کے جدید اصولوں کے مطابق تلخیص

(summarization) کرنا ہوں۔ ان مقابلوں کے لیے مطلوبہ صفحات کی حد کم رکھنی چاہیے۔ اور مقالات آنے پر دو یا تین اساتذہ پر مشتمل کمیٹی ہر مقالہ نگار کو پوزیشن اور نمبر دیں۔ ان مقابلوں کو مدرسہ اپنی ویب سائٹ، اپنے مجلّہ یا کسی دوسرے مجلّے میں مقالہ نگار کے نام اور حاصل کردہ نمبر یا پوزیشن کی توضیح کے ساتھ چھپوا دیں۔ اگر مقالوں کے موضوعات کچھ زیادہ ہی دلچسپ ہیں تو سب کو شائع کروا دیں ورنہ امکانی حد تک کم مقالوں کو اشاعت سے محروم قرار دیں۔

اس کے بعد تحریر کا آخری مقابلہ وفاق کی زیرِ نگرانی ہونا چاہیے۔ موضوعات کا تعین بھی وفاق کی کمیٹی ہی کرے۔ تحریر کے لیے زبان صرف عربی اور انگریزی ہو۔ متعین موضوعات نسبتاً تحقیق طلب اور زیادہ تر اپنے غور و فکر کے محتاج ہوں۔ ان میں طلبہ کا کام محض نصوص کی تلاش نہ ہو۔ بلکہ نصوص سے استدلال اور استشہاد پر مبنی اپنے ذخیرہ مطالعہ کی روشنی میں مقالہ نگار سے اپنی رائے کا اظہار مطلوب ہو۔ معیار یہ ہو کہ مباحث کے دوران اظہارِ رائے کا ڈھنگ اور سلیقہ کیا ہے؟ اور پھر اپنی بات پر نصوص سے استدلال و استشہاد کرنے میں کتنا باریک بین ہے اور اس کی فکر و نظر کی رفتار اور اس میں جامعیت کتنی ہے؟ اس میں اجازت صرف درجہ سابعہ، موقوف علیہ اور تخصص کے طلبہ کو دی جائے۔ مقابلے میں کم از کم پانچ یا چھ مقالہ نگاروں کو انعام کا مستحق ٹھہرایا جائے۔ اور ان سب مقالوں کو مقالہ نگار کی پوزیشن اور حاصل کردہ نمبرات کی وضاحت کے ساتھ وفاق کے زیرِ نگرانی کسی بڑے ملکی رسالے میں شائع کروایا جائے۔ بین الاقوامی رسالوں میں ان کی اشاعت ہو سکے تو یہ بات طلبہ کے لیے بہت حوصلہ افزا ہوگی۔

خطاطی

خطاطی ایک ایسی سرگرمی ہے جو تاریخی اور روایتی طور پر بھی مدرسے کی نصابی سرگرمیوں سے گہرا اور قریبی تعلق رکھتی ہے۔ طالب علم کے لیے خوش خط ہونا ایک اچھا وصف ہے۔ بہترین خط کسی بھی دیکھنے والے کو پڑھنے پر راغب کر دیتا ہے۔ تاہم دورِ جدید میں ایک اور چیز جسے کمپیوٹر نے اہمیت دے کر خوش خطی کے بالمقابل لا کر کھڑا کر دیا ہے وہ کمپوزنگ ہے۔ خطاطی یا کمپوزنگ ایک فن یا مہارت

ہے جس کا نہ ہونا کسی بڑی شخصیت کے لیے کوئی عار کی بات نہیں لیکن ایک اہم ضرورت ہونے کی بنا پر اس کا ہونا ایک عمدہ اور اچھا وصف ہے۔ لہٰذا اساتذہ کرام کو چاہیے کہ طلبہ کی بدخطی دور کرنے کے لیے ان سے محنت کروائیں اور اس کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر پر لکھنے کی صلاحیت کے حصول کی طرف راغب کیا جائے۔ جو ایک طرف تو اپنی ذات کے اندر ایک باعزت پیشہ بھی ہے اور اپنی ذاتی حاجتوں اور ضرورتوں کی تکمیل کا سامان بھی ہے۔

جسمانی نشوونما اور کھیل

طلبہ کی جسمانی نشوونما اور کھیل کود کے مواقع فراہم کر کے نصابی سرگرمیوں سے تھکاوٹ دور کرنا بھی ہم نصابی سرگرمی کا ایک اہم حصہ ہے۔ کھیل کود کی بنیاد تو رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات میں بھی ملتی ہے۔ مختلف صحابہؓ کے درمیان دوڑ، نیزہ بازی، کُشتی اور گھڑ دوڑ کے مقابلے کے تذکرے حدیث اور سیرت کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ یہ سب ہم نصابی سرگرمیاں تھیں۔ ان سرگرمیوں میں طلبہ کو مصروف رکھنے سے ان کی جسمانی نشوونما اور صحت بہتر رہتی ہے۔ جن کے باعث طبیعت میں نشاط پیدا ہوتا ہے۔ استاد کا فرض اس سلسلے میں یہ ہے کہ وہ طالب علم بن کر ان سرگرمیوں میں شرکت کیا کریں اور طلبہ کو بتائیں کہ ان سرگرمیوں کے دوران تمام اسلامی اقدار اور احکام کا پاس رکھنا، شرعی حدود سے تجاوز نہ کرنا اور مطلوب مقاصد کی حصول کی نیت کرنا ضروری ہے۔ ہم نصابی سرگرمیوں سے مقصد صرف طلبہ کی شخصی صلاحیتوں کو پروان چڑھانا ہے۔ جیت کے لیے بہتر حکمت عملی وضع کرنے، تنظیم الامور اور قائدانہ صلاحیت کے ساتھ ساتھ حسن عمل کی صلاحیت کا حصول ہے۔ کھیل کے دوران خود اعتماد اور حوصلہ مند رہنے کی استعداد پیدا کرنی ہے۔ شکست کی صورت میں حوصلہ شکن نہ ہونے انتقامی جذبات پر قابو رکھنے اور صبر واستقامت کا حصول ہوتا ہے۔ جدید اصطلاح میں اسی کو ''اسپورٹس مین اسپرٹ'' کہا جاتا ہے۔ استاد اپنی شرکت سے کھیل کود کو ان مقاصد اور ضروریات کو پورا کرنے والا بنا دیں۔

رفاہِ عامہ کے کاموں میں طلبہ کی شرکت

خدمتِ خلق اور رفاہِ عامہ کے کاموں میں شرکت دین اسلام کا وہ حصہ ہے جس کے بے شمار فضائل حدیث کی کتابوں میں وارد ہیں۔ رفاہِ عامہ کے کاموں میں شرکت کے لیے طلبہ کو ترغیب دینے، اس کے بہتر طریقے اور اس کی مشق اور تربیت ایک ہم نصابی سرگرمی کی صورت میں دی جاسکتی ہے۔ معاشرتی طور پر بعض اوقات ایسے ہنگامی حالات پیدا ہوتے ہیں جن میں آگے بڑھ کر کردار ادا کرنا ہر فرد کی ذمہ داری بنتی ہے۔ مدارس کے طلبہ تربیت یافتہ ہوں تو آئندہ ایسے نامساعد حالات سے نمٹنے کے لیے معاشرے کو بہتر حکمت عملی اور راہنمائی و رہبری دے سکتے ہیں۔

اگر کبھی کوئی ہنگامی صورت حال پیدا ہو، یا معاشرتی طور پر کوئی رفاہی کام ہو یا خدمت خلق کی کوئی مہم سرانجام دینا ہو تو استاد اس سلسلے میں اصول و ہدایات فراہم کریں، حکمت عملی وضع کرنے کا طریقہ کار بتائیں۔ نیز ایسے کاموں میں شرکت کے لیے ترغیب بھی دیں اور طلبہ ہم نصابی سرگرمیوں کی حیثیت سے اپنے اوقات کے حساب سے گاہے گاہے ان کاموں میں حصہ بھی ڈالیں۔ اسی طرح اجر و ثواب کے علاوہ معاشرے میں احترام کا مقام بھی ملے گا اور کسی ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تجربات بھی حاصل ہوں گے۔

تفریحی اور تعلیمی دورے

دینی مدارس سمیت ملک کے بیشتر عصری تعلیمی اداروں میں تفریحی اور تعلیمی دورے کی دو روایتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک تفریحی دورے، کہ طلبہ ایک جماعت کی شکل میں کسی استاد کے زیر نگرانی چھٹیوں کے دنوں میں سیر و تفریح کے لیے جاتے ہیں۔ اس کی زیادہ تر بنیاد مالی وسائل پر ہوتی ہے۔ چونکہ عام طور پر عصری تعلیمی اداروں کے پاس مالی وسائل زیادہ ہوتے ہیں اور مدارس بالعموم مالی وسائل کی کمی سے دوچار ہوتے ہیں اس لیے تفریحی دوروں کی روایت مدارس کے بہ نسبت عصری اداروں میں زیادہ ہے۔ دوسری روایت تعلیمی یا تربیتی دوروں کی ہوتی ہے۔ یہ روایت اگرچہ عصری اداروں میں بھی

پائی جاتی ہے لیکن مدارس میں اس کی کثرت ہے۔

مدرسوں میں اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ طلبہ کو جب اپنے علاقے یا اپنے علاقے سے تھوڑے فاصلے پر کسی دوسرے مدرسے میں کسی نامور عالم یا شیخ کی آمد کی اطلاع ملتی ہے تو خالص اپنے ذاتی شوق وذوق کے بنیاد پر دو دو چار چار طلبہ مل کر وہاں جانے کا اہتمام کرتے ہیں اور اکثر و بیشتر ہر طالب علم اپنی تمام تر مصروفیات چھوڑ کر اس نامور عالم یا شیخ کی محفل سے استفادے کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ یہ ایک اچھی روایت ہے مگر مزید بہتری کے خاطر اگر احتیاطی تدابیر اور ان دوروں کے اصلی مقاصد کے حصول کو یقینی بنانے کے لیے مدارس کے مہتممین ،نگران حضرات اور اساتذہ مل کر ان دوروں کو ادارہ جاتی شکل دیں تو شاید اس صورت میں شدتِ احتیاط کے بنا پر خطرات کا امکان کم اور مقاصد وفوائد کا حصول یقینی ہوگا۔ادارہ جاتی تشکیل کا طریقہ کچھ یوں ہو کہ اگر خواہش مند طلبہ کی تعداد زیادہ ہے تو دس دس طلبہ کی ایک جماعت بنائی جائے جس میں ایک نگران استاد ہو یا استاد کے بجائے کوئی سینئر طالب علم ہو اس صورت میں اگر ممکن ہو تو ادارہ تمام گروپوں کے مالی وسائل کا سارا بوجھ اٹھانے کے بجائے محض ہر گروپ کے فنڈ میں کچھ حصہ ڈالے۔اسی طرح اس دورے کا سارا بوجھ بھی ادارہ پر نہیں پڑے گا اور طلبہ کے لیے بھی اس میں کچھ سہولت رہے گی۔

دوسری روایت تفریحی دوروں کی ہے۔ جہاں تک ان دوروں کا تعلق ہے تو اگر چہ بالعموم مدارس میں مالی وسائل کی کمی کے باعث اس روایت کی قلت ہے لیکن طلبہ میں ذاتی طور پر اس کا ایک حد تک رجحان پایا جاتا ہے کہ ہم عمر طلبہ سیر وتفریح کے لیے جاتے ہیں۔اگر اس کو ایک اجتماعی شکل دی جائے اور مدرسہ کے طلبہ کے لیے کسی استاد کی نگرانی میں اس کا انتظام کیا جائے تو دوسرے لوگوں کے ساتھ جانے کے بہ نسبت یہ زیادہ بہتر ہوگا۔استاد کی معیت میں ایک تو طلبہ سیر وتفریح بھی کریں گے اور اپنے استاد کی اعلیٰ شخصیت کے اثرات اور خوبیاں مدرسے سے باہر خارجی ماحول میں بھی دیکھیں گے اور عام لوگوں کے ساتھ رویے اور سلوک کا طریقہ بھی سیکھیں گے۔

معلومات عامہ

تعلیمی اداروں میں بالعموم غیرنصابی امتحانات میں ایک حصہ معلوماتِ عامہ کے لیے بھی مختص کیا جاتا ہے۔معلومات عامہ کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں پاکستانیات، سیرت، تاریخ، سائنس و ٹیکنالوجی، دنیا کی تاریخ، صحابہ اور انبیاء کی تاریخ، دنیا کی مشہور تعمیرات، ادیب وشعرا، کتابیں اور نامور مصنفین اور دیگر بہت سی چیزوں کے متعلق معلومات اس کے دائرے میں آتی ہیں۔امتحان کے ایک حصے کا اس سے مربوط ہونے کی بناء پر عصری اداروں کے طلبہ اس سے ایک حد تک واقفیت رکھتے ہیں۔ لیکن مدارس میں اس کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔اگر مدارس میں بھی اس طرف تھوڑی سی توجہ دی جائے تو طلبہ کے حق میں زیادہ مفید ہوگا۔بالخصوص پاکستان کے متعلق طلبہ کو معلومات دی جائیں کہ اس کے حصول میں علما نے کیا تاریخ ساز کردار ادا کیا تھا لیکن مدارس کے طلبہ بالعموم اس سے کم واقف ہوتے ہیں۔اسی طرح تاریخِ اسلام بالخصوص خلافتِ عثمانیہ اور ترک قدیم وجدید کہ امت مسلمہ کا یورپ اور مغربی اقوام کے ساتھ تہذیبی اور نظریاتی کش مکش کی بنیاد وہیں سے پیوستہ ہے۔اس طرح مسلم خطے کے موجودہ حالات وواقعات سے بھی آ گاہی ضروری ہے۔اس کے حصول کا طریقہ کچھ اس طرح ہو کہ بزمِ ادب کا ایک حصہ اس کے لیے مختص ہو اور ہر بزم کے آخری حصے میں اگلی بزم کی تیاری کے لیے تاریخ کے ایک خاص دورانیے کو موضوع بنا کر اگلی بزم کے لیے مختص کر دیا جائے اور اس کے متعلق مختصر، آسان اور عام فہم کتاب کی نشاندہی کی جائے۔ایک کہانی کی طرح اس تاریخ کو بیان کرنا مطلوب نہ ہو بلکہ اس دور کی خلفا، مختصر الفاظ میں ان کی کارکردگی، ہر خلیفہ کے دور کے مشہور واقعات کی نشاندہی، معروف ومشہور کتابوں کے نام اور ارتقا یا انحطاط کے اسباب وغیرہ امور کے متعلق معلومات کا حصول ہو۔

اسی طرح پاکستان کے متعلق مختلف امور اور موضوعات پر ہر حصہ ایک بزم کے لیے مختص کیا جائے اور تیاری کے لیے آسان اور مختصر کتاب کی نشاندہی کی جائے۔ بزم ادب کے اس متعین حصے میں یا تو استاد ایک ایک سوال پوچھے اور طلبہ سے جواب طلب کرے، جاننے والے طلبہ بتائے بغیر

صرف اپنا ہاتھ کھڑا کریں۔ پھر باری باری ایک ایک سے جواب پوچھے۔ یا دوسری صورت یہ کہ طلبہ کے گروپ بنائیں اور ہر گروپ سے برابر سوالات پوچھیں جس گروپ کی غلطیاں کم ہوں اس کو چھوٹے سے انعام کا مستحق ٹھہرائے۔ یہی طریقہ کار شعر و ادب سے دلچسپی پیدا کرنے کے لیے مشاعرہ یا بیت بازی کے انعقاد کے لیے بھی اپنایا جا سکتا ہے۔

دینی مدارس کے لیے تدریب المعلمین

اور تخصصاتِ دینیہ کا نظام*

نشست کے آغاز میں ڈائریکٹر جنرل، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز خالد رحمٰن نے شرکاء کو خوش آمدید کہتے ہوئے آئی پی ایس کا مختصر تعارف پیش کیا اور بتایا کہ انسٹی ٹیوٹ نے قیام کے آغاز ہی سے تعلیم، قومی تعلیمی پالیسی اور تعلیمی نظام کی اسلامائزیشن کو اپنے علمی اور تحقیقی منصوبوں میں شامل کیا ہوا ہے۔ اس کام کے تسلسل میں ۱۹۸۶ء سے دینی مدارس پر تحقیق اور ادارتی سطح پر ان کی نشوونما کے لیے مختلف سرگرمیوں کا انعقاد ہوتا رہا ہے۔ اس موضوع پر ''دینی مدارس کا نظام تعلیم'' انسٹی ٹیوٹ کی پہلی کتاب ہے جو ۲۳، ۲۴ نومبر ۱۹۸۶ء کو منعقد ہونے والے سیمینار کی کارروائی پر مشتمل تھی۔ تحقیق کے ساتھ ساتھ دینی مدارس کے حوالے سے انسٹی ٹیوٹ کا کام تین نوعیت کا ہے: مجالس مذاکرہ، تربیت اساتذہ اور مطبوعات۔ اب تک منعقد ہونے والے تربیتی پروگرامات اور مجالس مذاکرہ کی تعداد چالیس سے متجاوز ہے جبکہ مقالات و مطبوعات کی تعداد دس ہے۔

تدریب المعلمین کے سلسلے میں منعقد ہونے والے پروگرامات میں اب تک کم و بیش ایک ہزار افراد نے شرکت کی ہے۔ یہ پروگرامات کم از کم ایک روز اور زیادہ سے زیادہ پندرہ روز پر مشتمل تھے، اور بالعموم ان میں تمام وفاق/تنظیم کے مدارس کی بیک وقت شرکت کا اہتمام کیا گیا۔ ان پروگرامات کے شرکا کی تجاویز کی روشنی میں کام کو وسیع تر دائرے میں آگے بڑھانے اور زیادہ مؤثر بنانے کے لیے تمام وفاق/تنظیم کے ذمہ داران کے ساتھ آج کی نشست کا اہتمام ہو رہا ہے۔ نشست کے پہلے حصے میں

---

* ۱۹ فروری ۲۰۰۹ء کو انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد کے زیر اہتمام تنظیم/وفاق ہائے مدارس کے ذمہ داران کے ساتھ ''تدریب المعلمین'' اور ''تخصصات دینیہ'' کے موضوع پر منعقدہ نشست کی روداد۔

تدریب المعلمین کے آئندہ پروگرام پر گفتگو ہو گی جب کہ دوسرے حصہ میں تخصصات دینیہ کے حوالے سے جناب مولانا زاہد الراشدی صاحب کی تجویز کی روشنی میں گفتگو ہو گی۔

انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام آئندہ پروگرام ترتیب دیتے ہوئے ہم آج کی اس نشست کو اپنے لیے راہنمائی کا ایک اہم موقع سمجھتے ہیں۔

مولانا محمد حنیف جالندھری (وفاق المدارس العربیہ)

میں پروفیسر خورشید احمد، جناب خالد رحمٰن اور انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے دیگر رفقاء کا شکر گزار ہوں۔ جناب خالد رحمٰن نے انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام اب تک مدارس کے حوالہ سے کیے جانے والے کام کا بڑا اچھا تعارف پیش فرمایا ہے۔اسی تسلسل میں آج کی نشست کے دونوں موضوعات بڑے اہم ہیں۔

جہاں تک تدریب المعلمین کا تعلق ہے اس کی ضرورت، افادیت اور اہمیت سے کسی بھی ذی شعور کو انکار نہیں ہوگا۔ درحقیقت ذرائع علم میں کتابیں، ماحول اور مدرسہ ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ استاد سب سے اولین حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے کہ باقی تمام چیزیں جاندار نہیں ہیں۔ نہ کتابیں بولتی ہیں، نہ ماحول بولتا ہے اور نہ ہی درسگاہ اور اس کے در و دیوار۔ استاد ہی ایک جاندار آلۂ علم اور ذریعۂ علم ہے۔ تو استاد چونکہ اصل ہے اس لیے جتنا وہ ماہر ہوگا اس سے کسب فیض کرنے والے شاگرد بھی اسی قدر ماہر ہوں گے۔ اس تناظر میں آپ نے تدریب المعلمین کی جو تجویز دی ہے اس سے اصولی طور پر اتفاق ہے۔ لیکن تدریب المعلمین کے دو پہلو سامنے رہنا ضروری ہیں۔ ایک پہلو کا تعلق نصاب تعلیم سے اور دوسرے کا تعلق نظام تعلیم یا انداز تدریس سے ہے۔

جہاں تک نصاب تعلیم کا تعلق ہے اس میں ضروری ہے کہ استاد کو یہ معلوم ہو کہ فلاں فن، فلاں کتاب اور فلاں علم میں نے کیسے پڑھانا ہے۔ ظاہر ہے کہ استاد کو یہ تربیت ماہر اساتذہ ہی دے سکتے ہیں۔ جن کا اس میدان میں بہت زیادہ تجربہ ہو۔ کیوں کہ دیکھا یہ گیا ہے کہ تدریس کے دوران بعض

اوقات غیر ضروری مباحث بیان ہو جاتے ہیں اور ضروری مباحث کسی وجہ سے نظر انداز ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ ایک مسئلہ جسے اختصار کے ساتھ بیان ہونا چاہیئے اس میں بہت زیادہ طوالت ہو جاتی ہے۔ یا چند ابواب جو کہ ہر کتاب میں مکرر ہوتے ہیں، ان میں تکرار ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر کتاب الطہارۃ پر تدریس کے دوران لمبی لمبی بحث ہو جاتی ہے، لیکن اس کے بعد اخلاقیات، کتاب البیوع یا دیگر پر سرسری انداز سے گزرتے ہوئے پوری طرح توجہ نہیں ہو پاتی۔

عرض کرنے کا منشا یہ ہے کہ تدریب المعلمین کا ایک حصہ وہ ہے جس کا تعلق درس نظامی کے نصاب اور اس کے طریقہ تدریس کے ساتھ ہے۔ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ جو ماہر اساتذہ ہیں وہ اپنے تجربے کی روشنی میں بتائیں کہ فلاں فن کے لیے یہ کتابیں ہیں جن سے مدد لی جاسکتی ہے۔ اور یہ یہ مباحث زیادہ ضروری ہیں ان کو بیان کریں اور یہ غیر اہم مباحث ہیں ان کو بیان کرنے سے گریز کریں۔ اس سلسلے میں تدریب المعلمین کے لیے ایسے ماہر اساتذہ درکار ہوں گے جن کا تجربہ میرے خیال میں کم از کم بیس سال ہونا چاہیے۔ کیوں کہ اتنا تجربہ رکھنے والے ہی صحیح رہنمائی کر سکتے ہیں۔

اس کا دوسرا پہلو نفسیاتی ہے۔ کہ آج کے دور میں جو طریقہ تدریس یا طریقہ تعلیم ہے اس کے اندر طلبہ کی نفسیات، علمی سطح، ذہنی سطح اور ان کے فہم و دانش کو سامنے رکھ کر تعلیم دینے کا اہتمام کرنا۔ خود جناب نبی کریم ﷺ ایک بات کو بار بار دہراتے تھے تاکہ اچھی طرح سے سمجھ لی جائے۔ حضور ﷺ پڑھاتے ہوئے دائیں، بائیں اور ہر طرف اپنے چہرہ انور کو پھیرتے تھے اس لیے کہ مواجہہ سے بہت ساری باتیں سمجھ آتی ہیں۔ اسی طرح یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ آج مار کا زمانہ نہیں ہے۔ اگر آپ طالب علم کو ماریں گے تو وہ کبھی بھی پڑھنے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔ زمانہ بدل گیا ہے، ایک دور تھا جب آپ طلبہ کی پٹائی کرتے تھے تو وہ اس کو بھی سعادت سمجھتے تھے۔ آج تو اپنے بچے کو بھی کچھ کہتے ہوئے انسان محتاط ہوتا ہے۔ تو یہ نفسیاتی چیزیں ہیں۔ کہ بچے کو پڑھانا کیسے ہے؟ پیار، محبت اور ترغیب کے کون سے انداز ہیں؟ یہ تدریب المعلمین کا دوسرا حصہ ہے۔

تیسرا حصہ تدریب کا وہ آجاتا ہے کہ استاد اپنے تدریسی عمل میں ملکی اور عالمی حالات کو پیش نظر

رکھے۔اس حوالہ سے ایک بہت بڑی کمی جو میں محسوس کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہمارا پڑھانا تطبیقی نہیں ہوتا۔ یعنی آج جو کچھ ہم پڑھا رہے ہیں ان کو موجودہ حالات پر منطبق کرنا۔مثال کے طور پر اگر ہم کتاب البیوع پڑھا رہے ہیں۔بیع کی کچھ تو وہ صورتیں ہیں جو قدیم زمانے میں رائج تھیں آج صورتحال کئی طرح سے مختلف ہوسکتی ہے۔جیسا کہ بیع غرر ہے،آج اس کی کیا صورتیں ہیں؟ **بیع حبل الحبلہ** ہے اسی طرح **ملابسہ** ہے، یہ وہ چیزیں ہیں جن کے بارے میں یہ جاننا کہ موجودہ زمانے میں ان کی کیا صورتیں ہیں؟ یا جیسے ہم **کتاب المساقات و المزارعات** پڑھاتے ہیں جس میں باغوں کا، کھیتیوں کا اور کاشت کا بیان پڑھاتے ہیں۔ان کی آج مروجہ صورتیں کیا ہیں؟ ان کا کیا حکم ہے؟ اس زمانے میں صورتیں کچھ اور تھیں جو آج سے مختلف ہیں۔اس زمانے میں کنویں تھے ان کے بارے میں ہم پڑھتے ہیں کہ یہ صورت ہو تو کنواں ناپاک ہو جائے گا، پاک کرنے کا یہ طریقہ ہے۔لیکن آج تو طالب علم کو کہیں کنواں نظر نہیں آتا۔

ہمارا جو معاشی نظام ہے آج اس میں ایک بینکنگ کا شعبہ ہے۔تجارت صرف مقامی اور قومی سطح پر ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر ہو رہی ہے۔ ٹیلی فون، فیکس اور ای میل E-mail پر تجارت ہو رہی ہے۔ تجارت کی ان صورتوں کا کیا حکم ہے؟ موجودہ بینکاری کے نظام پر یہ صورتیں کیسے منطبق ہوتی ہیں؟ خلاصہ کلام یہ کہ ہمارے ہاں تدریس تطبیقی نہیں ہے۔طالب علم جو پڑھ رہا ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ مجھے علم مل رہا ہے اور یہ برکت کے لیے بھی ہے۔لیکن آج کی زندہ دنیا میں، باہر مارکیٹ میں میں اپنے علم کو کیسے منطبق (Apply) کروں گا، یہ اس پر پوری طرح واضح نہیں ہے اور یہ میرے خیال میں زیادہ ضروری ہے۔

اس ضمن میں ایک بڑا کام کرنیکی ضرورت ہے۔اگر تمام وفاق مل کر یہ انتظام کریں، آئی پی ایس کا تعاون بھی حاصل ہو، کہ چند ایک اہل علم اس کام پر اس طرح لگائے جائیں کہ ان کی ضروریات کا باقاعدہ انتظام بھی کیا جائے۔ان کی ذمہ داری ہو کہ احادیث کی کتب میں سے چند ایک صلبی کتب کا انتخاب کریں اور ان میں شریعت کے جتنے بھی احکام اور مسائل ہیں ان کو انطباقی انداز میں مرتب

کریں۔تو وہ استاد کے لیے ایک رہنما چیز ہوگی، جو کم از کم اس وقت موجود نہیں ہے۔ ہمارے یہاں کتب کی جو شروح لکھی گئی ہیں ان میں بعض حضرات نے موجودہ دور کے مسائل کے احکام منطبق کیے ہیں۔لیکن اکثر شروح میں آج کی مروجہ صورتیں نظر نہیں آئیں گی۔ یوں دوران تعلیم لگتا یہ ہے کہ جو میں پڑھ رہا ہوں اس کا تعلق دور ماضی سے ہے، دور حاضر اور مستقبل سے نہیں ہے۔

تدریب المعلمین کے حوالہ سے یہ چند تجاویز میرے ذہن میں ہیں۔ یہ کام بہت اہم ہے، البتہ صرف دو یا تین دن کی ورکشاپ میرے خیال میں اتنی زیادہ مفید نہیں ہوگی۔ اس میں صرف آپ اخلاقی پہلو اور طلبہ کے نفسیاتی پہلو بتا سکتے ہیں، اسی طرح کچھ تھوڑے بہت اجمالاً عالمی حالات اور تقاضے بتا سکتے ہیں۔لیکن طویل المیعاد پروگرام کے نقطہ نظر سے ضرورت یہ ہوگی کہ تدریب المعلمین میں نصاب تعلیم، نظام تعلیم اور طرق تدریس سے متعلق موضوعات پر ٹھوس کام ہو اور اس کے لیے ضروری مواد بھی تیار ہو۔

مولانا یٰسین ظفر (وفاق المدارس السّلفیہ)

تدریب المعلمین کے سلسلے میں قاری محمد حنیف جالندھری صاحب نے تمام ضروری باتوں کا احاطہ کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں دو تین تجاویز میرے ذہن میں بھی ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام تربیتی پروگرام کے حوالہ سے اکثر میں سوچتا ہوں کہ آپ کے ہاں ہمارے جو اساتذہ آتے ہیں وہ تدریسی فرائض چھوڑ کر آتے ہیں تو ظاہر ہے وہاں بھی ایک مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ پھر یہاں ایسے ماہرین ان کو تربیت دیتے ہیں جن کی اکثریت براہ راست مدارس سے متعلق نہیں ہوتی۔ اور وہ اپنے تجربات کی روشنی میں ہی ساری بات کرتے ہیں۔ آئندہ کے لیے میری تجویز یہ ہے کہ اگر ہر وفاق اپنے ہاں سے ایسے اساتذہ، جن کی تدریسی خدمات کو بیس سے پچیس سال ہو چکے ہوں، ان کو تدریس سے کچھ عرصہ کے لیے فارغ وقت دیں اور وہ یہاں آکر تربیت حاصل کر سکیں۔ جیسا کہ قاری صاحب نے متوجہ کیا کہ وقت تھوڑا زیادہ ہونا چاہیے تا کہ اس سلسلے میں جتنے بھی ضروری موضوعات ہیں ان کو سمیٹا جا سکے۔

یہ تجویز بھی اچھی ہے کہ وہ بعد میں جا کر اپنے اپنے مسالک یا وفاقوں کے زیر اہتمام مدارس میں یہ فریضہ سرانجام دیں، لیکن یہ بھی تب ہی ممکن ہے جب ان کے پاس تدریسی فرائض سے کچھ فرصت ہو گی۔ اگر واپسی پر جا کر وہ خود ہی اپنی تدریس میں مصروف ہو گئے تو کیسے یہ کام کر سکیں گے۔ مدارس کا سلسلہ پورے پاکستان میں پھیلا ہوا ہے۔ سب کو ایک جگہ اکٹھا کرنا ممکن نہیں، البتہ صوبوں یا ڈویژن کے اعتبار سے ان کو اکٹھا کر کے یہ کام کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اگر ایسے اساتذہ کی خدمات لی جائیں ان کو تربیت دی جائے، وفاق ان کا بوجھ اٹھائیں اور وہ اساتذہ یہ فریضہ مختلف مقامات پر سرانجام دیں تو اس کے دوررس نتائج برآمد ہو سکتے ہیں اور یہ سلسلہ مستقل طور پر جاری رہ سکتا ہے۔ یہ بالکل اس طرح ہو گا جیسے نصاب سازی اور کتابوں کی تبدیلی، ہر سال ہر وفاق کرتا ہے اور اس پر غور و فکر جاری رہتا ہے۔ اسی طرح تدریب کے اندر بھی نئی نئی چیزیں شامل ہوتی رہیں گی، اس اعتبار سے یہ کام ضرور ہونا چاہیے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مدارس میں اساتذہ کا بھی بعض موضوعات میں تخصص ہوتا ہے۔ کسی کا فقہ میں، کسی کا تفسیر اور حدیث، یا ادب اور تاریخ میں۔ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام پروگراموں میں جو لوگ آتے ہیں ضروری نہیں کہ وہ ان سارے ہی موضوعات پر دسترس رکھتے ہوں۔ بلکہ ان کی شناخت اور دائرہ کار کسی ایک موضوع میں ہو گا۔ فطری طور پر اگر اسی موضوع پر فیلڈ میں جا کر وہ بتائے گا تو زیادہ بہتر ہو گا۔ اس اعتبار سے وفاق بھی اور آپ (آئی پی ایس) بھی یہ اہتمام کریں کہ ایسے لوگوں کو شامل کریں جن کا مطالعہ وسیع ہے۔ اگر ان کی اچھی تربیت ہو جائے گی تو وہ جا کر کسی بھی موضوع پر عمدہ بات کر سکیں گے۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی ہمارے پیش نظر رہنی چاہیے کہ بلاشبہ اصول تدریس، اسلوب، یا تربیت بہت اہم پہلو ہیں لیکن اس سے بڑھ کر ایک موضوع جس کو ہم مدارس والے بھی محسوس کرتے ہیں وہ نظم و نسق اور نظام کی پابندی ہے۔ ہمارے ہاں اساتذہ بہت اچھی تدریس کر لیں گے، لیکن نظام میں رہ کر اصولوں کی پابندی اکثر ان کے لیے مشکل ہوتی ہے۔ مثلاً کچھ مدارس ایسے ہیں جن میں عمر کی

کوئی قید نہیں، کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی ابتدائی کلاسوں کے ساتھ بخاری پڑھنا چاہے تو اسے کیوں روکا جائے۔ وہ کسی وقت بھی ایک پیریڈ یا دو پیریڈ پڑھ لے، عمر کے کسی حصے میں بھی آ جائے تو اسے قبول کر لینا چاہیے۔ یہ تصورات بہر حال موجود ہیں۔ اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ نظام اور قواعد وضوابط جو اداروں کی بہتری کے لیے بنائے جاتے ہیں ان کے فوائد اور ثمرات سے بھی متعلمین کو آگاہ کیا جائے کہ مدارس کے اندر جہاں اسلوب تدریس پر بات ہو وہیں نظام کی پابندی کے حوالے سے بھی توجہ دلائی جائے۔

علامہ نیاز حسین نقوی (وفاق المدارس الشیعہ)

قاری حنیف جالندھری صاحب اور ڈاکٹر یسین ظفر صاحب نے اچھی باتیں کی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دینی اور دنیوی تعلیم میں کافی فرق ہے لہذا اس کے اسلوب میں بھی فرق ہے۔ دینی تعلیم میں چار مرحلے ہیں جو ہمارے مدارس میں تعلیم کے دوران مدنظر رکھے جاتے ہیں۔ ایک ابتدائی مرحلہ ہے جس میں میرے خیال میں سارے وفاق شریک ہیں جس کو ہم ادبیات کہتے ہیں، ابتدائی مرحلے میں ہر طالب علم کے لیے نحو، صرف، منطق اور فلسفہ کا جاننا ضروری ہے چاہے اس کا تعلق کسی بھی وفاق سے کیوں نہ ہو۔ اس مرحلے کے دورانیے میں اختلاف ہوسکتا ہے لیکن یہ فن ہر طالبعلم کو پڑھنا پڑتے ہیں۔ اس کے بعد کے مراحل میں فقہ اور اصول، منطق اور فلسفہ میں بھی بڑی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں تو ظاہر ہے کہ تعلیم کا طریقہ کار سب مراحل کے لیے ایک جیسا نہیں۔ چنانچہ ایک استاد سب مراحل کو نہیں پڑھا سکتا۔

اس تناظر میں تدریب المعلمین کے عنوان سے پروگرام بناتے ہوئے ان مراحل کو بھی مدنظر رکھا جائے۔ ابتدائی مراحل کے استاد کو جو طریقہ سکھانا ہے وہ دوسرے، تیسرے اور چوتھے مرحلے کے استاد کے مقابلہ میں مختلف ہوگا۔ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام جو پروگرامات ہوتے رہے ہیں ان میں ہمارے مدارس کے اساتذہ بھی شریک رہے ہیں۔ یہ کہنا تو ٹھیک نہیں کہ ان کا کوئی فائدہ نہیں کیوں کہ ہر کام کا کوئی نہ کوئی فائدہ تو ہوتا ہے۔ لیکن جو ایک یا دو اساتذہ آتے ہیں ان کو ایک ہی طرح کا طریقہ سکھایا

جاتا ہے۔ یوں جو کچھ وہ سیکھتے ہیں وہ ہر مرحلے پر لاگو نہیں ہوتا۔ سب ہی لوگ یہ جانتے ہیں کہ بچوں اور بڑوں کو تعلیم سکھانے کا طریقہ کار مختلف ہے۔ چنانچہ جس آدمی نے چھوٹے بچوں کو پڑھانا ہے وہ اسی انداز سے بیس سال یا اس سے زائد کے طلبہ کو نہیں پڑھا سکتا۔ یوں یہ ایک پیچیدہ اور مشکل کام ہے، اس میں آپ اور اسی طرح تنظیم/وفاق ہائے مدارس کے علماء بیٹھ کر مختلف مراحل کے حساب سے طریقہ کار اپنانے کا پروگرام بنائیں۔ اسی طرح وہ استاد جا کر ان بچوں کو تعلیم دے گا جن کی عمر کے لحاظ سے اسے رہنمائی حاصل ہو۔

ایک ضرورت یہ بھی ہے کہ آج کل کے تناظر میں مشکل کتابوں کی جگہ آسان کتابیں شامل کی جائیں، اور جس موضوع پر ایسی آسان کتب نہ ہوں تو لکھنے کا اہتمام کیا جائے۔ لیکن اس کا ایک نقصان یہ ہے کہ جو مشکل کتابیں ہم لوگ پڑھاتے ہیں تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ طالبعلم میں استعداد اور قوت اور قدرت پیدا ہو، تاکہ وہ صحیح معنوں میں عربی اصطلاحات سمجھ سکیں۔ جب بچہ ایک مشکل کتاب سمجھ لیتا ہے تو باقی کتابیں وہ آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ مشکل کتب کو چونکہ ہر استاد نہیں پڑھا سکتا لہٰذا اس درجہ کے اساتذہ کے لئے خاص تربیت کی ضرورت ہے۔ ایسا نہیں کہ ہم ہر اس فرد کو بھیج دیں جس کا کام تعلیم وتدریس ہے وہ یہ ساری باتیں سیکھ سکیں۔

اس سلسلے میں ایسا طریقہ کار وضع کیا جائے کہ ہر ہر مرحلہ کے استاد کے لئے الگ تربیتی پروگرام رکھا جائے۔ کتابوں کے حساب سے بھی پانچوں وفاق مشورہ کریں اور کم از کم وہ کتابیں جو مشترک ہیں اس کے حوالے سے ایسا نصاب منتخب کریں جو ہر وفاق پڑھا سکتا ہو۔ ایسا نہ ہو کہ صرف، نحو اور منطق جیسے فنون کی الگ الگ کتابیں پڑھا رہے ہوں۔ کم از کم فقہ کے مرحلے سے پہلے سب وفاق ایک نصاب بنا سکتے ہیں۔ اور جب ایک نصاب ہوگا تو تربیت کا کام بھی آسان ہوگا۔ وفاقوں سے اس سلسلے میں بھی گفتگو کی جائے کہ پہلے تین سال جس کو ہم نحو، صرف اور ادبیات کا مرحلہ کہتے ہیں اس کے لیے ایک نصاب اور نظام بنایا جائے۔ اور جب فقہ اور تفسیر کا مرحلہ شروع ہو تو ہر وفاق اپنے لحاظ سے کتب کا انتخاب کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ اس بات کو بھی مدنظر رکھیں کہ مربی کی تعلیم زیر تربیت اساتذہ سے

زیادہ ہو، ایسا نہ ہو کہ زیر تربیت بہت بڑا علامہ ہو جبکہ مربی کم تعلیم یافتہ ہو۔ چونکہ تربیت کے بعد اساتذہ نے جن کتابوں کو پڑھانا ہے اس کا اگر مربی کو علم ہی نہیں تو وہ ان کی صحیح رہنمائی کیسے کرسکتا ہے۔ اس کو بھی ضرور مدنظر رکھیں۔ پہلے سے جو طریقہ کار آپ کے ہاں چل رہا ہے اس کے فائدے سے تو انکار نہیں البتہ وہ کافی نہیں تھا۔

ایک تجویز یہ ہے کہ اگر آپ کے لیے ممکن ہو تو تدریب المعلمین کے لیے سب لوگوں کو اسلام آباد بلانے کے بجائے ہر صوبے یا ہر ڈویژن میں یہ پروگرام منعقد ہو۔ کیوں کہ اسلام آباد میں تو ایک یا دو اساتذہ آسکتے ہیں لیکن اگر لاہور یا دیگر شہروں میں ہو تو سب اساتذہ اس میں شرکت کر کے فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اور ایسے وقت کا انتخاب ہو کہ استاد کی تدریسی مصروفیات بہت زیادہ متاثر نہ ہوں۔

مولانا ڈاکٹر محمد سرفراز نعیمی (تنظیم المدارس اہلسنت)

میں محترم پروفیسر خورشید احمد صاحب اور اس انسٹی ٹیوٹ کے ان تمام ذمہ دار افراد کا شکریہ ادا کرتا ہوں جو ایک جذبے اور مشن کے تحت کام کر رہے ہیں۔ اس زمانے میں کتنے افراد ہیں جو دینی مدارس کے بارے میں واقعی اصلاح کے نقطۂ نظر سے سوچتے ہیں۔ یہ تو سوچا جا رہا ہے کہ مدارس کو کس طرح کنٹرول یا ختم کیا جائے۔ لیکن ان میں اصلاح اور ان کی بارآوری کے بارے میں شاید ہی کوئی آپ کے علاوہ سوچ رہا ہو۔ انفرادی اعتبار سے شاید کوئی مثال موجود ہو لیکن اجتماعی اور اداراتی اعتبار سے آپ کا یہ عمل بہت قابل تحسین و تعریف ہے۔

وفاقوں کے منضبط اور منظّم ہونے سے ایک فائدہ باقاعدہ نظام کی تشکیل کی صورت میں ہوا ہے۔ اب ایسا نہیں کہ ایک بچہ دو سال میں دورہ کر کے فارغ ہو جائے، بلکہ ایک سسٹم بن گیا ہے کہ مڈل کے بعد اس نے آٹھ سال لگانے ہی لگانے ہیں۔ مڈل کے بعد اس کو ثانویہ عامہ، خاصہ اور اسکے بعد عالیہ اور عالمیہ کرنا ہوگا۔ دورانیے کے اعتبار سے یہ بڑا منظّم سسٹم بن گیا ہے۔ دوسرا یہ کہ چونکہ اب امتحانات تحریری ہوتے ہیں اس لیے طلبہ میں اظہار اور مافی الضمیر کا ملکہ پہلے سے بہتر پیدا ہوا ہے۔

دینی نظام تعلیم میں ایک چیز جو اہمیت کی حامل ہے وہ کتاب ہے۔ کتاب کو پڑھاتے ہیں اور مضمون اس کے تابع ہوتا ہے۔ جبکہ عام تعلیمی نظام میں مضمون اصل ہوتا ہے اور کتاب رہنمائی کرتی ہے۔ استاد لیکچر دیتا ہے، ضروری نہیں ہے کہ طالب علم کتاب کو لفظ بہ لفظ یاد کرے۔ جبکہ درس نظامی کی کتاب میں ہر ہر لفظ کے بارے میں بحث ہوتی ہے۔ مثلاً مصنف نے یہ لفظ یہاں کیوں ذکر کیا، اس کا ماقبل و مابعد سے کیا تعلق ہے، اس میں کیا معنی پوشیدہ ہیں۔ اس ساری گفتگو اور بحث کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ طالبعلم کے اندر سوچ و بچار کا ملکہ اور تفکر کا انداز پیدا ہو۔ اسی لیے آپ دیکھیں گے کہ مدارس کے نظام میں دوسرے نظاموں کے مقابلہ میں شروع سے آخر تک تدبر اور تفکر کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ کیونکہ درس نظامی کے پورے نظام کا مقصد قرآن وحدیث کو سمجھنا ہے اور تفقہ اور تدبر کیے بغیر وہ سمجھا نہیں جا سکتا۔ قیاس کرنا ہے، دلیل تلاش کرنی ہے، علت مشترکہ تلاش کرنی ہے۔ یہ سب تدبر و تفقہ کا تقاضا کرتا ہے۔ اسی کے پیش نظر یہ نظام تشکیل دیا گیا ہے جس سے ہم بالکل انکار نہیں کر سکتے۔ اس لیے وہاں کتابوں کی اپنی ایک اہمیت ہے اور ان کا وجود باقی رہنا چاہیے۔

اس کے ساتھ ساتھ تدریس کے اصول وضوابط اپنی جگہ قائم رہنے چاہییں۔ لیکن اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ فی زمانہ اس اصول اور ضابطے پر کیا مثال منطبق آرہی ہے تا کہ ماضی اور حال کا ایک امتزاج اس کے اندر پیدا ہو سکے۔ مثال کے طور پر صرف (عربی گرامر) کے اندر ضرب یضرب (مارنا) کی مثال دی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن شریف میں یہ مثال موجود ہے، کسی زمانے میں علماء نے قرآن کو سمجھنے کے لیے وہ چیزیں لیں جن کا تعلق قرآن کے ساتھ تھا۔ لیکن فی زمانہ اس مثال کے بجائے کوئی اور مثال بہتر ہوگی کیونکہ اس مثال سے ہر بچے اور استاد کے ذہن میں یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ مارنا اور مار کھانا زیادہ ضروری ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ مشترکہ کوشش کر کے مثالوں کو اس انداز سے بدلیں جو زمانہ حال کے تقاضوں کو پورا کر سکیں اور اس کے ساتھ ہی طلبہ کے اندر وہ ملکہ پیدا ہو کہ وہ مشرق وسطی میں بولی جانے والی عربی زبان کو آسانی کے ساتھ سمجھ اور بیان کر سکیں۔ اس پس منظر میں مدارس میں ابتدائی تین چار سال کے لیے کتاب زیادہ اہمیت کی حامل ہے البتہ اس

کے بعد لیکچر کا طریقہ بھی استعمال ہونا چاہیے۔ کیوں کہ ایک لیکچر بیک وقت بہت سے پہلوؤں کو گھیرے ہوئے ہوتا ہے۔

اب تک درس نظامی میں جو کوشش ہوئی ہے وہ ہے انفرادی ملکہ۔ استاد کی اپنی خصوصیات جن کی مدد سے وہ طلبہ کو پڑھائی کی طرف لاتا ہے۔ یہ بنیادی طور پر افراد پر منحصر ہے۔ ہر معلم کا انداز تدریس اس میں اہمیت رکھتا ہے۔ یہ چیز اپنی جگہ قابل تحسین ہے لیکن زیادہ بہتر ہوگا کہ بنیادی طور پر نفسیاتی پہلو اور عمر کے تقاضوں کو بھی مدنظر رکھ کر کام کیا جائے۔

اس اعتبار سے اصول تو وہی رہیں گے مثالوں میں تبدیلی آئے گی۔ اس کی ایک مثال نیا بینکنگ سسٹم ہے۔ اس نظام میں نئی نئی اصطلاحات آئی ہیں اب ضرورت پڑے گی ایسی کتاب کی تالیف کی جس میں آج کی اصطلاحات ہوں۔ یہ واضح ہو کہ PLS، Debit، Credit کا مطلب کیا ہے؟ تاکہ ایک استاد جب یہ موضوع پڑھانا چاہے تو بہتر انداز سے پڑھا سکے۔

جس طرح اسکولوں میں بی ایڈ، ایم ایڈ وغیرہ علیحدہ علیحدہ ڈگریاں ہیں، جس طرح وہاں مختلف درجات میں تدریس کے لیے سسٹم آف ایجوکیشن بنائے گئے ہیں۔ اسی طرح ہمیں بھی ثانویہ عامہ، ثانویہ خاصہ، عالیہ اور عالمیہ۔ جو کہ میٹرک سے لے کر ماسٹر تک کے مساوی ہیں کے علیحدہ علیحدہ درجات کے اعتبار سے پروگرام بنانا چاہیے تاکہ اساتذہ کی اہلیت کے مطابق ان کو تربیت دی جا سکے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی مدنظر رہنی چاہیے کہ مدارس کے اندر تقریباً پچاس فیصد افراد عمر کے اعتبار سے پچاس سے متجاوز ہیں۔ اب عمر رسیدہ افراد کو بالعموم ان تربیتی پروگراموں شریک کرنا ممکن نہیں، امکان ہے کہ وہ اس میں اپنے لیے کم ہی قبولیت محسوس کریں گے۔ ایسے افراد کے لیے تدریسی مہارتوں کے حوالہ سے ایک کتاب تیار کی جائے تاکہ وہ اس سے استفادہ کر سکیں۔ نوجوان اساتذہ کے لیے البتہ دو صورتیں ہیں۔ ایک وہ جو تدریس کر رہا ہے اور ایک وہ جو ابھی فارغ ہوا ہے اور تدریس شروع کرنی ہے۔ نئے فارغ ہونے والوں کے لیے نصاب بنایا جائے تاکہ وہ آگے جا کر بہتر انداز سے تدریس شروع کر سکیں۔ جبکہ تدریس کے عمل میں شریک اساتذہ کو ورکشاپ کے ذریعے تربیت دی

جا سکتی ہے۔

اب چونکہ جدید اور قدیم نظام تعلیم مختلف ہے لہٰذا تدریب المعلمین کے لیے دونوں طرح کے افراد کو بٹھا کر نصاب بنانا پڑے گا تا کہ نئے اور پرانے تقاضے اس میں جمع ہو جائیں اور اُن میں تعارض نہ ہو۔ اس کے لیے ایسے ماہرین کا انتخاب کیا جائے جو تدریس کر رہے ہیں اور اپنے اپنے میدان میں اہل فن میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی مشترکہ کوشش سے یہ نظام ترتیب دیا جا سکتا ہے۔ جب یہ سسٹم بن جائے گا تو اس کا نفاذ کیسے ہو؟ جبری نفاذ تو ممکن نہیں ہے۔ لیکن اگر باہم مشاورت سے کیا جائے اور یہ باور کرانے کی کوشش کی جائے کہ ہم نئے آنے والے اساتذہ کو بہتر انداز سے اپنا کام شروع کرنے میں رہنمائی فراہم کرنا چاہتے ہیں تو ممکن ہے۔

اس وقت صورتحال یہ ہے کہ خطیب صاحب خطبہ ارشاد کر رہے ہیں لیکن بیشتر مقامات پر سامعین کو ان سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، لہٰذا وہ بمشکل اس وقت آتے ہیں جب نماز کے وقت میں محض پانچ منٹ باقی رہ جائیں۔ اس کی وجوہات اور اسباب ہمیں تلاش کرنے چاہییں۔ یہ اس لیے ہے کہ ہم حالاتِ حاضرہ اور وقت کے تقاضوں کے حوالے سے ابلاغ اور علم کا کوئی ایسا فورم مہیا نہیں کر رہے جس کو سننے کے لیے لوگ جمعے کے دن جلدی آئیں۔ ہمیں اس بارے میں بھی سوچنا چاہیے اور معلمین کے تربیتی پروگرام میں شامل کیا جائے کہ جمعہ کے خطبات میں اس پہلو کو بھی پیش نظر رکھیں۔

ایک تجویز ہے کہ جب آپ یہاں ورکشاپ کریں تو جو اساتذہ شریک ہوں ان کی رہائش کا ذمہ دار خود وفاق ہو۔ وفاق اپنے مدارس مقرر کریں کہ رہائش انہوں نے دینی ہے۔ اس سے آپ کا خرچہ کم ہوگا جو دیگر مقامات پر استعمال ہو سکے گا۔ اسی طرح دیگر صوبوں میں بھی جب پروگرام ہو تو وفاق اور تنظیم اپنے اپنے اساتذہ کے اخراجات کا انتظام کریں۔ یہ قابل عمل تجویز ہے۔

مولانا ڈاکٹر طاہر محمود (الجامعۃ السّلفیہ۔اسلام آباد)

آئی پی ایس اور اس کے ذمہ داران لائق تبریک ہیں کہ انہوں نے آج کی اس مجلس میں ایک

خوبصورت گلدستہ سجایا جس کے ہر پھول کی خوشبو دوسرے کو معطر کر رہی ہے۔ محترم قاری حنیف جالندھری نے ابتداء میں جن دو باتوں کی طرف توجہ دلائی، نظام تعلیم اور طریقہ تدریس، اس کے ساتھ میری متواضع رائے کے مطابق اگر نظام اخلاقیات کو شامل کر لیا جائے تو بہتر ہوگا۔ مدارس کے ذمہ داران کو اس بات پر توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے طلبہ کو کتاب وسنت کی جو تعلیم دے رہے ہیں اس کا اثر ان کی اخلاقیات میں بھی بھرپور طور پر نظر آئے۔ اگر ہم معلم کو اس بات پر توجہ دلائیں کہ اخلاقیات میں وہ نمایاں ہوں تو اس کے اثرات طلبہ پر بھی منعکس ہوں گے۔ میں چونکہ عصری اور دینی دونوں طرح کے ماحول میں رہا ہوں اس لیے اس حوالہ سے فرق کو محسوس کر سکتا ہوں۔ درحقیقت عصری علوم وفنون کے طلبہ اور دینی علوم وفنون کے طلبہ کے تعامل اور انداز گفتگو میں بڑا فرق ہے۔ یہ افسوس کی بات ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس کا سبب اخلاقیات کے شعبہ کی کمزوری ہے جس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

انسٹی ٹیوٹ کی جو کوششیں میں نے دیکھی ہیں وہ قابل تحسین ہیں ان کو آج کی تجاویز کی روشنی میں بڑھایا جائے۔ البتہ اس میں یہ اضافہ کیا جائے کہ جہاں آپ مختلف مدارس کے اساتذہ کو دعوت دیتے ہیں تو وہیں وفاق کے مرکزی ادارے سے کسی مرکزی استاد کو بطور مربی بلائیں کہ وہ اپنے تجربات کی روشنی میں اپنے اپنے فن سے متعلق اساتذہ کی رہنمائی کریں۔

وفاق کے ارباب کی خدمت میں گزارش ہے کہ جب بھی وہ کسی استاد کو متعین کریں تو اس کے لیے شرط ہو کہ اس نے کم از کم تین ماہ کا تدریس کا کورس کیا ہو۔ جس کا اجراء بھی وفاق کی ذمہ داری ہے۔ یہ پروگرام ہر مدرسے میں ہو سکتا ہے کہ نئے آنے والے اساتذہ کے لیے تین ماہ کا کورس رکھا جائے اور تجربہ کار اساتذہ کی ذمہ داری لگائی جائے کہ وہ ان کی رہنمائی کریں۔ اور تعین کے بعد نئے آنے والے اساتذہ کو پرانے اساتذہ کے زیر نگرانی رکھا جائے جو دوران تدریس اس کو چیک اور اصلاح کریں۔ اساتذہ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دوران تدریس طلبہ کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کو نکھارنے پر توجہ دیں۔ استاد کو چاہیے کہ شخصی طور پر یہ معلومات رکھے کہ میرا شاگرد کن

صلاحیتوں کا مالک ہے اور ان معلومات کی روشنی میں حسب موقع انہیں آگے بڑھنے کا موقع فراہم کرے۔

آخر میں تدریب المعلمین کے حوالہ سے ایک مفید کتاب کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ کتاب ''نبی کریم ﷺ بحثیت معلم'' ڈاکٹر فضل الٰہی صاحب کی تصنیف ہے۔ اس کتاب پر انہیں صدارتی ایوارڈ ملا ہے۔ کتاب کا خاصہ ہے کہ اس میں مصنف نے کتاب وسنت، تاریخ اور تذکرہ اسلاف سے جو نکات بیان کیے ہیں تدریسی عمل میں راہنمائی کے لیے انتہائی مفید ہیں۔

ڈاکٹر محمد حنیف (وزارت تعلیم)

تدریس المعلمین کے حوالے سے گزارش ہے کہ جب بھی ایسا کوئی پروگرام ہو تو مشمولات کی فہرست باقاعدہ مرتب ہونی چاہیے، تاکہ تکرار نہ ہو۔ اور وہی باتیں بار بار نہ بتائی جائیں جو وہ پہلے سے جانتے ہوں۔ مربیین کے حوالے سے بھی خیال رکھا جائے کہ کم تجربے والا بڑی عمر کے افراد کو نہ سکھائے کیوں کہ عموماً یہ چیز قبول نہیں ہو پاتی۔

کورسز دو قسم کے ہونے چاہییں۔ ایک طویل المیعاد، یہ کورس تمام وفاقوں کی مشاورت اور تعاون سے طے کیا جائے جو تین سے چار مہینے کے دورانیے پر محیط ہو۔ جس میں اصول تدریس کے متعلق سکھایا جائے۔ مثال کے طور پر آسان سے مشکل کی طرف، مثالوں کے ذریعے اور معلوم سے نامعلوم کی طرف وغیرہ تربیت اساتذہ کے بڑے بڑے اصول ہیں۔

اصول تدریس کے ساتھ دوسری چیز طریقہ تدریس ہے۔ اب بہت سے نئے نئے طریقے رائج ہیں۔ ان سے استفادہ کیا جائے اس ضمن میں بالواسطہ یا بلاواسطہ طریقہ تدریس جیسے اصولوں اور مدرسے کے حالات کو مدنظر رکھ کر اصول وضع کرنے ہوں گے۔ تعلیمی نفسیات کے پہلو کو بھی شامل کرنا ضروری ہے کیوں کہ اس کے بغیر ایک معلم آگے بڑھ نہیں سکتا۔ ساتھ ہی نظم وضبط کے حوالے سے بھی رہنمائی فراہم کی جائے۔ تاکہ استاد اگر کسی مرحلہ پر مہتمم یا ناظم بن جائے تو باآسانی انتظامات سنبھال سکے۔

نفس مضمون کے حوالے سے مولانا حنیف جالندھری صاحب نے جو اشارہ کیا اس پر بھی توجہ مرکوز کرنی ہوگی کہ تفسیر، حدیث اور فقہ کو کیسے پڑھانا ہے۔

جو لوگ تدریس میں مشغول ہیں ان کے لیے تین چار مہینے کے کورس میں شمولیت ممکن نہیں ہوگی، ان کے لیے مختصر مدت کے کورسز ترتیب دیے جائیں۔ اور مذکورہ بالا نکات کی روشنی میں ان کو رہنمائی فراہم کی جائے۔

اس سلسلے میں جدید اداروں کے ایسے افراد سے مدد لی جاسکتی ہے جو فن میں مہارت کے ساتھ ساتھ دینی جذبہ بھی رکھتے ہیں۔ اگر مدارس کے ماحول، نظم وضبط اور تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ارباب مدارس کے مشورے سے یہ پروگرام ترتیب دیا جائے تو بہتر نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ میں انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ آپ نے وقت کی اہم ترین ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ان حضرات کو اکٹھا کیا۔ اور یہ حضرات بھی قابل فخر ہیں کہ انہوں نے اپنی مصروفیت سے وقت نکالا۔

مفتی شکیل احمد (جامعہ محمدیہ۔ اسلام آباد)

تربیت کے ضمن میں آئی پی ایس کے تحت ہونے والے پروگرامات کے حوالے سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ شخصی وادارتی نشوونما کے اعتبار سے ایک انتہائی جامع پروگرام ہے لیکن اس کی افادیت عام نہیں ہے۔ عام نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اگر پاکستان میں بیس ہزار سے زائد مدارس ہیں تو یہاں آنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ یہاں سے تربیت حاصل کرنے والے اساتذہ کرواپس جا کر اس عمل کو آگے بڑھانے کی کوشش کریں تو بھی یہ بہت محدود ہوگی۔ اس لیے ایسے پروگرامات کو جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ ان کی افادیت کو بڑھانے کے لیے یہ تجویز میں نے پہلے بھی دی تھی کہ تدریب المعلمین کے حوالے سے کتاب مرتب کی جائے، جس میں جدید اور قدیم دونوں تقاضوں کو مدنظر رکھا جائے۔ اگر آئی پی ایس یہ کام کرلے تو یہ پہلی کوشش ہوگی۔

دوسری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ مشورہ کے بعد وفاقوں کی وساطت سے اس کتاب کو نصاب میں شامل کیا جائے اور اسے نئے آنے والے اساتذہ کے لیے لازمی قرار دیا جائے۔ اس صورت میں یہ پروگرام بتدریج سو فیصد لوگوں تک اپنے اثرات پہنچا سکتا ہے۔ یہ تو تدریب المعلمین کے پروگرام کے متعلق ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مدارس کے نظام میں حقیقی بہتری مہتمم کے بغیر ممکن نہیں۔ جو مزاج مہتمم کا ہے وہ اوپر سے نیچے تک ہر شخص میں پایا جاتا ہے۔ اگر مہتمم نیکی اور تقوی میں مثالی ہے تو اس ادارے کے ہر فرد میں یہ جھلک نظر آتی ہے۔ اسی طرح اگر مہتمم علمی اعتبار سے ٹھوس صلاحیت اور مضبوط استعداد کا حامل ہے تو وہ دیگر مدرسین کی بھی اس حوالہ سے نگرانی کرتا ہے۔ اگر مہتمم خود کمزور ہوگا تو وہ دیگر اساتذہ کی رہنمائی اور نگرانی بھی نہیں کر سکتا۔

لہٰذا مہتمم کے انتخاب یا مدرسے کے وفاق کے ساتھ الحاق کے وقت چار چیزوں کا لحاظ رکھا جائے، اوّل: مہتمم ذی استعداد ہو۔ دوم: تعلیم کے اندر اس کی ذاتی دلچسپی ہو، سوم: نیکی اور تقوی کے لحاظ سے مضبوط ہو اور چہارم: دینی اور دنیاوی تعلیم کا جامع ہو۔ ان چار چیزوں کی موجودگی میں وہ ساری باتیں جو ہم یہاں کر رہے ہیں خود بخود مدرسے میں آجائیں گی۔

مدارس کے اندر تعلیمی انحطاط کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ مہتمم کی ذاتی دلچسپی دو باتوں میں ہوتی ہے، ایک یہ کہ مدرسے کی عمارت بڑی سے بڑی ہو اور دوم یہ کہ طلبہ کی تعداد کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا جائے۔ لیکن ایک بنیادی چیز جس پر توجہ نہ ہونے کی وجہ سے تعلیم کا معیار متاثر ہوتا ہے وہ اساتذہ کی معاشی حالت کو بہتر نہ بنانا ہے۔ اگر اساتذہ مختلف مدارس میں دو دو گھنٹے ٹائم دیں گے تو وہ کہیں پر بھی پوری توجہ نہیں دے سکتے۔ اس لیے وفاق کی سطح پر اس کی نگرانی کی جائے کہ اگر کسی مدرسے کی مالی حالت بہتر ہے تو اساتذہ کا معاوضہ بھی اچھا ہونا چاہیے۔

تدریب المعلمین کے سلسلے میں ایک اور عرض یہ ہے کہ مدرسے میں استاد کا انتخاب کرتے وقت اکثر یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اس میں قابلیت کتنی ہے بلکہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کی آمد سے مدرسے کی آمدنی

میں کتنا اضافہ ہوگا۔ وفاقوں کی سطح پر بھی ایسا نظام بنایا جائے جس کے تحت اساتذہ کے تعین کی شرائط طے کی جائیں۔ اسی طرح یہ بھی عام ہے کہ ایک استاد کو کئی کئی مضامین دے دیے جاتے ہیں، جبکہ ہونا یہ چاہیے کہ ہر فن کے لیے ایک استاد مختص ہو۔

محترم قاری حنیف جالندھری صاحب نے فرمایا تھا کہ تدریب کے لیے ایسے اساتذہ کو منتخب کیا جائے جن کا کم از کم تجربہ بیس سال ہو۔ لیکن مشاہدہ یہ ہے کہ پچاس سال کا تجربہ رکھنے والے بھی اچھی تدریس نہیں کر سکتے جب تک انہیں اس فن سے ذاتی دلچسپی نہ ہو۔ اگرچہ استاد کا تجربہ کم بھی ہو لیکن وہ ذاتی دلچسپی لیتا ہو تو وہ زیادہ مفید ہوگا۔ اسی طرح نصاب میں کچھ پرانی کتابیں چلتی آ رہی ہیں جن میں فن کم اور آج کے تناظر میں غیر متعلقہ باتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ جیسا کہ بلاغۃ کی کتاب مختصر المعانی ہے۔ انہیں تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ بنیادی کتابیں اگرچہ تبدیل نہیں ہو سکتیں لیکن مختلف فنون پر جو کتابیں نئی آ رہی ہیں ان کو رائج کیا جانا چاہیے۔

مولانا محمد ہاشم (جامعہ نعیمیہ۔ لاہور)

مجموعی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ تدریب المعلمین کے حوالہ سے انسٹی ٹیوٹ کی کاوشیں انتہائی مفید ہیں، آئندہ مراحل میں ان کو مفید تر بنانے کے لیے مختلف تجاویز کو عملی شکل دی جائے۔ آج کی نشست میں بہت سی مفید باتیں سامنے آئی ہیں۔ جناب جالندھری صاحب نے نصاب تعلیم اور نظام تعلیم و تدریس کے حوالے سے دو اہم باتیں ذکر کیں۔ اسی طرح ڈاکٹر طاہر صاحب نے نظام الاخلاق کا اضافہ کیا۔ میں چوتھی چیز، نظام الاوقات کا اضافہ کروں گا، اس کی انتہائی زیادہ ضرورت ہے۔ اس حوالے سے بعد میں مزید ذکر کروں گا۔

یہ حقیقت تسلیم کرنی چاہیے کہ اس وقت دینی مدارس کے اندر علمی ذوق کا فقدان نظر آ رہا ہے۔ طلبہ کے اندر علمی ذوق، جستجو اور تحقیق کے لیے جو جدوجہد ہونی چاہیے، وہ بالعموم بہت کم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ابتدائی درجات کے اندر پڑھانے والے اساتذہ نئے ہوتے ہیں اور خاطر خواہ تجربہ نہیں رکھتے۔ لہٰذا انتقال علم کما حقہ نہیں کر پاتے۔ اس وجہ سے طلبہ کی بنیادی تعلیم ناقص رہ جاتی ہے۔ بعد

میں جب طلبہ بڑے درجات میں جاتے ہیں تو اساتذہ ان کی کمزوری کا سارا دوش ابتدائی درجات کے اساتذہ کو دے دیتے ہیں کہ ان کی بنیاد ہی ٹھیک نہیں رکھی گئی اب ہم ان کو کیا پڑھائیں۔ یوں طلبہ آٹھ سال کی تعلیم کے بعد آخر میں دامن جھاڑ کر چلے جاتے ہیں اور ہمیں ان سے جو توقعات ہوتی ہیں وہ پوری نہیں ہوتیں۔

اس اعتبار سے سب سے پہلے ہمیں سوچنا یہ ہے کہ طلبہ میں علمی ذوق کے فقدان کو کیسے ختم کیا جائے، استاد طالبعلم میں علمی ذوق کیسے پیدا کریں اور پھر اس ذوق کی آبیاری کیسے کریں۔ آج کے دور میں اگر کوئی صرف دینی تعلیم حاصل کیے ہوئے ہے تو وہ ناکافی ہے اسی طرح اگر کوئی صرف دنیاوی تعلیم یافتہ ہے تو وہ بھی کامل نہیں ہے۔ اس لیے ہمیں دونوں کا امتزاج کرنا پڑے گا۔

علمی طور پر صورتحال یہ ہے کہ جن دینی اداروں میں عصری تعلیم نہیں ہے ان کے طلبہ احساس کمتری کا شکار ہیں اور جن اداروں میں عصری تعلیم بھی ہے وہاں کے طلبہ میں علمی پختگی کی کمی ہوتی ہے۔ بہت کم طلبہ ایسے ہیں جو دونوں کو اچھے انداز میں چلا سکتے ہیں۔ اور جن اداروں میں دینی اور عصری تعلیم ہے وہاں بعض ادارے ایسے ہیں جو ابتدائی وقت میں انگلش اور ریاضی جیسے لازمی مضامین دیگر دینی کتب کے ساتھ ہی پڑھاتے ہیں اور بعض مدارس میں ابتدائی وقت میں درس نظامی اور ظہر کے بعد کے وقت میں علوم عصریہ پڑھانے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس صورتحال کا ایک نقصان یہ ہے کہ استاد تو انتہائی محنت کر کے اپنے طلبہ کو پڑھانے کے لیے آتا ہے لیکن طلبہ کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ عصری اور دینی علوم کو ساتھ ساتھ چلا سکیں اور آئندہ کے سبق کی تیاری بھی کریں۔ ضرورت طلبہ میں ایسا ذوق وشوق پیدا کرنے کی ہے کہ وہ بذات خود بھی پڑھنے کے لیے تیار ہوں۔ اس حوالے سے وفاق سے وابستہ اداروں کی ایسی رہنمائی کرنی چاہیے کہ وہ عصری اور دینی تعلیم کو کس طرح اچھے انداز سے رائج کر سکتے ہیں اور نظام الاوقات کو بہتر انداز سے کیسے تشکیل دے سکتے ہیں۔

ایک بات اور بھی واضح ہونی چاہیے کہ ہم دینی مدارس کے طلبہ سے کیا توقعات رکھتے ہیں۔ اور کیا طلبہ ہماری توقعات پر پورے اتر رہے ہیں؟ مشاہدہ یہ ہے کہ طلبہ کی بڑی تعداد توقعات پر پوری

نہیں اتر رہی۔ دیکھنا یہ ہوگا کہ وہ کیا اسباب ہیں جو رکاوٹ بنے ہوئے ہیں اور ان اسباب کو دور کرنے کے لیے اساتذہ کیا رہنمائی دے سکتے ہیں۔ اس تناظر میں پھر اساتذہ کی مشکلات اور طلبہ کی استعداد کو سامنے رکھ کر ایسی حکمت عملی اپنانی ہوگی کہ دینی اور عصری علوم سے یکساں استفادہ ممکن ہو سکے۔ اس وقت بہت سے دینی مدارس کا ایک بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ طلبہ کے وقت کو بڑی بے دردی سے ضائع کیا جاتا ہے۔ اگر اساتذہ میں یہ احساس پیدا کر دیا جائے کہ طلبہ کے وقت کا خیال رکھیں تو اس کے بہت اچھے اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔

پروفیسر حبیب الرحمٰن عاصم (بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی۔ اسلام آباد)

دینی مدارس سے میرا تعلق اس انداز کا ہے کہ ۱۹۸۳ء سے میں اسلامی یونیورسٹی میں عربی کی تدریس کی ذمہ داری پوری کر رہا ہوں۔ اس یونیورسٹی میں تعلیم کے لیے آنے والے ہزاروں طلبہ میں سے، بالخصوص اصول الدین، شریعہ اینڈ لاء اور عربی کے شعبہ جات میں، ستر فیصد سے زائد طلبہ کا تعلق دینی مدارس سے ہوتا ہے۔ چنانچہ دینی مدارس میں کیا اور کس طرح ہو رہا ہے، نیز کیا ہونا چاہیے اور کیا نہیں ہونا چاہیے؟ وہ موضوعات ہیں جن پر طلبہ سے ملاقاتوں اور تعلیم کے دوران پیش آنے والی مشکلات کی روشنی میں کسی حد تک آگاہی ہو جاتی ہے۔

آج کی مجلس میں کچھ چیزوں پر عمومی اتفاق نظر آ رہا ہے۔ ایک یہ کہ اساتذہ کی تربیت کا اہتمام ہونا چاہیے۔ اس ضمن میں یہ بات دہرانے کی طبیعت چاہتی ہے کہ استاد تعلیم کا ایک زندہ ذریعہ ہے باقی سب جمادات ہیں۔ استاد کے ساتھ رابطہ زندگی کے تمام مراحل میں رہتا ہے اور کتابیں بہت پیچھے رہ جاتی ہیں۔ یہ بات قابل تحسین ہے کہ تمام ہی وفاقوں کے ذمہ داران اس پر متفق ہیں کہ تعلیمی اداروں میں جو اساتذہ پڑھاتے ہیں ان کی تربیت کا اہتمام ہونا چاہیے۔ پھر اس میں چار پانچ باتیں مرکزی حیثیت رکھتی ہیں جس کی جانب سب ہی حضرات نے اشارہ کیا ہے۔ یہ کہ اساتذہ کے انتخاب میں مراحل کا لحاظ رکھا جائے، جو ابتدائی پروگرام آئی پی ایس اور مدارس کے تعاون سے ہوتے رہے وہ ایسے تھے جن کا مقصد عمومی طور پر تعلیم کو بہتر بنانے کے اصول اور ضابطے کو باہم مشاورت سے آگے

بڑھانا تھا۔اس اعتبار سے مراحل تعلیم کا انتخاب کرنا اوراساتذہ میں سے جو شرکاءتربیت بننے ہیں ان کا انتخاب بذات خود ایک اہم کام ہے۔کیا ہر مرحلے کے کسی بھی استاد کو اس پروگرام میں شریک کر لینا چاہیے یا یہ انتخاب کسی خاص بنیاد پر ہونا چاہیے مثلاً یہ کہ جو آئندہ بھی بطور مربی کام کرسکتا ہو۔ڈاکٹر محمد حنیف صاحب نے درست توجہ دلائی ہے کہ اس بات کا باقاعدہ تعین ہو کہ اساتذہ کو کس چیز کی تربیت دینی ہے۔بعض چیزیں تو عمومی تعلیم کے لیے ہوتی ہیں لیکن تخصص کی تعلیم میں مصروف علماءکرام کے لیے جو موضوعات منتخب کیے جائیں ان کی نوعیت مختلف ہوگی۔

اس کے بعد مربیین اور مدربین کا معاملہ ہے۔اس بات کا اہتمام پہلے بھی کیا گیا ہے تاہم اس میں مزید خوبی پیدا کرنے کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے۔مربیین کے انتخاب میں دو باتیں اہم ہیں جن کا یہاں ذکر بھی کیا گیا، کچھ اساتذہ ایسے ہوں جو تعلیم کے میدان میں شہرت رکھتے ہوں اور بعض ایسے ہوں جو اپنے مضمون میں خاص قسم کی مہارت رکھتے ہوں۔اس سے یقیناً پروگرام کی افادیت میں اضافہ ہوگا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ وفاقوں کی طرف سے ایک جانب شرکاءکورس یہاں آئیں دوسری جانب ایسے اساتذہ بھی مہیا کیے جاسکتے ہیں جو تربیت دینے کے عمل میں شریک ہوں۔

تالیف کتاب والی تجویز بہت اچھی ہے لیکن اس کو تدریبی پروگرام کے ساتھ ساتھ آگے بڑھانے کا عمل جاری رہنا چاہیے۔ان پروگراموں کے اساتذہ کی تجاویز اور پروگراموں کے لوازمے سے جو کتاب تیار ہوگی وہ زیادہ مفید ہوگی۔یہ تجویز بھی بہت اچھی ہے کہ پہلے مرکزی طور پر وفاقوں کی طرف سے اساتذہ مربیین اور شرکاءتدریب کے طور پر آئیں اور جب ایک مناسب تعداد تیار ہو جائے تو ہر وفاق اپنے طور پر خود اس پروگرام کا اہتمام کرے اور ہر نئے آنے والے استاد کے لیے یہ شرط لگا دی جائے کہ جب تک وہ تدریب المعلمین کے اس کورس سے نہ گزرا ہو اس وقت تک اس کو تدریس کے اس مرحلے میں داخل نہیں کیا جائے گا تو یہ بہت بہتر ہوگا۔

اخلاقی اعتبار سے مدارس کے طلبہ میں فقدان کی بات کی گئی لیکن دونوں نظام تعلیم سے وابستہ افراد سے جو میرا تعامل ہے اس کے نتیجے میں میرا تاثر یہ ہے مدارس کے طلبہ یونیورسٹی اور کالج کے طلبہ

سے کہیں بہتر ہیں۔ جتنا مضبوط نظام الاخلاق دینی مدارس کا ہے وہ تمام ترکمیوں کے باوجود دیگر اداروں سے بہت بہتر ہے۔اگر کوئی کمی ہے تو اس کے کچھ اسباب ہیں۔

اگر مشاورت کا عمل جاری رہا تو ہم کمزوریوں پر قابو پا سکتے ہیں۔اور تدریب کے عمل کو مزید بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

مولانا محمد اسحٰق ظفر (جامعہ رضویہ ضیاء العلوم۔راولپنڈی)

آج کی نشست کے حوالے سے تشکر کے کلمات سب بزرگوں نے کہے ہیں میں بھی عرض کرنا چاہوں گا کہ یہ بڑی اچھی کوشش ہے۔مل بیٹھنے سے بہت ساری باتیں اچھائی کی طرف جاتی ہیں اور کمزوریوں کی نشاندہی ہو جائے تو ازالہ کا امکان ہو جاتا ہے۔اور اگر نشاندہی نہ ہو تو انسان سمجھتا ہے سب اچھا ہے۔

گفتگو میں جدید وسائل تعلیم وتدریس کا استعمال زیر بحث نہیں آیا۔اس حوالے سے مدارس میں کمزوری ہے۔اگر چہ ہمارے بزرگ اساتذہ کرام بہت مہارت اور علم رکھتے ہیں لیکن طلبہ میں اتنی استعداد نہیں کہ بات کی تہہ تک پہنچ جائیں۔اس لیے اگر جدید تعلیمی وسائل کے استعمال کے لیے ایسی کوششیں کی جائیں کہ سب اساتذہ اس کو قبول کرلیں تو بہت اچھا ہوگا۔

مدارس کے حوالہ سے انسٹی ٹیوٹ کی یہ کتاب جو ہمیں پہنچی ہے یہ آپ کے تبصروں اور علماء کی آراء پر مشتمل ہے۔ماشاءاللہ اچھی کاوش ہے مگر بعض باتوں کی نشاندہی کرنا ضروری ہے بالخصوص مدارس کے بورڈز کا ذکر ہو تو ایک اشتباہ لفظ وفاق اور تنظیم کے لحاظ سے پیش نظر رہنا چاہیے تھا۔لفظ تنظیم کا اطلاق اگر الگ سے نہ کیا جائے تو غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔پانچ میں سے تین بورڈز کے ناموں میں وفاق کا لفظ شامل ہے جبکہ تنظیم المدارس اور رابطۃ المدارس کے نام مختلف ہیں۔اس لیے جہاں مجموعی طور پر بورڈز کا ذکر ہو وہاں وفاق کے ساتھ لفظ تنظیم کا استعمال ضرور کیا جائے۔دوسری بات یہ کہ جس طرح دیگر وفاقوں کے ساتھ العربیہ، السّلفیہ اور الشیعہ کے لاحقے مابہ الامتیاز ہیں اسی طرح تنظیم کا مابہ الامتیاز

اہلسنت ہے۔اس لیے اس کا لحاظ بھی ضرور کیا جائے۔نیز اس کتاب میں مدارس کا انتخاب کرتے وقت تنظیم المدارس کا تناسب بہت کم رکھا گیا ہے حالانکہ تعداد کے اعتبار سے تنظیم اور وفاق المدارس العربیہ سب سے نمایاں ہیں۔آئندہ اگر اس کا ازالہ ہو جائے تو اچھا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ آپ کے اس کام میں برکت دے۔اور ہمیں بھی اس کام میں آپ کے ساتھ شریک کار رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

خالد رحمٰن (ڈائریکٹر جنرل، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز)

اس سے قبل کہ اس نشست کے اختتامی کلمات کے لیے پروفیسر خورشید احمد صاحب کو دعوت دوں تا کہ ان کی رہنمائی ہمیں مل جائے۔یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ میں نے تدریب المعلمین کے حوالہ سے پیش کردہ بنیادی سوال کے سلسلے میں چند ضمنی سوالات ترتیب دیے تھے۔ان میں ایک یہ تھا کہ کیا ایسے کسی پروگرام کے بارے میں اصولاً اور عملاً اتفاق موجود ہے نیز یہ کہ دورانیے کے بارے میں کچھ رہنمائی مل جائے۔میں سمجھتا ہوں کہ اس سوال کے جواب میں ہمیں آپ حضرات کی جانب سے بہت اچھی رہنمائی مل گئی ہے، کہ بڑی ضرورت تو ایک طویل المیعاد پروگرام کی ہے لیکن اگر مختصر دورانیے کے پروگراموں کا سلسلہ ہو تو وہ بھی ضرورت کو ایک دائرے میں کسی نہ کسی حد تک پورا کرتا ہے۔

شرکاء کے انتخاب کی بنیاد کیا ہو؟ یہ سوال بھی میرے پیش نظر تھا، اس حوالے سے بھی آپ کی جانب سے رہنمائی مل گئی ہے اور جیسا کہ پروفیسر حبیب الرحمٰن صاحب نے ذکر کیا اگر اس کو سامنے رکھیں تو آئندہ کے لیے پروگراموں کو زیادہ بہتر طریقے پر منعقد کرنے میں مدد ملے گی۔

موضوعات کی نوعیت سمجھنا بھی میرے پیش نظر تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ اس حوالہ سے بھی آج کی گفتگو سے بہت مفید رہنمائی ملی ہے۔جناب حنیف جالندھری نے ابتدا کرتے ہوئے جو باتیں کہیں اس نے گفتگو کو وہ رُخ دیا، جس پر ہم سب اتفاق محسوس کرتے ہیں۔

نیاز حسین نقوی صاحب توجہ دلا رہے تھے۔اگر پروگرام اسلام آباد میں کریں تو مدارس کے افراد

کے لیے وقت نکالنا مشکل ہے۔ دوسری جانب ہم محسوس کرتے ہیں کہ اگر یہاں سے لوگوں کو ساتھ لے کر دیگر شہروں میں جائیں تو یہ بھی بہت زیادہ قابل عمل نہ ہوگا۔ اسی لیے ہمارے ذہن میں یہ تجویز آئی تھی کہ تنظیم/وفاق کی قیادت کے ساتھ مشاورت کے نتیجے میں کسی آئندہ لائحہ عمل کی طرف بڑھ رہے ہوں تو اس پروگرام کو کئی سطحوں پر منظّم کیا جا سکتا ہے۔ ایک سطح یہ ہو کہ سال میں ایک دو نشستیں اسلام آباد میں منعقد کریں جس میں آپ کی طرف سے نامزد کردہ لوگ ہوں۔ یہ نامزدگی اس نقطہ نظر سے ہو کہ وہ کچھ وقت بھی نکال سکتے ہوں اور نہیں وفاق کی رہنمائی اور تائید حاصل ہو۔ بعدازاں وہ اپنے اپنے علاقے میں کسی نہ کسی درجے میں کوئی کردار ادا کر سکیں۔ وہ کردار باہم مشورے سے متعین کیا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں نسبتاً بڑے دائرے میں مدارس سے متعلق مربیین کا جو حصہ ہونا چاہیے وہ بھی خود بخود بڑھ جائے گا۔ جیسا کہ ہماری ہر مجلس میں شرکاء نے یہ بات کہی کہ آپ نے جہاں اتنے اچھے پروگرام کیے ہیں وہاں مدارس سے وابستہ مربیین کی بھی ایک تعداد ہو تو زیادہ مفید ہوگا۔

اسی حوالہ سے یہ نکتہ بھی پیش نظر تھا کہ ہم مشاورت کے نتیجے میں اس فیصلے تک پہنچ جائیں کہ پورے ملک سے چالیس سے پچاس لوگوں کا ایک پینل بنالیں جو بیک وقت دونوں طرح کے لوگوں پر مشتمل ہو، وہ جو مدارس سے وابستہ ہیں اور وہ جو دیگر تدریسی امور میں مہارت رکھتے ہوں اور ہمارے مجموعی پروگرام سے اتفاق رکھتے ہیں اور ہم یہ سمجھتے ہوں کہ وہ مناسب طریقے پر رہنمائی فراہم کر سکتے ہیں۔ اس پینل میں کراچی، لاہور، پشاور اور دیگر شہروں سے بھی لوگ ہوں جن کو ہم اپنے پروگرامات میں شامل کریں تو دیگر شہروں میں یہ پروگرام منعقد کرانا آسان ہو جائے گا۔

اس ضمن میں ہم تنظیم اور وفاق سے یہ توقع کریں گے کہ آپ اپنی جانب سے نام دیں کہ جن کو مربی کے طور پر استعمال کرنا چاہیے جو پیمانے آپ نے بتائے ان کو سامنے رکھ کر۔ دوسری جانب ایسے افراد جو اگرچہ مدارس سے وابستہ تو نہیں لیکن تدریسی علوم میں مہارت رکھتے ہیں اور ہم فکر ہوں انہیں اس پینل میں شریک رکھا جائے۔ اس طرح جو پینل تشکیل پائے گا وہ پورے ملک کے لیے مفید ہوگا اور قابل عمل پروگرام بن جائے گا۔

تدریسی لوازمے کی تیاری کا کام بھی پیش نظر تھا، کہ تدریب المعلمین کے پروگرام میں درجہ بندی، یکسانیت اور معیار ہو اور ایک سمت متعین ہو نیز یہ بھی واضح ہو کہ ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں کیسے داخل ہوا جائے گا۔ اس حوالے سے بھی مفید تجاویز آئی ہیں اسکی کوئی عملی صورت مزید مشورے سے بنانے کی کوشش کریں گے۔

کتاب کے بارے میں مولانا اسحٰق ظفر صاحب نے توجہ دلائی ہے۔ میں اس پر شکر گزار ہوں۔ ہر انسانی کام میں بہتری کی گنجائش موجود ہوتی ہے۔ یقیناً اس میں بھی بہتری کی گنجائش ہے، ہم اگلے ایڈیشن میں اس کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ یہ وضاحت کردوں کہ اس کتاب کی تیاری کے دوران اور اشاعت کے وقت یہ سوچ بچار ہم کرتے رہے کہ کہیں اس سے ہمارے ہی دوستوں میں بدگمانیاں اور شکوے شکایات پیدا نہ ہو جائیں۔ ایک حادثہ تو خود جناب یٰسین ظفر صاحب کے ساتھ ہو گیا کہ ان سے انٹرویو بھی ہوا، سوال نامہ بھی موجود تھا لیکن آخری مرحلے میں اُن کا سوال نامہ گم ہو جانے کی بناء پر جامعہ سلفیہ کے کوائف کتاب میں شامل ہونے سے رہ گئے۔

تاہم میں یہ کہنا چاہوں گا کہ کتاب کی تیاری میں مخاطب کے طور پر ہمارے پیش نظر آپ نہیں تھے، کیوں کہ آپ تو مدرسہ کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔ ہمارے پیش نظر وہ لوگ تھے جو مدرسے اور اس کے بارے میں حقائق سے ناواقف اور غلط پروپیگنڈے کا شکار ہیں۔ ان کو سامنے رکھ ہم نے تحقیق کی ایک بنیاد بنائی، اور اس بنیاد پر مدارس کا انتخاب کیا۔ اس پر کسی کو شکایت ہو سکتی ہے اور بجا ہو گی لیکن رائے قائم کرتے ہوئے اس پیمانے کو سامنے رکھیں کہ ہم لوگوں کے سامنے یہ بات لانا چاہتے تھے کہ مدارس اس وقت کیا کر رہے ہیں یہی اس ریسرچ کی بنیاد پر ہے۔ آپ اس پہلو سے اس کا تنقیدی جائزہ لیں اور ہماری رہنمائی کریں کہ اس میں کیا کمی ہے۔ درحقیقت آپ اس کے مخاطب نہیں ہیں بلکہ شریک کار ہیں۔

پروفیسر خورشید احمد (چیئرمین، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز)

سب سے پہلے تو میں آپ حضرات کی بھرپور شرکت اور نہایت ہی مفید اور عملی حیثیت سے اہمیت

رکھنے والے مشوروں پر دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے بہترین اجر کی دعا کرتا ہوں۔ تمام اہم باتیں آ گئی ہیں خاص طور پر پروفیسر حبیب الرحمٰن صاحب نے بحث کا خلاصہ بھی ہمارے سامنے رکھ دیا۔ میں صرف دو تین باتیں آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی بات یہ کہ ہماری دلی خواہش اور تمنا ہے کہ جو پروگرام بن رہا ہے اسے آپ اور ہم سب مل کر اپنے لیے بنائیں۔ یہ وہ اسپرٹ ہے کہ ہم ایک ٹیم کی حیثیت سے مشاورت کی بنیاد پر ایک دوسرے کے لیے مضبوطی کا ذریعہ بنتے ہوئے آگے بڑھیں۔ اور مجھے بڑی خوشی ہے کہ آپ حضرات نے اسی جذبے سے اب تک بھی شرکت فرمائی ہے۔ میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ یہی دراصل ہماری آرزو ہے کہ یہ حقیقی طور پر ہمارا ایک مشترک پروگرام ہے۔

مجھے بے حد مسرت اس بات پر بھی ہے کہ آپ سب ہی نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ اساتذہ کی تربیت اور تیاری معنوی اور ابلاغی دونوں اعتبار سے ضروری ہے۔ جس علم اور جس مضمون کا استاد ہو اس پر دسترس اور ساتھ ہی ابلاغ کے اعتبار سے مہارت کا حصول دونوں ہی کی ضرورت پر اتفاق ہے کہ اسی صورت میں بہتر سے بہتر انداز میں علم کو منتقل کیا جا سکتا ہے۔ آج کی اس گفتگو کی روشنی میں عملی نقطۂ نظر سے تین چار چیزیں سامنے آئی ہیں۔

پہلی جو اس وقت قابل عمل ہے وہ مختصر متعین مدت کے پروگرام ہیں۔ جو انشاء اللہ اسلام آباد میں بھی اور ملک کے دوسرے مقامات پر آپ کی میزبانی سے منعقد کیے جائیں۔ یہ پائلٹ پروجیکٹ کی حیثیت ہوگی مجھے یقین ہے کہ اس کے ذریعے ہم ایک نئے پراسیس کا آغاز کر دیں گے۔ دوسری چیز جو انشاء اللہ ان کوششوں سے نکلے گی وہ تدریب کا لوازمہ اور ایک ایسی کتاب ہے جو آئندہ بنیاد بن سکے گی اس پورے معاملے کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرے گی اور توقع ہے کہ پھر اس کی مدد سے ہر ادارے میں کام آگے بڑھے گا۔

تیسری چیز جس میں شاید ابھی وقت لگے، وہ یہ کہ جس طرح جدید تعلیم میں بی اے، ایم اے، اور پی ایچ ڈی کے ساتھ ٹیچر ٹریننگ کا بھی بی ایڈ اور ایم ایڈ کی صورت میں اہتمام ہوتا ہے، خدا کرے

کہ ان تمام تجربات کی روشنی میں اوران کے نتائج کو دیکھ کر ہم کوئی ایسا نظام بھی ترتیب دے سکیں کہ جس سے تدریب کا یہ پروگرام انسٹی ٹیوشنلائز ہو جائے اور یوں وہ کوئی ڈگری یا سرٹیفیکیٹ بھی دے سکے۔اس طرح آئندہ اساتذہ کے تقرر اور سروس پروموشن کے لیے ایک ذریعہ بن جائے۔

شاید کچھ وقت لگے گا لیکن اس گفتگو سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس مرحلہ سے آگے بڑھنا چاہیے۔انشاءاللہ باہم مشورے اور ایک دوسرے سے مدد لیتے ہوئے ہم نے اس کام کا آغاز کر دیا ہے اللہ سے دُعا ہے کہ وہ اس کو بارآور فرمائے اور صحیح نتائج رونما ہوں۔جس محبت، اعتماد، دلسوزی اور بالغ نظری سے آپ سب حضرات اس میں شریک ہو رہے ہیں اس کا فائدہ اس امت کو ہو۔اس وقت دینی تعلیم کو جس انداز سے ہدف بنایا ہوا ہے یہ ہمارے لیے ایک موقع بن جائے اور ہم اس نظام کو اس مقام پر لے آئیں کہ امت مسلمہ کی رہنمائی اور ضرورتوں کو پورا کرنے کے واقعی قابل ہو جائیں۔

تخصصاتِ دینیہ

خالد رحمٰن (ڈائریکٹر جنرل، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز)

مولانا محمد حنیف جالندھری صاحب تشریف لے گئے ہیں انہوں نے کہا ہے کہ وہ تفصیلی تجاویز بعد میں دیں گے البتہ انکے خیال میں سردست دو صورتیں ہیں جن پر ابھی غور کیا جا سکتا ہے۔ پہلی بات یہ کہ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے زیر اہتمام ایک کانفرنس یا سیمینار ایسا ہو جس میں کچھ منتخب لوگ شریک ہوں اور تخصصات دینیہ کے بارے میں مختلف پہلوؤں کو زیر بحث لائیں۔ تاکہ اس کے نتیجے میں جامع رپورٹ اور تجاویز تیار ہو سکیں۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ تمام بورڈز (وفاق، رابطہ اور تنظیم) سے انکے منتخب کردہ ایک ایک یا دو دو افراد پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی جائے جو ایک جائزہ رپورٹ تیار کرے، اسکا اہتمام آئی پی ایس کرے، پھر اس رپورٹ کی روشنی میں آئندہ کا لائحہ عمل بنایا جائے۔ برائے مہربانی اظہار خیال کرتے ہوئے مولانا محمد حنیف جالندھری کی دونوں تجاویز بھی پیش نظر رکھیں۔

مولانا ڈاکٹر محمد سرفراز نعیمی (تنظیم المدارس اہل سنت)

ایجنڈے کے دونوں موضوعات یقیناً انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ آج کل دینی مدارس میں اپنا ایک نظام تعلیم تو ہے جس میں قرآن، حدیث اور فقہ کے ماہرین تیار کیے جاتے ہیں لیکن مختلف النوع عملی، سماجی اور معاشرتی دائروں میں رہنمائی کی ضرورت کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ واقعتاً ناکافی ہے۔ دوسرے شعبوں پر نگاہ ڈالی جائے تو اسکی مثال ایسے نظر آتی ہے کہ آج ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہونے کے باوجود طب کے میدان میں الگ الگ شعبوں (ہارٹ، کڈنی وغیرہ) میں اسپشلائزیشن کی ضرورت پڑتی ہے، ماضی کی طرح ایم بی بی ایس کی موجودگی ان ساری ضروریات کے لیے عموماً کافی نہیں سمجھی جاتی۔ بعینہٖ اسی طرح دینی مدارس میں ماہرین قرآن وسنت کی موجودگی کے باوجود مختلف ذیلی عنوانات میں تحقیق کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔ آئی پی ایس کی تیار کردہ رپورٹ میں جو لکھا گیا ہے ”کہ

تخصص فی الفقہ زیادہ ہو رہا ہے‘‘ وہ صحیح ہے۔ حدیث اور تفسیر سمیت دیگر شعبوں میں بھی تخصص کی ضرورت ہے۔ تاہم یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ زندگی کے دوسرے میدانوں کی طرح طلب اور رسد کے اصول کے مطابق طلب یہاں بھی اثر انداز ہے۔ مسائل کے حوالے سے فقہ کے ساتھ ہر شخص کا تعلق ہے، جبکہ تفسیر اور حدیث میں ضرورت تو ہے لیکن اسکی طلب فقہ کی طلب سے نسبتاً کم ہے۔

اسی طرح بعض مدارس میں یہ خواہش موجود ہے کہ طلباء زیادہ ہونے چاہییں، لیکن تخصص کے لیے تعداد کے بجائے معیار کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ تنظیم سے ملحقہ مدارس میں ہم تخصص کی ایک کلاس میں پندرہ سے بیس طالبعلم لیتے ہیں تاکہ فراغت کے بعد معاشرے کا ایک مفید شہری ہونے کے ساتھ اسکے اندر مطلوبہ قابلیت اور ملکہ بھی پیدا ہو سکے۔ اس وقت تک تخصص کا نظام مربوط نہیں ہے۔ یہ مختلف مقامات پر الگ الگ ہو رہے ہیں حالانکہ ہونا یہ چاہیے کہ بورڈز تمام مدراس کو اجتماعی لائحہ عمل دے دیں (جزوی فرق کی گنجائش موجود ہو) جو من حیث المجموع ایک آئیڈیل شکل ہو اور سب کے سامنے آجائے۔ اس کے لیے جامعہ بنوریہ، جامعہ قادریہ، جامعہ نعیمیہ سمیت جن مدارس میں تخصص ہو رہا ہے ان کا نصاب لے لیا جائے اور اسکی روشنی میں بہتر لائحہ عمل تشکیل دیا جائے۔ سب کے ہاں جو چیزیں مشترک ہیں انہیں برقرار رہنے دیا جائے اور مختلف فیہ چیزوں کو سامنے رکھ کر افراط وتفریط سے گریز کرتے ہوئے سب سے بہتر چیز کو شامل نصاب کیا جائے۔

آج کی اس مختصر نشست میں ہم کسی حتمی نتیجے تک نہیں پہنچ سکتے اس لیے بہتر ہے کہ ہم کمیٹی کی صورت میں تجاویز کے حصول کے طریقے پر عمل کر کے کسی بہتر نتیجے تک پہنچ سکیں۔ اس کے لیے یہ ہو سکتا ہے کہ آپ تمام متعلقہ مدارس سے نصابات منگوا کر ان میں سے بہتر چیزوں کا انتخاب کریں اور ایک علیحدہ اجلاس میں یہ تجاویز شرکاء کے سامنے پیش کریں تاکہ ایک جامع چیز سامنے آسکے۔ اس وقت تجاویز تو سامنے آجائیں گی لیکن عملاً ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پائیں گے۔ اصولی طور پر یہ کام بالکل ٹھیک ہے اس میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے البتہ اسکی تفصیلات ہم بعد میں بھی طے کر سکتے ہیں۔ یہ بھی ذکر کرنا چاہوں گا کہ تنظیم سے ملحقہ مدارس کے نصاب میں معاشیات کے حوالے سے نظام

بینکاری ایک پرچے کی حیثیت سے موجود ہے جس میں طلبہ کو مبادیات سکھائی جاتی ہیں۔تاہم زیادہ گہرائی میں اس حوالے سے ہمارے ہاں فی الحال بہت زیادہ کچھ نہیں ہو رہا۔

اس مرحلے پر علامہ نیاز حسین نقوی صاحب نے اس جانب توجہ دلائی کہ تخصص کی حقیقی روح تک پہنچنے کے لیے دو یا تین سال کا عرصہ بالکل ناکافی ہے اسکا دورانیہ ہمارے ہاں تو چالیس پچاس سال تک سمجھا جاتا ہے۔اس قدر علم اور تجربے کے بعد ہی کہیں کوئی مفتی یا مفسر تیار ہوتا ہے۔تخصص کے اس مثالی تصور کو آگے بڑھانا چاہیے۔کیونکہ دو تین سال حتیٰ کہ پانچ سال میں بھی بس اس قدر استعداد ہو سکتی ہے کہ طالب علم کتب کی مدد سے تخریج کے بعد معاملات پر مشورہ دے سکے وہ خود رہنمائی کرنے کے قابل نہیں ہو سکتا۔اس ضمن میں تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سرفراز نعیمی صاحب نے رائے دی کہ نصاب کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ آدمی اس میں عالم فاضل ہو جائے بلکہ نصاب سے ایک راستہ متعین ہوتا ہے جو آئندہ ملکہ پیدا کرنے میں معاون ہوتا ہے۔البتہ متخصص کے لیے تو درجات ہوتے ہیں مجتہد فی المذہب، مجتہد فی المسائل، پھر اصحاب ترجیح اس کے بعد پھر اصحاب تخریج، تو یہ اپنے اپنے درجات ہوتے ہیں۔تخصص کے بعد یہ توقع ہوتی ہے کہ لوگ اپنے علم کی بنیاد پر آگے مزید علم حاصل کر سکیں گے۔

مولانا یسین ظفر (وفاق المدارس السّلفیہ)

ڈاکٹر سرفراز نعیمی صاحب کی تجویز اس اعتبار سے بہتر معلوم ہوتی ہے کہ کچھ وقت ملنے سے زیادہ جامع انداز میں غور وفکر کا اچھا موقع مل جائے گا۔درحقیقت مدارس خود اس موضوع کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اسے اپنے ہاں بھی زیر بحث لاتے ہیں۔اس بات پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا تخصص کا مقصد عصری تعلیم کی مانند ایم فل یا پی ایچ ڈی کی ڈگری کا حصول ہے؟ یا اس کا مقصد رسوخ فی العلم، یا اپنے اندر کوئی خاص صلاحیت پیدا کرنا ہے؟ یا آئی پی ایس طرز کے ادارے یا انسٹی ٹیوٹ سے منسلک ہو کر وقت گزارنا ہے؟ ہمارے ادارے مرکز التربیہ فیصل آباد میں یہ کام ہو رہا ہے۔تین سالہ کورس میں طلبہ میں صلاحیت تو پیدا ہو جاتی ہے تاہم یہ ادارہ ڈگری جاری نہیں کرتا۔تخصص کے

نصاب میں عمومی طور پر طالب علم کو گائیڈ لائن دے دی جاتی ہے تاہم ایک نصاب کی ضرورت موجود ہے۔

ہم نے جامعہ سلفیہ میں ماہرین کی زیرنگرانی نصاب سازی کیلئے ابتدائی کام کا آغاز کر دیا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ بات بھی ضروری ہے کہ تخصص کے لیے موضوع کے تعین میں معاشرے کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے انہی ضروریات کے مطابق موضوعات کا تعین کیا جائے۔ ہمیں تخصص کے لیے دینی مدارس کی ضروریات کے موضوعات تدریس، افتاء دعوت وارشاد کو بھی مدنظر ضرور رکھنا چاہیے تاہم معاشرے کی عمومی ضروریات کچھ اور ہیں اور بطور خاص اقتصادیات ومعاشیات کے جو نئے نئے مسائل پیش آرہے ہیں ان میں تخصص ہونا چاہیے تاکہ صحیح اسلامی نقطہ نظر سامنے آسکے۔ اسی طرح سیاسیات اور نظام حکومت کے معاملات کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ آج کل کے تخصصات میں اس وسیع دائرے کو پیش نظر نہیں رکھا گیا ہے۔ اس اعتبار سے آج کا یہ فورم بہت اچھا ہے، اور اس فورم پر یہ بات ضرور زیر بحث آنی چاہیے۔ البتہ متعلقہ مقامات (جہاں فی الوقت تخصصات جاری ہیں) سے نصاب وغیرہ منگوا لیے جائیں اور تخصص سے متعلقہ ماہرین کو بلوا کر ان سے مشاورت کی جائے۔ ہمارے ہاں نصاب کی تشکیل کسی حد تک ہو چکی ہے اور وفاق کے تحت تخصصات کے نظام کو منظّم کرنے کی طرف پیش قدمی بھی جاری ہے۔

علامہ نیاز حسین نقوی (وفاق المدارس الشیعہ)

کم وقت ہونے کے باوجود تخصصات کے حوالے سے ابتدائی کام کا آغاز ہو جانا خوش آئند ہے۔ لیکن درحقیقت ان مباحث کے لیے ایک پورا دن بھی ناکافی ہے۔ اس کے لیے کم از کم دو دن مختص کیے جائیں اس موقع پر اس فن کے متخصصین کو دعوت دی جائے اور شرکاء اس کے لیے پہلے سے تیاری کریں ان کی مفصل گفتگو کے بعد ہی کسی نتیجے پر پہنچا جائے۔ ورنہ فی البدیہہ تجاویز زیادہ موثر نہیں ہوں گی۔

تخصص کے حوالے سے سبھی جانتے ہیں کہ ایک یا دو سال میں کسی کو مفسر، محدث یا مفتی نہیں بنایا جا سکتا۔ فقہ کے میدان کی وسعت کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ دعوی کرنا ''کہ فلاں فقہ میں متخصص ہے'' اس تناظر میں بہت بڑا دعوی ہے۔ کہ پندرہ بیس کتابیں ہیں اور ہر ایک میں متعدد موضوعات ہیں۔ نکاح، طلاق اور بیوع وغیرہ میں اتنی طویل مباحث ہیں کہ دو تین سال تو ایک طالبعلم کو صرف متن پڑھانے پر لگ جاتے ہیں۔ ایسے میں تین سال میں کسی کو متخصص بنانا مشکل ہے۔ تخصص کا مقصد قرآن وسنت کی روشنی میں حکم خدا کو سمجھنا ہے اس کے لیے اجتہاد کی صلاحیت ضروری ہے۔ یوں جب تک کوئی شخص اجتہاد کی صلاحیت حاصل نہیں کرتا تو وہ صحیح معنوں میں مسئلہ نہیں بتا سکتا۔ مسئلہ بتانا مجتہد کا کام ہے اور مجتہد بننا دو یا تین سال میں ممکن نہیں ہے۔ اور پھر اس کام کے لیے سارے متعلقہ علوم میں مہارت ضروری ہے۔ اس لیے صرف ایک ہی علم پر دسترس رکھنے والا شخص یہ کام نہیں کر سکتا۔ اس کام کو صحیح معنوں میں کرنے کے لیے کم از کم آٹھ دس سال کا عرصہ چاہیے۔ ایک متخصص مطلوبہ مقدار میں ضروری علوم پڑھ کر آئے پھر وہ کسی بھی شعبے میں تخصص حاصل کرے۔

موجودہ نظام اور حالات میں جب کوئی طالب علم آٹھ سالہ مروجہ نصاب پڑھ لے اس کے بعد تخصص کے لیے اس کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا۔ اس لیے ہمارے ہاں محض چند اداروں میں تخصص ہو رہا ہے، اس کے بعد بھی ہم یہ دعوی نہیں کرتے کہ یہ طالب علم مفسر بن گیا ہے اور قرآن کے بارے میں اس کی رائے قابل تقلید ہے۔

اگر مفتی کا مطلب فتوی نقل کرنا ہے تو دو تین سال کی مدت ٹھیک ہے لیکن اگر مفتی کا مطلب استنباط اور اجتہاد کی صلاحیت حاصل کرنا ہے تو اس کے لیے چالیس پچاس سال کی مدت بھی شاید ناکافی ہو لیکن آج کے دور میں بھی کم از کم پندرہ بیس سال تو ہونے ہی چاہیے۔ دو یا تین سال کی مدت میں تو حقیقتاً قرآن کا ایک جزو پڑھنا بھی مشکل ہے تو مفسر کیسے بنا جا سکتا ہے؟ وقت کی کمی کے پیش نظر اس پر مزید گفتگو نہیں کر سکتا بہر حال یہ کام انتہائی ضروری ہے اور اسے ضرور ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر محمد حنیف (وزارت تعلیم)

دو باتوں کی طرف اشارہ کروں گا، ایک یہ کہ فی الحقیقت مدارس کے بورڈز کی ذمہ داری ہے کہ وہ تخصص کے لیے کوئی معیار اور مقیاس مقرر کریں۔ اور دوسری بات تخصص کے لیے نصاب سے متعلق ہے۔ نقوی صاحب نے چالیس پچاس سالہ مدت کی بات کی ہے، موجودہ حالات میں یہ عملاً مشکل دکھائی دیتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہوسکتا ہے کہ تفسیر حدیث اور فقہ میں جو تخصص اس وقت ہو رہا ہے اسے آگے بڑھایا جائے۔ پھر تخصص فی التخصص کے تحت ذیلی عنوانات کی صورت میں مزید پیش رفت کی جائے۔ اس میں متخصص جتنا بھی عرصہ لگانا چاہے اپنی گنجائش کے مطابق لگا سکتا ہے۔ البتہ مدت اور دورانیہ کا تعین اس اعتبار سے ہونا چاہیے کہ اسناد کا معادلہ بھی ہو سکے۔ کیونکہ معادلے کے لیے دورانیہ کی بنیادی اہمیت ہے۔ نیز دور حاضر کے مسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے تمام بورڈز باہمی مشاورت سے طریقہ کار طے کریں اس کے ساتھ ساتھ اس سلسلے میں عمومی تعلیم سے وابستہ دین دار طبقے سے بھی مشاورت کی جاسکتی ہے۔

مفتی شکیل احمد (جامعہ محمدیہ۔ اسلام آباد)

وفاق المدارس العربیہ میں مرکزی سطح پر تخصص کے حوالے سے اب تک کوئی انتظام نہیں ہے۔ البتہ وفاق کی تخصصات کمیٹی کے زیر اہتمام مولانا زاہد الراشدی صاحب کے ذمے یہ کام لگایا گیا ہے کہ وہ اس نظام کو مربوط کرنے کیلئے کوشش کریں اس سلسلے میں انکی کوششیں جاری ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے اخبار میں اشتہار کے ذریعے لوگوں سے آراء بھی طلب کیں۔ ان کوششوں کے نتیجے میں یہ کام تقریباً آخری مراحل کے اندر ہے۔ جو جلد ہی کسی منضبط شکل میں سامنے آجائے گا۔ اس وقت سب سے قدیم تخصص فقہ میں ہے جو وفاق سے ملحق بیشتر مدارس میں ہو رہا ہے۔ اسی طرح بنوری ٹاون اور جامعہ فاروقیہ (کراچی) میں تخصص فی الحدیث ہو رہا ہے، جامعہ فاروقیہ میں تخصص فی الادب والانشاء بھی کچھ عرصے سے جاری ہے۔ تخصص فی التفسیر بہت کم مقامات پر ہے البتہ دو یا تین ماہ کے دورانیے

پر مشتمل دورہ جات کی صورت میں کئی مقامات پر دورہ تفسیر ہوتا ہے۔اس کو تخصص تو نہیں کہا جاسکتا البتہ ترجمہ اور تفسیر کے دورہ جات کا نام دیا جاسکتا ہے۔

تخصص فی الفقہ کا کم سے کم دورانیہ ایک سال ہے جو جامعۃ الرشید اور جامعہ محمدیہ میں ہے۔ زیادہ تر مدارس میں یہ دورانیہ دو سال ہے جبکہ دارلعلوم کراچی اور جامعہ امدادیہ میں تین سال میں تخصص کروایا جاتا ہے۔ دو سال کورس ورک کے بعد ایک سال میں مقالہ لکھوایا جاتا ہے۔ان تخصصات میں کورس ورک ،فتوی نویسی اور مقالہ تین بنیادی کام ہوتے ہیں۔ جامعہ امدادیہ اور دارلعلوم کراچی کا مقالہ خاصا ضخیم ہوتا ہے۔ نظام کچھ اس طرح ہے کہ ایک سالہ کورس میں تین ماہ، دو سالہ میں چھ ماہ اور تین سالہ کورس میں ایک سال مقالے کے لیے مختص ہوتا ہے۔ مقالے کو بنیادی اہمیت حیثیت حاصل ہے کیونکہ چھوٹے مسائل میں تو ایک دو لائن کا فتوی لکھ دیا جاتا ہے لیکن تفصیل طلب مسائل کے لیے پوری تحقیق کرنا پڑتی ہے اور یہی تحقیق ایک مقالے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

تخصص میں پڑھانے والے اساتذہ کی تربیت کے لیے تدریب المعلمین کا ایک سلسلہ موجود ہے تاکہ قابل اساتذہ تیار کیے جائیں جو صحیح انداز میں تعلیم دے سکیں۔ مختصراً یہ کہ سب سے پہلے نصاب اور مقالہ، اسکے ساتھ ساتھ قابل اساتذہ کا تعین اور تیسرے نمبر پر طلباء کے معیار پر توجہ ضروری ہے۔ ہمارے ہاں طلبہ میں عبارت فہمی کی صلاحیت (کہ طالب علم عربی کتب سے استفادہ کرنے کے قابل ہو) کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ خوشخطی بھی مدنظر ہوتی ہے تاہم یہ کوئی لازمی شرط نہیں ہے البتہ ترجیحاً شامل ہے۔اس کے علاوہ انگریزی زبان کی مہارت بھی پیش نظر ہوتی ہے، لیکن اگر کوئی طالب علم انگریزی نہ جانتا ہو تو اسے انگریزی سکھانے کا اہتمام ہوتا ہے۔ کیونکہ آج کے دور میں اسکی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قابل ترجیح سمجھی جاتی ہیں۔ تخصص کی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ ہمارے ہاں طلباء کو یہ تصور دیا جاتا ہے کہ آپ اپنے آپ کو مفتی نہ سمجھیں بلکہ تکمیل تخصص کے بعد کسی تجربہ کار مفتی کی زیرنگرانی فتوی نویسی کا کام کریں اسکے بعد آپ دارالافتاء کھولنے کے قابل ہوں گے۔

خالد رحمٰن (ڈائریکٹر جنرل، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز)

اب تک کی گفتگو سے یہ احساس ہو رہا ہے کہ کچھ نہ کچھ معیارات طے کرنے ناگزیر ہیں۔ جو کچھ اس وقت ہو رہا ہے وہ ایک حد تک فوری ضرورت کو پورا کرنے کے نقطۂ نظر سے ہو رہا ہے۔ البتہ ضرورت اس سے کہیں زیادہ کچھ کرنے کی ہے۔ چنانچہ فوری ضرورت اور مستقل ضروریات کے دونوں سوالات کو سامنے رکھ کر لائحہ عمل بنانے کی ضرورت ہے۔

مولانا امیر عثمان (بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی۔ اسلام آباد)

زیادہ مدت کے حوالے سے جو بات علامہ نقوی صاحب نے کی ہے وہ آئیڈیل ہے جبکہ ڈاکٹر سرفراز نعیمی صاحب کی بات کا تعلق شاید عملی (پریکٹیکل) صورتحال کے ساتھ ہے۔ آئیڈیل چیزوں کا حصول بہت بڑی بات ہے تاہم عملاً جن چیزوں کا حصول وسائل اور دیگر معاونات کی روشنی میں ممکن ہے میرے نزدیک ان کے لیے کوشش کرنا زیادہ بہتر ہے۔ البتہ آئیڈیل اور پریکٹیکل کے فرق کو کم کرنے سے ہی ہم کسی بہتر نتیجے پر پہنچ پائیں گے۔

تخصصات کے حوالے سے طلب اور رسد کا پہلو مدنظر رکھنا چاہیے۔ اس سلسلے میں مزید یہ ہوسکتا ہے کہ تخصص کے لیے علماء کرام اولویات مقرر کریں، کہ ہمارے موجودہ تخصصات ہماری اولویات کے مطابق ہیں یا نہیں؟ یا یہ کہ طلب و رسد سے قطع نظر ہم نیا رجحان معاشرے میں متعارف کروانا چاہتے ہیں۔ ایک اور تجویز یہ ہوسکتی ہے کہ تخصص کے شوقین طلبہ کے لیے ورکشاپس کا اہتمام کیا جائے تاکہ انہیں بہتر رہنمائی مل سکے اور وہ اپنی ترجیحات کا تعین کرسکیں۔ اور اپنی مرضی کا تخصص وہ جہاں سے چاہیں کرلیں۔ ورکشاپ کی نوعیت باہمی مشاورت سے طے کی جاسکتی ہے۔

تدریب کے حوالے سے یہ بات درست ہے کہ مدرسے کے تجربہ کار اساتذہ ضروری ہیں تاکہ دوسرے نئے اساتذہ براہِ راست ان کے تجربات سے استفادہ کرسکیں، تاہم میرا تھوڑا سا اختلاف یہ ہے کہ اگر ہم جدید تعلیم کے ماہرین کے تجربات سے استفادہ کرسکتے ہیں تو کرنا چاہیے۔ اور یہ کوئی عیب

کی بات نہیں ہے کہ قدیم علوم کا ماہر جدید علوم کی معرفت نہیں رکھتا۔ایک دوسرے کے تجربات سے استفادہ ناگزیر ہے۔ کیونکہ ایسے لوگ بہت کم ہیں جو دونوں طرح کے علوم پر دسترس رکھتے ہوں۔یعنی بنیادی طور پر مہارت سیکھنی ہے اور وہ کسی ماہرِ فن سے ہی سیکھی جاسکتی ہے۔

تخصص کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے لائبریریز کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔لیکن مالی وسائل کی عدم دستیابی رکاوٹ بن سکتی ہے۔اس کے حل کے لیے میری تجویز یہ ہے کہ ڈیجیٹل لائبریریز کو استعمال میں لانے کی کوشش کی جائے۔اور بلا مبالغہ پوری دنیا میں اس وقت تفسیر و حدیث وغیرہ میں اتنا ڈیجیٹل کام ہو چکا ہے جس کا ہم میں سے بہت سے لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے۔

تخصص کے معیار میں بہتری کے لیے دو اور چیزوں سے مدد لی جاسکتی ہے۔ایک یہ کہ مقالہ کا نظام جو چل رہا ہے۔اس کے ساتھ کچھ فیلڈ ورک طالب علم کو دیا جائے۔ کیونکہ معاشرتی کام کے جائزے سے طلبہ کے وژن میں اضافہ ہوگا اور تخصص کے کام میں مزید بہتری آئے گی۔اور ساتھ ہی مدارس کے طلبہ کے بارے میں یہ تاثر (کہ یہ لوگ معاشرے کے بارے میں انجان ہوتے ہیں) کم کرنے میں مدد ملے گی۔ کیونکہ اس انجان پن کی ایک وجہ انکی معاشرے سے دوری ہے۔اسی طرح تخصص کے موضوعات میں تقابل ادیان کو شامل کرنا ضروری ہے۔ یہ چاہے بڑے مدارس کی حد تک ہی ہو لیکن بہرحال اس کا اہتمام ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر طاہر محمود (الجامعہ السّلفیہ۔اسلام آباد)

تجاویز و آراء کی روشنی میں یوں محسوس ہو رہا ہے کہ علماء کے درمیان تخصصات کے اجراء کے حوالے سے اصولی اتفاق ہو چکا ہے۔ درحقیقت علامہ سرفراز نعیمی صاحب اور علامہ نیاز حسین نقوی صاحب کے افکار میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے۔نقوی صاحب کی بات کا تعلق کمال سے ہے جبکہ سرفراز نعیمی صاحب اس کا معروف معنوں میں استعمال بتا رہے ہیں۔ میں ان سفارشات کو عملی شکل دینے کے لیے دو حوالوں سے بات کروں گا۔پہلی بات آئی پی ایس کے حوالے سے ہے۔اور دوسری

ارباب ہائے وفاق سے متعلق ہے۔آئی پی ایس کو چاہیے کہ بورڈز کے ذمہ داران سے بالعموم اوران مدارس کے ذمہ داران و متخصصین (جو اس وقت عملاً تخصصات کروار ہے ہیں) سے بالخصوص تجاویز طلب کرے اوران تجاویز کی روشنی میں دو یا اڑھائی سالہ تخصص کا اجراء کرے۔اس کے لیے طریقۂ کار ایسا اختیار کیا جائے جو اتحاد ملت کا مظہر ہو۔اس تخصص کے لیے بورڈ کی طرف سے نامزد کردہ ممتاز طلبہ کا انتخاب کیا جائے۔اس کے نصاب میں عصر حاضر کے مسائل کو جگہ دی جائے، یوں ایک آئیڈیل چیز ہمارے سامنے آجائے گی۔اس کی عملی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ مختلف سرکاری یا پرائیویٹ یونیورسٹیز کے ساتھ اس انداز میں اشتراک عمل کیا جائے کہ فکری اور علمی رہنمائی ہماری ہو اور اکیڈیمک معاملات ان کے ذمے ہوں۔اس سے ایک تو ان حلقوں میں تخصص کی اہمیت اجاگر ہوگی اور دوسرا ڈگری کے حصول کا مسئلہ بھی کسی حد تک حل ہوجائے گا۔

دوسرا پہلو بورڈز کے حوالے سے ہے کہ وہ تخصص کی سند کے ایم فل یا پی ایچ ڈی لیول تک معادلے کی کوشش کریں تا کہ عملی زندگی اور روزگار کے لحاظ سے بھی اس پروگرام میں دلچسپی کا عنصر پیدا ہو سکے۔تخصصات کے لیے موضوع کی توضیح بورڈ کی طرف سے ہو، یعنی بورڈ اپنے ساتھ منسلک اداروں کو اپنی طرف سے منتخب کردہ موضوعات میں سے کسی ایک یا دو موضوعات پر تخصص کروانے کا پابند بنائے۔اس سے طلباء کو اپنی پسند اور ترجیح کا موضوع منتخب کرنے میں آسانی ہوگی اور وہ اسی موضوع سے متعلقہ ادارے سے تخصص کریں گے۔اسی سلسلے کی ایک کوشش کا ہم نے اپنے ادارے میں آغاز کیا ہے کہ تخصص کے شعبہ جات تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، خطابت، ادب والانشاء وغیرہ کے حوالے سے حلقات قائم کیے ہیں۔ان حلقات کی مختلف ایام میں نشستیں منعقد ہوتی ہیں۔یوں ایک متخصص استاد کی جانب سے طلبہ کی مختلف حوالوں سے رہنمائی مستقبل میں آنے والے تخصص کے مراحل کے لیے ایک بہترین بنیاد بن سکتی ہے۔

پروفیسر حبیب الرحمٰن عاصم (بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی۔اسلام آباد)

تخصص کے حوالے سے مفید گفتگو کی گئی ہے اور آئی پی ایس کی طرف جو تجاویز تحریری شکل میں

موجود ہیں گفتگو میں بھی بیشتر انہی کا یہاں اعادہ ہوگیا ہے۔ میرے ذہن میں بھی ابتدائی طور پر یہی اغراض سامنے آئیں جوان تجاویز میں تقریباً موجود ہیں کہ ایک بہترین استاد وہی ہوسکتا ہے جس نے اپنے شعبے میں تخصص کیا ہو، اوراسے اپنے علمی دائرے میں تخصص جاری رکھنا چاہیے۔ اس پروگرام کی تشکیل کے پس پردہ محوری اور بنیادی نقطہ یہ تھا (علامہ زاہدالراشدی صاحب نے بھی اپنی تجاویز میں اسی طرف اشارہ کیا ہے) کہ دینی مدارس اس معاشرے اوراس میں موجود مختلف اداروں کی رہنمائی کیسے کریں؟ روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں رہنمائی کا سلسلہ تو علماء کرام جاری رکھے ہوئے ہیں۔لیکن بڑے بڑے مسائل میں دینی مدارس کی طرف سے رہنمائی کی کمی مختلف موقعوں پر اٹھنے والے سوالات کی صورت میں محسوس ہوتی ہے۔ معاشرے کی رہنمائی کے محوری نقطے کو اپنے تخصص میں بنیاد بنالیا جائے تو بہت سارے مسائل حل ہوسکتے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ نئے نئے آنے والے سوالات اور مسائل کے حل کے لیے تمام مکاتب فکر کی نمائندگی کرتا ہوا علماء کرام کا مشترکہ بورڈ ہونا چاہیے تاکہ کسی بھی پیش آمدہ مسئلے کے بارے میں کوئی مشترک رائے سامنے آسکے۔ اسلامی نظریاتی کونسل اس حوالے سے حکومتی چھاپ کی وجہ سے کوئی بہتر کردار ادا نہیں کرسکتا، اس کے فیصلوں کے حوالے سے اکثر علماء میں اختلاف ہی نظر آیا ہے۔ اس لیے اگر مختلف بورڈز کے علماء غیر سرکاری طور پر اس طرح کا کوئی بورڈ قائم کرسکیں (جو لوگوں کی رہنمائی کرے) تو یہ بہت مفید ہوگا۔ میں اس تجویز سے بھی متفق ہوں کہ تخصص کے مختلف اداروں کے ماہرین سے تجاویز طلب کی جائیں اوران تجاویز پر غوروخوص کرنے کے لیے الگ سے اجلاس بلایا جائے جس میں کسی حتمی بات کا تعین ممکن ہوسکے۔

پروفیسر خورشید احمد (چیئرمین آئی پی ایس)

مجھے اس بات سے اتفاق ہے کہ تخصص کی اہمیت میں آہستہ آہستہ اضافہ ہورہا ہے۔ اور جہاں کہیں اس سلسلے کا آغاز ہوا ہے وہ مفید بھی ہے اوراس بات کی ضرورت بھی ہے کہ اس سلسلے میں مزید معلومات جمع کی جائیں تاکہ پوری تصویر ہمارے سامنے آسکے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ دینی مدارس نے

دین، اس کی تعلیم اور اس کے علمی اثاثے کی حفاظت کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ابتلاء کے دور میں اس پوری امانت کی حفاظت اور اسے نئی نسل تک منتقل کرنے کا کام ایک تاریخی خدمت ہے جو مدارس نے سرانجام دی ہے۔ دوسری جانب مدارس نے معاشرے کے عام انسان کی روزمرہ ضروریات کے لیے ایسے افراد تیار کیے جو دینی خدمات بھی انجام دیں اور ساتھ ساتھ لوگوں کو دینی معلومات بھی فراہم کریں۔ مدارس کے موجودہ نظام نے ان دو ضرورتوں کو خوش اسلوبی کے ساتھ پورا کیا ہے۔ البتہ معاشرے کی ضروریات اس سے کچھ زیادہ ہیں۔ اور بطور خاص، مسلمان ممالک میں آزادی حاصل ہونے کے بعد یہ سوال فطری طور پر پیدا ہوا کہ اب اس آزادی کو استعمال کرنے کے لیے دین سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے نئی زندگی کی تشکیل و تعمیر کیسے ہو سکتی ہے؟

اس رہنمائی کیلئے ایسے افراد کی ضرورت ہے جو ایک طرف تو دینی علوم میں گہری نظر رکھتے ہوں، اور ساتھ ہی دور جدید کے مسائل، پیچیدگیوں اور امکانات سے واقفیت رکھتے ہوں، مولانا محمد حنیف جالندھری صاحب نے تطبیق کی بات کی تھی کہ فقہی مسائل کی تطبیق کے حوالے سے خلاء ابھی موجود ہے جسے پر کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں انسانی تجربات اور ٹیکنالوجی کی بنیاد پر جو مزید مسائل پیدا ہوئے ہیں اور نئے نئے سماجی اقتصادی اور سیاسی ادارے بنے ہیں ان کی بنیاد پر بہت سے پالیسی معاملات نے جنم لیا ہے ضرورت ہے کہ ان میں ہم قرآن وسنت کی روشنی میں رہنمائی دے سکیں۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہمارے دینی نظام میں ایک گنجائش پیدا ہونی چاہیے کہ عمومی تعلیم کے بعد تخصص کا زیادہ جامع مربوط اور مؤثر نظام وضع کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

تخصص کی کم از کم تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ اس تخصص سے فارغ ہونے والا اپنے میدان تخصص سے متعلقہ جملہ اہم باتوں سے واقف اور انکی حقیقت سے آگاہ ہو تاکہ پھر آگے انکے استعمال کی راہیں کھولی جاسکیں۔ اس لیے آخری درجے کے بعد جن طلباء میں خود شوق بھی ہو، انہیں ترغیب دی جائے اور ان کے لیے Incentive (محرک) پیدا کیا جائے تاکہ وہ اس مرحلے میں ذوق وشوق سے داخل ہو سکیں۔ تخصص کی یہ صلاحیت حاصل کر لینے کے بعد ہم نئی تحقیق کریں اور اس تحقیق میں علوم اسلامی

کے ساتھ ساتھ عصری علوم و مسائل کو لازماً شامل کریں۔ لیکن ابھی فوری آغاز کے لیے اگر کوئی نظام نہیں ہے تو مل جل کر اس کمی کو پورا کیا جائے۔ اس سلسلے میں مصطفیٰ زرقا اور ابوزہرہ وغیرہ نے جو اجتماعی اجتہاد کی بات کی ہے وہ لائق توجہ ہے۔ یہ کہ مختلف علوم میں نگاہ رکھنے والے، حتی کہ جدید وقدیم دونوں علوم کے جاننے والے (بشرطیکہ ان کی نیت درست ہو) ساتھ بیٹھیں اور آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ ہندوستان میں مولانا مجاہدالاسلام صاحب نے فقہ اکیڈمی قائم کر کے اس سلسلے میں مفید خدمات انجام دی ہیں۔ انہوں نے ہر سال ایک موضوع کو لے کر اس پر جدید وقدیم علوم کے ماہرین کو دعوت دی کہ وہ آراء لکھیں اس پر بحث کریں، اسکے بعد پھر انہوں نے اس کام کو شائع کر کے آگے بڑھایا۔ کم وبیش دس جلدوں میں انہوں نے عصری مسائل پر اسی انداز میں کام کیا۔ اسی طرح رابطہ عالم اسلامی اور او آئی سی کی فقہ اکیڈیمیز اپنے اپنے انداز میں یہ کام کر رہی ہیں۔ اور باقی مسلم دنیا میں بھی کوششیں ہو رہی ہیں۔ یوں پہلی ضرورت اس بات کی ہے کہ جہاں جہاں جو بھی کام ہو رہا ہے اسکی معلومات حاصل کی جائیں۔ اور ان اداروں نے جو کام کیا ہے اسے بنیاد بنا کر آگے کام کیا جائے۔ البتہ اس موضوع پر کانفرنس کا وقت ابھی نہیں آیا لیکن اس چیز کی ضرورت ہے کہ ہر بورڈ سے ایک نمائندہ فرد لیا جائے اور ان منتخب افراد پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کی جائے تا کہ پاکستان میں جو صورتحال ہے وہ ہمارے سامنے آسکے۔ اور اسی طرح کچھ افراد کے سپرد یہ کام کیا جائے کہ عالم اسلام میں اس سلسلے میں جہاں جہاں جو کام ہوا ہے اس پر تحقیق کریں۔

اسلامی معاشیات سے مجھے کچھ واقفیت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دس پندرہ سالوں میں معاشیات کے میدان میں تحقیق وتطبیق کا نمایاں کام ہوا ہے۔ لیکن لوگوں کو اسکی واقفیت نہیں ہے، مختلف انسائیکلوپیڈیا تیار ہوئے ہیں لیکن وہ عموماً دستیاب نہیں ہیں۔ ان تمام چیزوں کو جمع کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح اپنے اساتذہ کے لیے نظام بنانے اور انہیں یہ جذبہ دینے کی ضرورت ہے کہ وہ تدریس کے ساتھ ساتھ خود تحقیق پر توجہ دیں، ذاتی ذوق کی مناسبت سے بھی اور اجتماعی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے بھی۔ اس معاملے میں آپکی کمیٹی ایک مفید خدمت انجام دے سکتی ہے کہ تعلیم میں آگے کے

درجات میں کن چیزوں کی ضرورت ہے۔ میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ اگر اسے آپ باقاعدہ نظام کا حصہ بنائیں گے تو کامیابی کے امکانات زیادہ ہیں۔ اس امر میں کوئی قباحت نہیں کہ ایم فل اور پی ایچ ڈی طرز پر ہم اپنے نظام میں بھی گنجائش پیدا کریں۔ اصول وضوابط بنائیں اور ان پر عمل کریں اور ساتھ ہی اس قسم کے اجتماعات کیے جائیں جن میں اہل علم جمع ہوں اور کم از کم فوری اور وقتی رہنمائی دینے کا کام انجام دے سکیں۔ ساتھ ساتھ تمام اہل علم کو مناسب محرکات فراہم کیے جائیں۔

یہ ایک ایسا کام ہے جسے کرنے کی ضرورت ہے۔ اور یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اس کام میں خاصا وقت درکار ہوگا۔

خالد رحمٰن (ڈائریکٹر جنرل، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز)

آپ سب حضرات کا بہت بہت شکریہ۔ آج کی گفتگو کو ہم باقاعدہ مرتب کر کے آپ تمام حضرات تک پہنچا دیں گے اور جو جو تجاویز یہاں پیش ہوئی ہیں ان پر عمل درآمد، ان کی روشنی میں آئندہ لائحہ عمل کے لیے ہونے والی پیش رفت کے سلسلے میں آپ سے مسلسل رابطہ رہے گا۔ ان شاء اللہ

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

مدارس میں اساتذہ کی تربیت کے لیے سوچ بچار اور عملی کوششیں کوئی نیا عمل نہیں ہے۔ دینی مدارس کے اساتذہ میں یہ خیال اور کوششیں ماضی میں بھی رہی ہیں اور کسی نہ کسی انداز میں اب بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ تاہم ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کام کو محدود سطح سے اٹھا کر زیادہ وسیع اور اداراتی سطح پر رُوبہ عمل لایا جائے۔ چند سال قبل انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد کے زیرِ اہتمام ایک اہم پیش رفت تنظیم/وفاق ہائے مدارس کے ذمہ داران کے ساتھ ایک خصوصی نشست کا اہتمام تھا، جس میں تمام وفاق/تنظیم کے ذمہ داران شریک ہوئے۔ ''تدریب المعلمین'' کی ضرورت وافادیت کے لحاظ سے شرکاء کے خیالات میں یکسانیت پائی گئی۔ اس کام کو منظّم انداز میں کرنے کے لیے قیمتی تجاویز بھی سامنے آئیں اور اس عزم کا اظہار بھی ہوا کہ اس پہلو سے تمام وفاق اپنے اپنے طور پر توجہ دیں گے اور قابلِ عمل شکلیں اختیار کریں گے۔ ان تجاویز میں اساتذہ کی تربیت کے حوالے سے ایک کتاب کی تیاری کی تجویز بھی سامنے آئی تھی۔ اس سلسلہ کی زیرِ نظر کتاب ایک ابتدائی کوشش ہے اور اساتذہ کی تربیت کے چند اہم پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔

www.ips.org.pk
www.ipsurdu.com

ISBN 978-969-448-848-6
9 789694 488486
Rs. 1500